مرسلہ : عطا عابدی (نئی دہلی)

اس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے کے عنوان سے مستعار ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان بھیجتے ہوئے شاعر یا افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں ۔

اس صفحے کے لیے قارئین بھی ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہوں۔ پسند آنے والی تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی۔

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۵ شمارہ: ۵ فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ستمبر ۱۹۹۱ء

فون نمبر
۳۲۶۳۴۴۸
۳۲۷۶۲۱۱

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق، عکس: ارشد علی خاں

پروفیسر اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

کو بھی مصور کیا گیا۔ مخزن الاسرار، خسرو و
شیریں، لیلیٰ و مجنوں، ہفت پیکر، سکندر
نامہ وغیرہ کو تصویروں سے آراستہ کیا گیا
اور نقاشی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے گئے
دبستانِ تیموریہ (دبستانِ ہرات) کے اسالیب
کا تغزل موضوع کی نغماتی کیفیتوں میں جذب
ہے۔ رومانی موضوعات کے لیے مصوروں کے
اسالیب میں ظہاریت کا حسن ملتا ہے ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے موضوعات نے انھیں
اسالیب کا یہ حسن بخشا ہے۔ اس حسن کی
انفرادیت ہی مختلف ہے۔ اس دبستان کا
رومانی اسلوب اور اس کی اظہاریت ہی اس
دبستان کو بلند مقام عطا کرتی ہے۔ پیکروں
میں جو نزاکت ہے اس کی مثال اس سے قبل
نہیں ملتی، آرائش و زیبائش کے لیے کینوس پر
زیادہ جگہ رکھی گئی ہے اور انسانی پیکروں کو
چھوٹا کر دیا گیا ہے، پس منظر عموماً زیادہ اُٹھا
ہوا ابھرا ہوا ملتا ہے، منظر کشی میں ایرانی
آرٹ کا حسن ہر جگہ موجود ہے چینی تکنیک کا
استعمال بھی ملتا ہے۔ پہاڑوں اور درختوں
اور پودوں کی آرائش کا خاص خیال رکھا گیا
ہے، متوازن رنگ اور کمپوزیشن کی ترتیب
متاثر کرتی ہے، یہ یقیناً ابتدائی منگول آرٹ
سے آگے بڑھا ہوا قدم ہے۔ تیموری دبستان کے
بہت سے شاہکار شیراز سے حاصل ہوئے ہیں
اور دنیا کے چند ملکوں کے کتب خانوں میں
آج بھی دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔

اس دور کی چار تصویریں اس وقت
میرے سامنے ہیں:

پہلی تصویر "شاہنامہ فردوسی" کی ہے،
پندرہویں صدی کے اس شاہکار میں رستم
اپنے گھوڑے رخش کو گرفت میں لینے کی کوشش
کر رہا ہے۔

پس منظر پہاڑ کے نقش کی وجہ سے زیادہ
ابھرا ہوا ہے۔ دو بڑے پرندوں کی پرواز سے
پس منظر کی اٹھان اور بڑھتی ہوئی محسوس
ہو رہی ہے۔

پہاڑوں کا دوسرا سلسلہ بھی قریب ہے
دونوں پہاڑی سلسلوں کے درمیان نشیب
میں دو درخت ہیں جن کے پتے خوبصورت
اور روشن ہیں۔ چینی آرٹ میں ایسے درخت
ملتے ہیں یہاں اسے ایرانی فنکاروں نے اپنے
احساسِ جمال سے مزین کیا ہے۔ دوسرا درخت
پتوں کے بغیر ہے۔

دوسری پہاڑی پر ایک بڑا سا سایہ دار
درخت ہے اس کی لچک توجہ طلب ہے، پتے
بڑے اور کسی قدر پھیلے ہوئے ہیں، چھوٹے
چھوٹے کئی پودے ہیں اور ہر پودے میں پھول
ہے۔

رستم کے ساتھ ایک اور شخص اپنے گھوڑے
کے ساتھ ہے، یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کون ہے
اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رستم کے
محل کو غور سے دیکھ رہا ہے دونوں انسانی
پیکروں اور دونوں گھوڑوں کو پس منظر کے
مقابلے میں چھوٹا رکھا گیا ہے۔ رخش متحرک ہے
اس کی ایک ٹانگ شان سے اُٹھی ہوئی ہے،
انسانی پیکروں کے لباس ایرانی ہیں، رستم کا چہرہ
منگول چہرے کا عکس لیے ہوئے ہیں۔

دونوں پرندوں کی پرواز کا عمل ایک
جیسا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے پروں اور
چونچ کو اوپر اُٹھائے پہاڑی سلسلے سے اور
آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ رخش کے
تحرک کا ردِ عمل بھی ہے۔

دوسری تصویر نظامی کے خمسہ کی ہے،
۱۴۴۲ء کی یہ تصویر کئی لحاظ سے اہم ہے چینی
اثرات بہت واضح ہیں، خسرو اپنے سفید گھوڑے
پر سوار شیریں کو چشمے میں نہاتے ہوئے دیکھ رہا
ہے، شیریں کا نصف جسم عریاں ہے، پس منظر
میں بادل ہیں۔ وسط ایشیائی فن کی آرائش
سے پس منظر زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ پیش منظر میں
بڑے بڑے جنگلی پودوں سے خسرو کا گھوڑا
نصف ڈھک گیا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے
جیسے کسی خواب کا منظر پیش کر دیا گیا ہے۔ شیریں
بیٹھ کر نہا رہی ہے، اس کے بال کھلے ہوئے ہیں
خسرو کسی قدر جھکا ہوا اُسے تک رہا ہے۔

قریب ہی دو بڑے اوپر کی جانب
بڑھتے ہوئے درخت ہیں اور ان کے قریب
شیریں کا گھوڑا ہے جو خسرو کے اس عمل سے
کسی قدر غضبناک نظر آ رہا ہے خسرو کی طرف
دیکھ کر ہنہنا رہا ہو جیسے اور خسرو اس سے بے خبر
شیریں کے خوبصورت جسم کو دیکھ رہا ہے۔

خسرو کے چہرے پر حیرت کے تاثرات
ابھارے گئے ہیں۔

شیریں اور خسرو دونوں کے چہرے چینی منگول ہیں۔
غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ جو حیرت خسرو
کے چہرے پر ہے کم و بیش وہی حیرت اس کے گھوڑے
کے چہرے پر ہے۔ دونوں شیریں کے
حسن سے متاثر نظر آ رہے ہیں۔ شیریں کے
نصف عریاں جسم کے باوجود آرائش و زیبائش
کا رجحان ہر جگہ بڑا پختہ ہے۔

تیسری تصویر بھی نظامی کے خمسہ کی ہے
یہ ۱۴۴۹ء کا شاہکار ہے، شیریں گھوڑے
پر سوار ہے اور فرہاد اُسے گھوڑے کے

ساتھ اٹھائے لیے جا رہا ہے۔

اس واقعے کو منقش کرتے ہوئے ایرانی فنکاروں نے پہاڑوں اور پتھروں کی علامتوں سے مدد لی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فرہاد، شیریں کو وقت کے دباؤ سے باہر لے جانا چاہتا ہے۔ شیریں اپنے گھوڑے کے ساتھ فرہاد پر سوار ہے، گھوڑے کی ٹانگیں فرہاد کی مضبوط بانہوں میں ہیں۔ درختوں اور جنگلی پودوں سے جنگل کا تاثر ابھارا گیا ہے۔

خمسہ کی ان دونوں تصویروں کو ساتھ دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دوسری تصویر میں شیریں اور فرہاد کے چہرے ایرانی ہیں، خسرو والی تصویر کی شیریں سے اس شیریں کا چہرہ مختلف ہے، پہلی تصویر میں نصف عریاں جسم کے باوجود شیریں اتنی حسین اور خوبصورت نظر نہیں آتی کہ جتنی وہ اپنے تئیں اس تصویر میں نظر آرہی ہے۔ فرہاد کا لباس عام ایرانی مزدوروں کا ہے کہ جس پر آرائش کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ شیریں کو اس کے گھوڑے کے ساتھ ابھی لے کر اڑ جائے گا۔ دبستانِ شیراز کی خصوصیات اس تصویر میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

چوتھی تصویر دیوانِ جامی کی ہے، تیموری ہرات دبستان کا یہ شاہکار پندرہویں صدی کا ہے۔ شکار کا منظر ہے، حاشیے پر عام ایرانی نقش و نگار ہیں۔ شکار گاہ سے اوپر شہنشاہ گھوڑے پر سوار (گھوڑے کا نصف چہرہ نظر آرہا ہے) شکار کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے اس کے ساتھ مصاحبین کے چھ پیکر ہیں، شکار گاہ میں چار شکاری گھوڑوں پر سوار ہرن، خرگوش، چیتے اور دوسرے جانوروں کا شکار کر رہے ہیں، افراد ان کے گھوڑے اور تمام جانور حد درجہ متحرک ہیں، یہ تصویر تحرک کا نیا احساس دیتی ہے۔ جانور خوف سے دوڑ رہے ہیں، کئی جانور شکار ہو چکے ہیں، خرگوش ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ جانوروں پر خوف طاری ہے تمام انسانی چہرے ایرانی ہیں، پس منظر میں چینی بادلوں کا تاثر موجود ہے۔ ایک پرندہ اوپر بیٹھا حسرت سے یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ مصاحبین اور شکاریوں کے سروں پر جو خاص قسم کی پگڑیاں ہیں وہ مغربی ایران کے تیموری عہد کے فنکاروں کی دین ہیں۔

یہ تصویر اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ہند مغل آرٹ میں شکار اور جنگ کے جو مناظر پیش کیے گئے ہیں ان کا ایسی تصویروں سے ایک تخلیقی رشتہ ہے۔ صفوی عہد کے مصوّروں نے سولہویں صدی عیسوی میں اسے زیادہ مقبول بنا دیا تھا، شکاریوں کا تحرک جنگجو سپاہیوں جیسا ہے ہند مغل جمالیات کے پس منظر میں ایسی تصویروں کی حیثیت ایک روایت کی ہے۔

شاہ رُخ کے عہد کے بہت سے مسوّدوں اور نسخوں کی تصویریں حاصل ہو چکی ہیں پیرس (فرانس) میں نظامی کے خمسہ کی تصویریں محفوظ ہیں۔ اس قیمتی خوبصورت نسخے پر شاہ رخ کی مہر لگی ہوئی ہے گلستاں اپنی شاہکار تصویروں کے ساتھ لندن میں ہے۔ مشہور مصوّر جعفر نے ۱۴۲۶ء میں اس کے لیے چند تصویریں بنائی تھیں۔ ہرات دبستان کی کم و بیش ۲۲ خوبصورت تصویریں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیموری دور کے فنکاروں نے مصوّری کے فن کو کتنی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیا تھا۔ اس سلسلے میں کلیلہ و دمنہ اور معراج نامہ (۱۴۳۶ء) کی تصویریں بھی ایرانی اور چینی اور وسط ایشیائی فن کی عمدہ آمیزش کو پیش کرتی ہے۔

ایک نظم

گڑیا ہے دُلہن بنی ہوئی سی — گہنوں میں لدی، بنی سجی سی
بالوں میں رچی، بسی سی راتیں — ماتھے پہ سحر، کھلی کھلی سی
اَبرو کی کٹار، ہائے توبہ — پلکوں میں حیا، چھپی چھپی سی
کانوں کی طرف طرف لگاوٹ — باتوں کی گرہ ٹٹولتی سی
عارض کی صباحتیں، کہ توبہ — چھٹکی ہوئی بن میں چاندنی سی
آنکھوں میں سمندروں کی گہرائی — چپ ہونٹ، نگاہ بولتی سی
دانتوں کے ہیں وہ اَنار دانے — موتی کی ہے یا کوئی لڑی سی
سانسوں کا وہ مدّ و جزرِ پیہم — شہنائی، فضا میں گونجتی سی
چہرے کی اُڑی اُڑی سی رنگت — اسرارِ حیات کھولتی سی
ہونٹوں پہ سُبک سی مسکراہٹ — چھٹتی ہوئی کوئی پھلجھڑی سی
ٹھُڈی سے ٹپکتی مے کی بوندیں — گردن ہیں صراحی جھولتی سی
سینے کے گلاب، اللہ اللہ — خوش بو سے فضا رچی بسی سی
اللہ رے گداز، بازوؤں کا — مچھلی دریا میں پیرتی سی
نازک سی کلائی، گوری گوری — بیداری میں خواب گھولتی سی
چوڑی کی کھنک سے چار جانب — پھیلی ہوئی ایک سنسنی سی
دیکھی جو کمر، تو یاد آئی — طوفان میں ناؤ ڈولتی سی
گفتار میں روپ، بھیروں کا — رفتار مچاتے کھلبلی سی
لَو دیتی ہوئی، کھنکتی آواز — بجتی کہیں دور بانسری سی
خوش بوئے بدن، وہ بھینی بھینی — چمپا کہیں پھولتی ہوئی سی
قامت ہے، کہ سرو قد قیامت — آنکھیں چھکاتی، موندتی سی
قدموں پہ نگاہ پڑتے ہی بس — طاری ہوئی دل پہ اک غشی سی
سر تا بہ قدم، وجود اُس کا — تاریکی میں ایک روشنی سی
جب دیکھیے اُس کی جس ادا کو — لگتی ہے وہ کچھ نئی نئی سی

سب لکھ کے بھی لگ رہی ہے دل کو
ہر شعر میں کچھ کمی کمی سی

قمر انصاری

۲۰، امین آباد پارک، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو۔پی)

نُورِ پیکر

پھر آگئی وہ گھڑی کہ جس کو
مُصیبتوں کا پہاڑ کہیے
اور اُس کی بے رحم چوٹیوں سے
لڑھکتے پتھر
تباہ کرنے پہ تُل گئے وہ حسین منظر
کہ جس کی تشکیل کی تھی صدیوں کی محنتوں نے، محبّتوں نے...
وہ بُوڑھا برگد
کہ جس کے سائے میں زندگی روشنی بنی تھی
عجب اندھیروں میں گھر گیا تھا
وہ ٹھنڈا چشمہ
جو اپنے جادو سے پیاس کا روگ کاٹتا تھا
مُنافرت کی فضا کے ہاتھوں
متاعِ تفریق بن گیا تھا
وہ گیت سانجھے
جو دل کی دُنیا کے ترجماں تھے
جو بُوڑھے ہو کر بھی نوجواں تھے
زباں سے جیسے اُتر گئے تھے.....

عجب نہ ہوتا
جو اس مکدّر فضا کا جادُو
ہمارے آئینِ زندگی کو
شکست کا ذائقہ چکھا کر
ہمیں اندھیروں کے بازوؤں میں دھکیل دیتا
مگر ہماری مدد کو آیا
وہ نُورِ پیکر
جو دشتِ ماضی کے زخم زاروں سے نیزہ نیزہ اُبھر رہا تھا!

اِندر سروپ دت ناداں

3/269 - B، پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

مقدس فرشتے!

تھو.... اِتھو ہے مجھ پر بھی کہ کسی ایک کی بات پر خواہ مخواہ یقین کر کے کسی دوسرے کے متعلق اس قدر غلیظ، مکروہ اور شرمناک نظریہ قائم کرنے سے پہلے میں نے جانکاری کیوں نہ حاصل کی۔ آج وہ پہلی بار ریل گاڑی میں میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تو بڑے خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا یہ الگ بات ہے کہ "صبح بخیر" کی روایتی علیک سلیک کے بعد نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے اور جونہی ہماری گاڑی کوپن ہیگن کے ریلوے اسٹیشن پر رُکی ہم دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہے بغیر اپنی اپنی راہ پر ہو لیے ___ لیکن جوں ہی میں کچھ آگے بڑھا اس کے بارے میں مجھے معین کی بتائی ہوئی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ میرے خیال میں وہ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ معین نے اُس کے بارے میں مجھے بتا رکھا تھا۔ تبھی تو اُس نے ساری راہ کوئی بات نہیں کی محض ریل گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا رہا تھا ___ "کیا وہ مجھے بھی جوتا دکھا رہا تھا" میرے ذہن میں اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے جس رویے پر ابھی تھوڑی دیر پہلے تھوکا تھا اس پر پھر سوچنے لگا تھا۔

معین اور میں دارالحکومت کوپن ہیگن کے نواحی شہر ٹاسٹروپ میں رہتے تھے۔ ہمارے گھروں کے بیچ ڈھائی تین کیلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ معین نے اپنی بیوی کو بھی یہیں بُلا لیا تھا اور میں نے تو ابھی شادی بھی نہیں کی تھی۔ میرے پاس ایک ڈیڑھ کمرے کا فلیٹ تھا اور معین چار کمروں والے کشادہ فلیٹ میں رہتا تھا۔ ہم دونوں کی دوستی بس ریل کے سفر کی تھی یا پھر اس ناطے سے کہ ہم دونوں ہی پاکستان سے تھے وہ ضلع گجرات سے اور میں... پیدائش میری آگرہ کی تھی، پرورش اور تعلیم میں نے ڈھاکہ میں پائی اور اب لاہور سے ڈنمارک... ! ہم دونوں ہی کوپن ہیگن میں الگ الگ جگہوں پر کام کرتے تھے۔ میں ایک ڈاکخانے میں کلرک تھا اور معین ایک صابن بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا۔ معین اب اپنی گرمیوں کی چھٹیوں پر تھا اس لیے آج میں اکیلا ہی کام پر جا رہا تھا... ورنہ ہم دونوں ہر روز ایک ہی گاڑی پر صبح کوپن ہیگن اپنے اپنے کام پر جاتے اور شام کو بھی اکٹھے ہی واپس لوٹتے... وہ اپنے گھر اور میں اپنے، نہ اس نے کبھی مجھے اپنے ہاں مدعو کیا اور نہ میں نے اسے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کوئی مہینہ بھر پہلے معین اور میں کام پر جانے کے لیے ریل گاڑی میں سوار ہوئے تو وہ بھی اچانک کہیں سے نمودار ہو کر ہمارے ڈبے ہی میں سوار ہو گیا... ہم دونوں ڈبے میں پہلے ڈبے میں داخل ہو جانے کی وجہ سے آمنے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے اور اُسے جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کھڑا رہنا پڑا... "یار یہ تو کوئی اپنا ہی لگتا ہے... نیا ہے شاید میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا" میں نے معین کی توجہ اس کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ لوہار کا بچہ! میں اسے جانتا ہوں... چھوکریوں کے پیچھے بھاگنے والا... یہ اکبر ہے ہمارے ہی قصبے سے ہے" معین بولے جا رہا تھا "خنزیر کو مُنہ نہ لگانا... یہاں ٹاسٹروپ میں ہی رہتا ہے کوپن ہیگن میں کام کرتا ہے" اس نے حقارت آمیز آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "دعا کرنا دن اچھا گزر جائے منحوس کی صورت دیکھ لی ہے"

"آخر کیوں؟ تم اتنے بھرے ہوئے کیوں ہو، کیا کوئی پرانا جھگڑا ہے اس سے... ایک ہی قصبے کے ہوتے ہوئے یہ رویہ کیسا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ارے بابو! تم کیا جانو... تم تو بس ڈاکخانے میں خطوں لفافوں پر ٹھپے لگاتے ہو کبھی کسی لفافے کے اندر بھی دیکھا ہے کہ باہر سے صاف ستھرا نظر آنے والا لفافہ اپنے مضمون کے لحاظ سے کتنا گندہ بھی ہو سکتا ہے... ہم صابن بناتے ہیں صابن، ایک مرتبہ مَلو تو بدن کا سارا میل دور کر کے اصلی جِلد سامنے لے آتا ہے" معین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

"اب دیکھو بندر کی اولاد ایسے کھڑا ہے جیسے ہمیں جانتا ہی نہیں، نہ دُعا نہ سلام" اس کا غصہ ابھی شاید ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

ڈبے میں کافی بھیڑ تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے ہٹ کر ایک کونے میں ہم سے کچھ اور دور ہو گیا تھا اور اب جو گاڑی اگلے اسٹیشن پر رُکی تو وہ ڈبے سے باہر نکل گیا میری طرح معین نے بھی دیکھا کہ اس نے ڈبہ تبدیل کر لیا تھا۔

VAEKELROVEJ 20/4-3, 2880 BAGS-
-VAERD, DENMARK

"دیکھا بابو تم نے، آخر لو مڑ بھاگ گیا نا۔"
معین ابھی تک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔
"معین یار معاف کرنا میں نے پہلے تمہیں کبھی ایسی زبان استعمال کرتے سنا نہیں اور پھر وہ بھی اپنے ہی ایک ہم وطن اور اپنے ہی قصبے کے رہنے والے کے متعلق ——— آخر کیا بات ہے؟"
میں اب غور سے معین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی اور ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں میں سے کچھ تو حسبِ معمول اونگھ رہے تھے اور کچھ صبح کے اخبار پڑھ رہے تھے کچھ ایسے بھی تھے جو آپس میں باتیں کرتے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے کو ایسے ہی جانتے تھے جیسے میں اور معین ——— محض ہمسفر تھے۔

"سنو بابو ——— یہ "اکبرا" ہے تو ہمارے ہی قصبے راکھیاں کا اور تم جانتے ہی ہو کہ اس قصبے کے ہم ایک دو نہیں سینکڑوں "ٹبر" یہاں ڈنمارک میں رہتے ہیں اور پھر کوپن ہیگن، البرٹ سلنڈ اور ٹاسٹروپ تو ہمارے لیے راکھیاں ہی تو ہیں کبھی تم نے سوچا کہ ان شہروں میں رہنے والے پاکستانیوں میں اپنے قصبے کے کتنے لوگ ہیں ——— ان شہروں میں بابو راکھیاں والوں کی اکثریت ہے باقی پاکستانی تو ادھر ادھر دوسرے شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں"، معین اصل بات کی طرف آنے سے پہلے شاید تمہید باندھ رہا تھا۔ لیکن میں نے ٹوک دیا ———
"ہاں ہاں اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ان شہروں میں دوسرے تارکینِ وطن کے مقابلے میں راکھیاں والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور باقی رہے پاکستانی ——— وہ تو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں اور وہ ہیں بھی کتنے؟ تم اکبر کی بات کر رہے تھے" میں نے کہا۔
"بابو تم بھی راکھیاں والوں کا مذاق اڑاتے ہو"، معین بولا۔ شاید وہ میرے طنز کو سمجھ گیا تھا ——— "تم اکبرے کو کیا سمجھو گے؟ میں اس کے ساتھ مڈل تک پڑھا ہوں، ہے تو ہماری برادری کا لیکن ہے کالی بھیڑ ——— "وہ اپنے شولڈر بیگ، جسے وہ اپنی جھولی میں ایک بچے کی طرح سنبھالے ہوئے تھا اس میں سے ایک مالٹا نکالتے ہوئے بولا ——— "ہاں تو میں کہہ رہا تھا" معین نے اب مالٹا چھیلتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی ——— "اکبرا ہے تو ہماری ہی برادری کا لیکن جیسا کہ وہاں راکھیاں میں اس کے گھر والوں کا برادری کے دوسرے خاندانوں سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی یہاں سب سے الگ تھلگ ہے۔ یہ پڑھا لکھا تو ہے لیکن ہے بیوقوف، میرے خیال میں یہ ان کی خاندانی بیماری ہے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود جاہل ہیں ——— اپنی زمینیں بیچ بچاکر شہر میں جاکر کوٹھیاں بنالیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے ——— مڈل کرنے کے بعد یہ بھی شہر چلا گیا تھا ——— وہاں اس کے باپ کا کوئی کارخانہ ہے چاول چھڑنے کا۔ منڈی میں ان کی کچھ دکانیں بھی ہیں۔
یہ سن ستر اکہتر میں ملک سے باہر چلا آیا تھا۔ جرمنی اور ادھر ادھر دھکے کھانے کے بعد اب یہ پچھلے سولہ سترہ برس سے یہاں ڈنمارک ہی میں رہتا ہے۔ پہلے پہلے یہ لوگوں سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن جوں جوں اس کے پاؤں جمتے گئے یہ سب سے الگ ہوتا گیا۔ میم کا پجاری ——— یہ الگ کیا ہوتا لوگوں نے خود ہی اس سے کنارہ کرلیا ———"
معین نے مالٹے کے چھلکے ریل گاڑی سے باہر پھینکنے کے لیے کھڑکی کا شیشہ جو نیچے کھینچا تو ایک دو مسافروں کے اخبار پھڑپھڑائے اور بعض نے ناگواری بھی ظاہر کی۔ اب وہ مالٹا کھانے لگا تھا۔
میں نے کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھا دیا ———
"چھوڑو یار ٹھنڈی ہوا آرہی ہے" وہ بولا۔
"یہ حرامی ڈینش بھی عجیب ہیں جب دیکھو یا تو کچھ پڑھتے رہتے ہیں یا پھر منہ میں کچھ چباتے رہتے ہیں ——— اب دیکھو کیسے کنکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں ——— بابو وہ تم نے گاندھی فلم میں دیکھا جنوبی افریقہ میں مہاتما کو کیسے اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیتے ہیں ——— ان ڈینشوں کا بس چلے تو ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک کریں یہ تو یہاں کا قانون ہے بھئی کہ ہم سینہ تان کر چلتے ہیں" وہ بڑی دور کی لاتے ہوئے بولے جارہا تھا ——— "سالے ہمیں کالے سوّر سمجھتے ہیں ہم سے جلتے ہیں ——— ان کو دکھ ہے کہ ہم کالے نوکریوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھوکریوں پر بھی قبضہ کرتے جارہے ہیں" اس نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کم از کم سب مسافروں کو اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ میں نے اس کے گھٹنے کو قدرے دباتے ہوئے اسے نیچی آواز میں بات کرنے اور دوسروں کے آرام کا خیال رکھنے کو کہا تو وہ بولا۔
"بابو تم خوامخواہ ڈرتے رہتے ہو، یہ کمینی قوم تو ہے ہی ایسی، نہ کسی سے بات نہ مذاق، اب دیکھو ایسے بیٹھے ہیں جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہے ——— بڑے خود پرست ہیں یہ بابو، اپنے آپ میں رہنے والے، مطلب ہو تو بات کرتے ہیں پھر یہ بھی یاد نہیں رکھتے کہ کس نے کیا احسان کیا تھا، سالے ایک دوسرے سے سگریٹ تک پیسے دے کر لیتے ہیں۔ مانگتے نہیں کہ کہیں خود بھی نہ دینا پڑجائے" وہ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا جہاں مالٹے کا رس ابھی تک لگا ہوا تھا۔

"حرامی سؤر کھاتے ہیں لاحول، ہیں سؤر کہہ کر سؤر ہی کی گالی دیتے ہیں۔" اب وہ ارد گرد والوں کو بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"چھوڑو یار معین ان لوگوں کی کیا بات کرتے ہو؟ کیا یہ کافی نہیں کہ ہمیں یہاں وہ سب کچھ میسّر ہے جس کا ہم اپنے وطن میں تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے ـــــ چھوڑو ان باتوں کو ـــــ تم اکبر کا ذکر کر رہے تھے!" گاڑی اب ایک اسٹیشن پر رُکنے کے لیے ذرا آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ اور معین نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا کر رہے ہو بھئی، کھڑکی بند کر دو تیز ہوا آ رہی ہے۔" میں نے اس کی کمر پر ہلکے سے تھپکی دیتے ہوئے کہا وہ مسافر جو اونگھ نہیں رہے تھے اب ان میں سے کئی ایک بڑی ناگواری کے ساتھ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"میں تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کمینہ اکبر اُتر گیا ہے کہ نہیں۔" وہ بولا اور کھڑکی بند کر کے اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گیا۔

"تم تو بتا رہے تھے کہ وہ کوپن ہیگن میں کام کرتا ہے ـــــ یہاں اس اسٹیشن پر کیوں اُترے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بابو! تمھاری طرح وہ لفافوں پر آٹھ گھنٹے ٹھپّے لگا کر گھر آ کر سو نہیں جاتا ـــــ وہ صبح یہاں گلوسٹروپ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور پھر شام کو پن ہیگن کے کسی ہوٹل میں بابو گری ـــــ لیکن تم نے دیکھا کیسا لگ رہا تھا، اس کے کپڑے دیکھے تم نے؟ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ وہی تھے جو آٹھ دس سال پہلے اس کے پاس ہوا کرتے تھے ـــــ بابو، ہوٹل کی نوکری سے اسے بہت فائدہ ہے ـــــ تنخواہ کے علاوہ کھانا مفت اور ہر رات نئی چھوکری اکیلا رہتا ہے نہ کسی کے ہاں آنا نہ جانا، اسی لیے تو ہم بھی اسے مُنہ نہیں لگاتے، اسے تو بس پیسہ کمانے کی پڑی ہے۔ یہاں دیکھو سالے کی حالت، ہمارے یہاں کے بھنگیوں جیسی ہے لیکن پاکستان میں اب تین کوٹھیوں کا مالک ہے۔ ذرا سوچو تو کتنا کرایہ ہوگا ان کا ـــــ" معین بولے جا رہا تھا۔ اُسی رفتار سے جیسے گاڑی چل رہی تھی۔

"چھوڑو بھی یار ان باتوں کو وہ کیا کرتا ہے کیا نہیں۔" میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ "تم نے بھی تو ایک کوٹھی بنالی ہے اور پچھلے برس تم ایک کار بھی وطن لے گئے تھے، کہتے تم بیچی تھی وہ، کیا اب کے پھر ارادہ ہے؟" میں نے معین کی طرف دیکھا تو وہ ذرا کھسیانا سا ہو گیا۔

"بڑا یاد رکھتے ہو بابو تم بھی ـــــ آخر بھتیجے ہو نا ـــــ" وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ "بابو اس اکبرے نے بڑا پیسہ کمایا ہے شروع شروع میں اس نے ہمارے جیسے لوگوں کو "دھکے" سمجھ کر برتاؤ کیا ـــــ میں نے تمھیں بتایا نا کہ یہ ان لوگوں میں تھا جو پہلے ڈنمارک آگئے تھے کولمبس کی اولاد نے یہاں آتے ہی پتہ نہیں گوروں پر کیا جادو کیا کہ فوراً ہی ایک بڑے بنگلے کا مالک بن گیا۔ یہ جب کالج میں پڑھتا تھا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی ماسی کے یہاں کبھی کبھی راکھیاں آجاتا تھا اور اکثر ہم عمروں میں بیٹھ کر اپنی عقل جھاڑا کرتا تھا وہ بیچارے سیدھے سادے جاٹ اس کی بہت عزت کرتے تھے ان میں کچھ نے تو اس کی باتوں میں آ کر دیکھا دیکھی کالجوں کا رُخ کر لیا تھا۔ یہ خود تو کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یورپ میں دھکے کھاتا یہاں ڈنمارک آگیا۔ اور اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے میراسی ـــــ بابو دیکھنا کہیں ہم باتیں ہی کرتے نہ جائیں۔ گاڑی کا بھی دھیان رکھنا، اسٹیشن آنے والا ہوگا۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"ابھی تو چھ اسٹیشن پڑے ہوئے ہیں بھئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو بابو اس اکبرے نے ڈنمارک آتے ہی راکھیاں سے اپنے کئی دوستوں کو یہاں بُلوا لیا اس نے ویزے بھجوائے تھے یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ان لوگوں کو یہاں آنے کے لیے پاسپورٹ سے لے کر ٹکٹ تک بنوانے میں اس کے باپ نے کیوں مدد کی۔ وہ برادری میں اپنا طرّہ اونچا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ یہاں آئے تو اس اکبرے نے برادری کا لحاظ کیے بغیر، بابو ان کو اپنے ہاں بنگلے میں برادری کے لوگوں کے بجائے "چوہڑوں" کی طرح رکھا۔ اس نے نہ صرف کمروں کا کرایہ لیا بلکہ اپنے باغیچے کی صفائی کٹائی بھی کراتا رہا ـــــ اور پھر یار کیا یہ ظلم نہیں کہ اس نے اُس ڈینش عورت کو بھی گھر سے نکال دیا جس نے اس کو بنانے میں مدد کی تھی۔ اور پھر وہ لوگ جو اس کے ہاں رہتے تھے اس کے ہتھکنڈوں سے تنگ آ کر خود ہی اس کے ہاں سے منتقل ہونے لگے تھے۔" معین نے اپنے بیگ کو اپنی ٹانگوں سے اُٹھا کر اب اپنے پاؤں کے درمیان رکھ لیا تھا۔

"لیکن اس میں برائی یا ظلم کی کیا بات ہوئی؟ کیا ہم ڈینشوں کو کرایہ دیے بغیر رہا کرتے تھے یا اب رہتے ہیں؟" میں نے ایک طرح سے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بابو یہ ڈینش سالے تو باپ کو بھی معاف

نہیں کرتے، اِدھر دے اُدھر لے کا اصول شاید پوری دنیا میں صرف ان پر لاگو ہے۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ ڈینش تو ڈینش ہیں، آپس میں جو چاہیں کریں، اسے یہاں پردیس میں ہموطنوں سے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بابو کہاں ٹھپے لگاتے رہتے ہو ____ اِتم بھی تو اپنے آپ میں رہتے ہو کبھی سے ملو جلو تو پتہ چلے اس کے کرتوتوں کا ____ سنا ہے تم بھی گوریوں کے پیچھے بھاگتے ہو، چھوڑو یار بابو، سوٴر کھانیوالیوں کا منہ کیسے چومتے ہو؟" اس نے بھرپور قہقہہ لگایا جو ریل گاڑی کے چلنے کی آواز کے باوجود پورے ڈبے میں سُنا گیا۔ یہ میرا قیاس ہے کیوں کہ اب سبھی مسافر ہماری طرف گھور رہے تھے۔

"چھوڑو یار کوئی اور بات کرو، مجھے اکبر سے کیا لینا دینا میں تو ویسے ہی پوچھ بیٹھا تھا۔" میں نے ایک طرح سے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ____ "کہو چھٹیاں کب لے رہے ہو اور وطن میں کتنی دیر تک رہنے کا ارادہ ہے؟" میں نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔

"بابو ہم کوئی تمہاری طرح کے تو ہیں نہیں کہ جب سے آئے ہو یہیں کے ہو گئے ہو، ہم تو دو تین سال بعد چکر لگا آتے ہیں۔ آخر دیس، دیس ہے۔ اب میں اور تمہاری بھابھی دونوں اگلے ہفتے چلے جائیں گے ____ یار بابو یہ کوپن ہیگن میں اپنے پاکستانی ٹکٹ فروش ایجنٹ بھی کھال اتار لیتے ہیں۔ اور پھر جاؤ تو ہر کوئی منہ کھولے آجاتا ہے کہ اُسے تحفہ ملے گا۔" وہ بولتے بولتے قدرے خاموش ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس نے اب اکبر کا ذکر چھوڑ کر خود موضوع بدل لیا تھا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ بولا ____ "ہاں تو بابو____ یہ اکبرا ابھی تک اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ جب موقع ملتا ہے ڈنک مار دیتا ہے۔" اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور اپنے دانتوں میں ماچس کی ایک تیلی پھیرنے لگا ____ "یہ دو مکھیا سانپ ہے بابو۔" شاید اس کے دانتوں میں مالٹے کا کوئی ٹکڑا پھنسا ہوا تھا جسے وہ بڑے بھدے پن سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بابو یار ذرا تم ہی انصاف کرو کہ اس اکبرے نے جب گاؤں کے کمیوں کے بیٹوں کیا کمہاروں کیا، جلاہوں کو یہاں بُلوایا تو میرے دل میں بھی یورپ کی حسرت پیدا ہوئی۔ برادری میں اکیلا میرا باپ ایسا تھا جو اس کے باپ کی عزت کرتا تھا اور اپنا غلہ وغیرہ بھی انہی کی دُکان پر منڈی میں لے جاتا تھا۔ یہ خود میرے باپ کو تایا جی، تایا جی کہا کرتا تھا ____ لیکن جب میں نے اُسے خط لکھا کہ یہ مجھے یہاں ڈنمارک بُلالے تو کمینے نے نہ تو میری دوستی کا پاس رکھا اور نہ ہی اپنے مُنہ بولے تایا جی کی عزت کا احساس کیا۔ پتہ ہے اس نے جواب میں مجھے کیا لکھا؟" معین نے کچھ سوچتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس نے لکھا کہ مجھے وہیں رہ کر اوّل تو اپنی تعلیم جاری رکھنی چاہیے یا پھر اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرنی چاہیے اور یہ کہ ڈنمارک کی فیکٹریوں میں خون جلانے سے بہتر ہے کہ اپنے کھیتوں کو اپنے پسینے سے سیراب کر کے فصلیں اُگاؤں ____ بابو، یہ تو میری اپنی ہمت تھی کہ میں آج یہاں ہوں میرا روپیہ تو بیس پچیس ہزار لگ گیا تھا لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں ____ لیکن جب میں یہاں آگیا تو میں نے اکبرے سے مل کر کام تلاش کرنا چاہا۔ اس نے مجھے ایک ہوسٹل میں ٹھہرایا اور گتے کے ڈبے بنانے والی ایک فیکٹری میں کام دلوا دیا۔ بابو یہ کام قلیوں سے بھی بدتر تھا، میں مرتا کیا نہ کرتا ____ ویزا جو پکا کرانا تھا ____ کام کرنا پڑا ____ چھ ماہ کرتا رہا۔ اس دوران اکبرے نے نہ تو میری کبھی خبر گیری کی اور نہ ہی کبھی حال احوال جانا ____ کبھی کبھار اگر چلتے چلاتے یہ کہیں مل بھی جاتا تو سالا میری ہی چائے اور سگریٹ پی پی کر اُلٹا مجھے ہی کہتا کہ یہاں پردیس میں کیا رکھا ہے وہ جن کی زمینداریاں تھیں یہاں برتن مانجھتے ہیں ____ اور خود دیکھو تو ذرا اپنے باپ کا کارخانہ چھوڑ کر اب گوری میموں کے کتے گود میں لیے پھرتا ہے ____ بابو ڈنمارک کی برف کی طرح اس کے خون کا رنگ بھی سفید ہو گیا ہے۔ اسے کبھی ویک اینڈ میں دیکھنا سالا ایسے لگتا ہے جیسے ڈنمارک کا نواب ہو، سوٹ پہنے اور سر پر ہیٹ سجائے گھر سے نکلتا ہے ____" گاڑی کی رفتار اب سُست ہو چکی تھی ____ "کوپن ہیگن آگیا بابو۔" معین نے اپنے پاؤں کے درمیان رکھے ہوئے اپنے بیگ کو اٹھانے کے لیے جھکتے ہوئے کہا اور جوں ہی اس نے بیگ اوپر اٹھایا تو اس میں سے ایک مالٹا لڑھک کر مسافروں کے جوتوں کو چھوتا ہوا ____ کسی سیٹ کے نیچے غائب ہو گیا۔ معین اُسے ڈھونڈنے کے لیے پہلے تو اِدھر اُدھر سیٹوں کے نیچے جھک جھک کر جھانکتا رہا اور پھر خود ہی بولا "یہ اپنے مقدّر میں نہیں تھا۔" گاڑی بھی رُک چکی تھی۔ اور ڈبے کے مسافر ایک ایک کر کے باہر نکل رہے تھے۔ ہم دونوں بھی باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن معین کی نگاہیں ابھی تک سیٹوں تلے مالٹے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں جسے نہ ملنا تھا نہ ملا

"اچھا بابو ــــ اب تو مہینے بعد ہی ملاقات ہوگی" ڈبے سے باہر نکلتے ہی اس نے ایک طرح سے نعرہ لگایا ــــ "مجھے آج شام لیٹ گھر جانا ہے اس لیے واپسی پر ملاقات نہیں ہو سکے گی ــــ خدا حافظ بابو ــــ اور ہاں لفافوں پر ٹھپے لگاتے ہوئے ہیر پھیر نہ کرنا . . . کہیں ہمارا خط ادھر اپنے ہاں ہی رکھ لو" اس نے جاتے جاتے قہقہہ لگایا " اس اکبرے سے بچ کے رہنا بابو" مسافروں کی بھیڑ میں کہیں دور سے مجھے اس کی آواز سنائی دی . وہ بڑی پھرتی سے آگے جا چکا تھا .

معین نے جب سے مجھے اس کے بارے میں یہ باتیں بتائیں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اُسے کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی میرے ذہن میں نجانے اس کے متعلق یہ باتیں کیسے بیٹھ چکی تھیں اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا . معین کو چھٹی پر گئے ہوئے کوئی ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک صبح کام پر جاتے ہوئے وہ ریل گاڑی کے اسی ڈبے میں سوار ہو گیا جس میں بیٹھنے کے لیے میں پہلے ہی اندر داخل ہو چکا تھا . اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ میرے سامنے والی خالی نشست پر آ کر بیٹھ گیا ــــ "صبح بخیر" اس نے میرے ہاتھوں میں میرے ڈاکخانے کے بیگ کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "صبح بخیر" میں نے بھی روایتی مسکراہٹ سے جواب دیا . لیکن اب اس نے اپنی کمر ریل گاڑی کے ڈبے سے لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا ــــ اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوپن ہیگن ریلوے اسٹیشن تک ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی . "لیکن معین نے تو بتایا تھا کہ وہ صبح کے وقت گلوسٹروپ میں کام کرتا ہے اور اترا ہے وہ کوپن ہیگن" میں سوچے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے بارے میں بتائی ہوئی معین کی باتیں ــــ مجھے ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں .

دوسرے روز بھی ہم ایک ہی ساتھ پہلو بہ پہلو ایک ہی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے "کیا آپ ڈاکخانے میں ملازمت کرتے ہیں؟" لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا .

"جی! بڑے ڈاکخانے میں' اور آپ . . ؟" میں نے بات آگے بڑھائی .

"میں کوپن ہیگن کے ایک ہوٹل میں استقبالیہ کلرک ہوں اور کبھی کبھی یہاں گلوسٹروپ میں صبح کے وقت ایک فیکٹری میں صفائی کا پارٹ ٹائم کام بھی کر لیتا ہوں" وہ ایک طرح سے میرے ساتھ قدرے کھلنے لگا تھا . پنجابی ہوتے ہوئے وہ بڑی شائستہ اردو بول رہا تھا اور اس کے لہجے میں جاذبیت بھی تھی .

"مجھے صفدر کہتے ہیں" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ــــ "اور میرا نام اکبر ہے . . . اکبر چوہدری" وہ بولا .

"جی مجھے معلوم ہے" میں نے انکساری کے ساتھ کہا ــــ "مجھے ایک دن معین نے بتایا تھا" میں نے ظاہر کرنا چاہا کہ میں اس سے پہلے سے واقف ہوں .

"او . . . اچھا . . . وہ اپنا معین' . . . . معین چوہدری" وہ قدرے تعجب کا اظہار کر رہا تھا "آج کل کیا کرتا ہے وہ؟ مجھے تو ایک مدت ہو گئی اس سے ملے ہوئے" وہ بولا .

"یہیں ٹاسٹروپ میں رہتا اور کوپن ہیگن میں صابن بنانے کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے" میں نے جواب دیا . اس نے میرے جواب پر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے اپنے بریف کیس سے کچھ کاغذ نکالے اور انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور میں معین کے بارے میں سوچنے لگا .

اب یہ ہمارا روزمرہ کا معمول سا بن گیا تھا کہ میں اور اکبر ایک ہی گاڑی سے صبح کوپن ہیگن جاتے تھے . رستے میں ہم طرح طرح کی باتیں کرتے وہ مجھے اپنے ہوٹل میں آنے والے مہمانوں کی زندہ دلی اور حماقتوں کے بارے میں بتاتا تو میں اسے ڈاکخانے میں اپنے تجربات کے بارے میں، کبھی کبھی ہم اپنے ساتھ سفر کرنیوالے ڈینشوں کے بارے میں بھی کچھ جملوں کا تبادلہ کر لیتے تھے اور بس' ہمارا سفر اچھا گزر جاتا تھا وہ بڑا دلچسپ لیکن کم گو ضرور تھا میرے خیال میں وہ بور تو کسی بھی طور نہیں تھا .

آج جمعہ تھا ہم دونوں ریل گاڑی میں کوپن ہیگن جا رہے تھے اور حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے "کیا آپ کے بیوی بچے بھی یہیں ہیں؟" اکبر نے آج پہلی بار مجھ سے میری نجی زندگی کے متعلق پوچھا .

"نہیں بھئی ــــ میں اکیلا رہتا ہوں . ابھی تو شادی بھی نہیں کی ــــ" میں نے جواب دیا .

"میں بھی اکیلا ہی ہوں" اس نے میری طرف مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے بارے میں خود ہی بتا دیا ــــ "آپ ویک اینڈ میں کیا کرنیوالے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں، بس گھر کی صفائی اور شاید کپڑے دھولوں ــــ کیوں؟" میں نے پوچھا .

"میں سوچ رہا تھا اگر تمھارے پاس وقت ہو تو ہفتے کی شام کچھ دیر میرے ہاں آ جانا ــــ

مجھے بھی کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہی ٹاسٹروپ ریلوے اسٹیشن کے باہر سے بس نمبر چھتیس پر بیٹھ جاؤ اس کا آخری اسٹاپ میرے گھر سے دو منٹ کے فاصلے پر پڑتا ہے۔ ایلیبین وائے نمبر گیارہ، میرا مکان ہے ____ کچھ مشکل تو ہوگی نہیں ____ میں ہفتے کی شام چھ بجے منتظر رہوں گا۔" وہ بولا۔

"بہتر!" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں باتیں کرتے کوپن ہیگن پہنچ کر اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

دوسرے روز ہفتے کی صبح میں جلد ہی جاگ گیا تھا۔ بازار سے سودا سلف خریدنے کے بعد میں نے لانڈری میں جاکر دو مشینوں میں کپڑے دھوئے اور گھر واپس آکر کچھ صفائی وغیرہ کرتا رہا ____ بارہ بجے کے قریب تھوڑا سا کھانا کھا کر میں گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل گیا ____ دراصل میں کچھ وقت گزاری کر رہا تھا۔ اور ایک طرح سے اکبر سے ملنے کا منتظر تھا۔ پانچ بجے کے قریب میں نے نہا دھو کر اپنا ایک عمدہ سوٹ پہنا، گھر میں رکھی ہوئی شراب کی بوتلوں میں سے "سرخ شراب" کی ایک بوتل اپنے کام والے تھیلے میں ڈالی اور اکبر کے گھر جانے کے لیے ____ بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ وہاں سے میں نے چھتیس نمبر والی بس پکڑی اور کوئی بیس منٹ کم چھ بجے میں اکبر کے گھر کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

"آئیے... صفدر بھائی... آئیے!"

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے خالصتاً پنجابی انداز میں ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں یہ دیکھ کر ایک طرح سے حیران ہو گیا کہ وہ اکبر جو ہر روز سوٹ پہنے کام پر جاتا تھا گھر پر شلوار قمیص کے ساتھ چمکتے ہوئے طِلے والا جوتا پہنے سر سے پاؤں تک پنجاب بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنا سوٹ اپنے کاندھوں پر بھاری لگنے لگا تھا۔

میں نے اپنے بیگ سے "سرخ شراب" کی بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھائی ____

"اکبر بھائی!"

"ارے یہ کیا آپ بھی..." وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر میرے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے اس کا لیبل دیکھ رہا تھا ____ "او! یہ تو الجزائر سے ہے، بھئی صفدر کیا بات ہے خالص اسلامی بوتل لائے ہو ____ لیکن اس تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

میں اپنے جوتے اتار کر ڈرائنگ روم میں جونہی داخل ہوا ____ اعتراف کرتا ہوں کہ ہکا بکا رہ گیا۔ اکبر اعلیٰ ذوق والا لگتا تھا ____ دیواروں پر لٹکی آئل پینٹنگز اور ایک خوبصورت کلاک، فرش پر پڑے خوبصورت قیمتی قالین چمڑے کے صوفے اور دیگر قیمتی فرنیچر، ہر چیز صاف ستھری اور بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھی۔

"اکبر اس اتنے بڑے بنگلے کو اکیلا کیسے سنبھالتا ہوگا؟" میرے ذہن میں اچانک خیال ابھرا اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی دیر میں وہ ہاتھ میں دو گلاس اور میری لائی ہوئی "سرخ شراب" کی بوتل لے کر آگیا ____ "ہاں تو صفدر بھائی کیسے ہو؟" اس نے پوچھا اور گلاسوں میں شراب انڈیل دی۔ وہ بوتل کا کارک شاید باورچی خانے ہی میں اڑا آیا تھا ____ "چیرز"

"بس بھئی مزہ آگیا یار ____ خوب سجاوٹ سے رہتے ہو ____ کب سے ہو یہاں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے شراب کا جام اٹھا کر چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یار یہ کیا ہم آپ، آپ کیے جا رہے ہیں! تم اور تو میں ڈینشوں کی طرح بات کیوں نہیں کرتے ان لفظوں میں کتنی اپنائیت ہے۔" وہ بولا "مجھے یہاں اب اُنیس برس ہونے کو ہیں۔" اس نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا ____ اور پھر اٹھ کر ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آن کر دیا۔ غلام علی اپنی آواز کا جادو جگا رہا تھا ____ "بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے، کون گیاں نوں موڑ لیاوندا ای۔" ہیر وارث شاہ کے بول تھے ____

ہاں بھئی جانے والوں کو کون ملا سکتا ہے! کیوں صفدر؟ اکبر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ کبھی ہم بھی سوچا کرتے تھے کہ وطن واپس جائیں گے ____ اب نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے ____" اس نے اپنے ہاتھ میں شراب کا گلاس گھماتے ہوئے گہری لمبی سانس لی ____ اور پھر کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا ____ "کیا وطن بہت ہی یاد آ رہا ہے؟" آخر مجھے ہی خاموشی کو توڑنا پڑا۔

"ہاں! وطن تو یاد آتا ہی ہے ____" وہ بولا ____ "اب مجھے گئے ہوئے چھ سال گزر چکے ہیں ____ تم نے شاید بتایا تھا کہ وہ معین بھی ابھی دنوں پاکستان جانے والا تھا ____ چلا گیا کیا؟" اس نے پوچھا۔

معین کو گئے تو اب دو ہفتے ہونے والے ہیں۔ دونوں میاں بیوی گئے ہوئے ہیں۔" میں نے اپنے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھو نا ____ یہ تو ہماری ہم وطنی رہ گئی ہے ایک دوسرے کو جاتے ہوئے بتاتے بھی نہیں۔ میں اور معین ایک ہی قصبے سے ہیں اگر وہ بتا دیتا تو کیا تھا۔ میں نے بھلا کون سا فریج، یا ٹی وی اس کے ہاتھ بھجوانا تھا یا واپسی پر تمباکو

منگوانا تھا ہی ہو تاکہ کچھ دوستوں کے لیے سلام
کہہ دیتا۔" اس نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے
بوتل سے اس میں شراب انڈیلی اور ایک بڑا
گھونٹ حلق سے اُتار کر گلاس میز پر رکھ دیا۔
"میں نے تو تمہارے آنے سے پہلے چائے بنائی تھی۔
لیکن تمہاری یہ بوتل بھی خوب ہے ۔۔۔ "عمر خیام"
جیسا خوبصورت نام ویسا ہی ذائقہ بھی ہے۔" وہ بولا۔
"اور سرور بھی۔" میں نے لقمہ دیا ۔۔۔
"آخر اسلامی ملک کی بنی ہوئی خالص حلال جو ٹھہری
اپنا رنگ تو دکھائے گی۔"
"تم معین کو کب سے جانتے ہو؟" اس
نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"یہی کوئی تقریباً چار ماہ سے، جب سے
میں یہاں ٹاسٹروپ منتقل ہوا ہوں پہلے میں راسکیلڈے
میں رہتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔
"آدمی اچھا ہے لیکن یار صفدر پھر وہی بات
ناکہ ہم لوگ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو
اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ڈٹے رہتے ہیں۔" اس نے گلاس
سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کھاتے پیتے گھر
سے ہے بڑی زمینداری ہے ان کی بس باہر آنے کا
شوق تھا اب دیکھو فیکٹریوں میں صابن بناتا
ہے، وہاں ہوتا تو راجہ ہوتا ۔۔۔ راجہ!" وہ
بولے جا رہا تھا اور میری طرح گلاس سے آہستہ
آہستہ گھونٹ بھی لیے جا رہا تھا۔" میں نے خود
بھی تو یہی حماقت کی تھی کہ یہاں آگیا تھا ۔۔۔
لیکن یار اُن دنوں حالات بڑے اچھے تھے اُن
لوگوں کو ہماری ضرورت تھی اس طرح کی بیروزگاری
تو تھی ہی نہیں جیسی آج ہے ۔۔۔ میرے پاس
کچھ رقم تھی، تین ہزار ڈالر تھے جو میرے باپ
نے مجھے پتہ نہیں کہاں سے لے کر دیے تھے ۔۔۔
اور پھر یہاں آکر محنت مزدوری کر کے بھی کچھ
رقم بچالی تھی۔ میں نے یہ مکان خرید لیا۔ اس میں
کچھ مدد میری ایک دوست ماربیرٹ نے
بھی کی اس نے کچھ رقم تو خود مجھے دی کچھ بینک سے
ضمانت پر قرضہ دلا دیا ۔۔۔ بڑی اچھی لڑکی تھی۔
اب بھی جان پہچان تو ہے لیکن وہ بات کہاں ۔۔۔"
اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی ۔۔۔
"اب تو وہ دو بچوں کی ماں ہے۔"
"تم نے ایک دوسرے کو چھوڑا کیوں؟"
میں نے اس کے اور اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے
ہوئے پوچھا۔
"یار یہ غلطی میری ہی تھی، تم جانتے ہی ہو
کہ آج کل کسی سے نیکی کرو تو نتیجہ کیا نکلتا ہے
اور پھر یہ اپنے تو بچھو ہیں بچھو ۔۔۔ ذرا موقع ملتے
ہی ڈنک مار دیتے ہیں۔ شاید تم جانتے نہیں کہ
ہمارے قصبے کے جتنے لوگ یہاں ہیں انہیں سے
اکثر کو میں نے اپیلائمنٹ اور ورکنگ ویزے
بھجوا کر یہاں بلوایا تھا ۔۔۔ میں کہنا تو
نہیں چاہتا لیکن تم نے پوچھا ہے تو کہنا ہی پڑتا
ہے کہ یہ معین ہے نا یہ جب وطن میں تھا تو اس
نے بھی دو تین بار مجھے لکھا کہ میں اسے یہاں بلواؤں
لیکن اوّل تو میں نے اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ
دیا۔ اور لکھا کہ اگر خدانخواستہ وہ یونیورسٹی سے
الرجک ہے تو پھر اپنے آبائی پیشے زمینداری کی
طرف توجہ دینی چاہیے اس طرح وہ ڈنمارک سے
کہیں زیادہ باعزت رہ سکے گا لیکن اس پر تو بس
ایک بھوت سوار تھا اس نے صبر بھی نہ کیا اور پھر۔۔"
اکبر نے گلاس سے گھونٹ لیتے ہوئے دوبارہ کہنا
شروع کیا ۔۔۔ "ہمارے قصبے کے ایک
شاہ جی ہیں جو یہاں ہی رہتے ہیں۔ معین نے راکھیاں
میں اُن کے گھر والوں سے مل ملا کر پچیس ہزار روپے
وہاں ادا کر کے شاہ جی سے ایک اپیلائمنٹ لیٹر
اور ویزا منگوایا اور پھر یہاں آگیا شروع کے دو
تین ہفتے یہ میرے ہی ہاں ٹھہرا ۔۔۔ مجھے اس
سودے کا جب پتہ چلا تو میں نے شاہ جی کو بلا کر
پیسے واپس کرنے کا مطالبہ کیا خود معین بھی اس
مطالبے میں شامل تھا لیکن ہوا کیا کہ اس شاہ نے
معین کو یہاں سے نکلوا دینے کی دھمکی دی جو کارگر
ہوئی اور میری تمام تر کوشش کے باوجود معین
اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گیا۔ اس پر یہ خوف
رہنے لگا کہ شاہ جی کہیں ڈنمارک سے نکلوا نہ دیں
۔۔۔ میرا کیا تھا میں بھی خاموش ہو رہا ۔۔۔
لیکن شاہ جی بات نہیں بھولے وہ میرے سخت
خلاف ہو گئے ۔۔۔ راکھیاں کی ہی طرح یہاں
بھی ان کے مریدوں کی کافی تعداد ہے ان کی پیری
مریدی کا سلسلہ یہاں بھی جاری ہے ۔۔۔
صفدر یار، یورپ میں رہنے کے باوجود ہم لوگوں
کی توہمات پرستی ابھی تک نہیں گئی ۔۔۔" اکبر
نے شراب کی چسکی لی اور بولا۔" ان شاہ جی نے
میرے بارے میں اپنے مریدوں میں طرح طرح کی
باتیں پھیلائیں ۔۔۔ میں شراب پیتا ہوں،
بینک سے سود پر پیسے لے کر مکان خرید رکھا ہے
میں یہ ہوں میں وہ ہوں، وغیرہ وغیرہ ۔۔۔"
اکبر نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے
پھر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔" ان شاہ جی کو
ایک ہی تکلیف تھی کہ میں نے معین کو اُن کے
خلاف اکسایا۔ اور اُسے آمادہ کیا کہ وہ ان سے
پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرے ۔۔۔ صفدر
یار! کیا یہ ظلم نہیں تھا کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا جس
پر نہ ہینگ لگی ہو نہ پھٹکری اسے شاہ جی پچیس
ہزار روپے میں فروخت کر دیں تمہیں یاد ہوگا
شروع شروع میں ہم کتنے ہی ایسے اپیلائمنٹ
لیٹرز اور ورک پرمٹ لیا کرتے تھے تم نے بھی

شاید لوٹ لیا ہو ــــ بہر حال شاہ جی نے
پیسے نہ دینے تھے نہ دیے بلکہ اُلٹا اُنھوں نے
نہ صرف مجھے بلکہ معین کو بھی اپنے مریدوں سے
پٹوانے کی دھمکی دی یہ راکھیاں والے اپنے قصبے
میں لاٹھیوں کی طرح یہاں بھی ہاکیاں چلانے
سے نہیں ڈرتے ــــ یار کمال ہے کہ شاہ جی
کے اکثر وہ مُرید جنھیں خود میں نے غریب غربا
سمجھ کر یہاں مفت بلوایا تھا۔ شاہ جی کے ایک
اشارے پر وہ بھی مجھ سے دُور ہوتے گئے۔ اور
معین ــــ! وہ تو خود بھی اُنہی سے جا ملا تھا
ــــ اور آج تک وہ ان ہی کے ساتھ یہیں
کہیں رہتا ہے، میں ان لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتا
تھا جب معین خود ہی ان سے مِل گیا تھا تو میں نے
شاہ جی کے کردار پر کوئی توجہ نہیں دی انھیں
اپنی قبر میں جانا ہے اور مجھے اپنی میں ــــ لیکن
یار اس جھوٹے پیر نے اپنی منافقت کمینگی اور
عداوت کی حد کر دی . . . " میں نے میز پر رکھی
بوتل سے اس کے گلاس میں شراب انڈیلنا
چاہی تو اس نے اپنا ہاتھ گلاس کے اوپر رکھتے
ہوئے ــــ دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی
"نہیں یار میرے لیے اب اور نہ ڈالنا۔" اس نے
کہا۔ میں نے اپنا گلاس بھرا۔ "کیا کہیں جانا ہے
یا کسی اور کا انتظار ہے ؟" میں نے اکبر کی آنکھوں
میں قدرے بے چینی سی دیکھتے ہوئے پوچھا اور
بوتل سے باقی ماندہ شراب اس کے گلاس میں
انڈیل دی اور خالی بوتل میز کے نیچے رکھ دی۔
"جانا تو کہیں نہیں ہاں کسی نے آنے کا وعدہ
کیا تھا۔" اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے اپنا
گلاس اٹھایا اور پینے لگا۔ اب اس کے چہرے
پر ایک خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ "ہاں تو تم شاہ جی
کے بارے میں بتا رہے تھے۔" میں بولا۔ "اچھا
بھیا! اس سے میری علیک سلیک ہی نہیں۔"
"شیطان کے اس گرو، شاہ نے مجھے تنگ
کرنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے نہیں آزمائے
ــــ میں اپنے لوگوں کی بے رُخی اور اس شاہ کے
کہنے میں آکر ان کی طرف سے اپنے پر خواہ مخواہ
کی الزام تراشیوں کے باوجود ان پر اپنے گھر
کے دروازے ہمیشہ کھُلے رکھتا تھا ــــ کوئی خط
لکھوانے پڑھوانے آجاتا تو کوئی ٹیکس کے کاغذات
پُر کرانے ــــ ایک شام جب میں کام سے واپس
لوٹا تو میں نے دیکھا کہ میری دوست شیلاٹے
کا مُنہ پھُولا ہوا تھا اور آنکھیں یوں سرخ تھیں
جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو میں کچھ گھبرا سا گیا
الٰہی خیر ہو! میں نے شیلاٹے سے پوچھا کیا ماجرا
کیا ہے؟ تو بس دریا کا بند ٹوٹ گیا۔
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور مُنہ سے کچھ
بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ اُن ہی دنوں میں وطن
جانے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید اس وجہ سے
وہ ایسا کر رہی ہے، میں نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں
میں لینا چاہا۔ تو اس نے ایک طرح سے مجھے پیچھے دھکیل
دیا ــــ تم تو جانتے ہو یار جب ڈینشوں کی
پھر کی گھوم جائے تو کیسے ہوتے ہیں۔ میں جہاں
تھا وہیں کھڑا رہا" ــــ "اکبر تم سے مجھے یہ
اُمید نہیں تھی کہ میرے ساتھ ایسا کرو گے۔"
شیلاٹے بولی اور میں سُنتے ہی چکرا سا گیا ــــ
"کیا کہہ رہی ہو یہ تم؟" میں نے بڑے تحمّل سے
کام لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھی قدرے سنبھل چکی تھی
اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے اور وہ ایک
کاغذی رومال سے اُنھیں خشک کرنے کی
کوشش کر رہی تھی۔ "تم پاکستان شادی کرنے
جا رہے ہو؟" وہ بولی۔ اس کے لہجے میں غصّے کی
کاٹ زیادہ تھی۔
"یہ سراسر جھوٹ ہے!" میں نے اُسی
تحمّل کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا ــــ
"تمھیں کس نے بتایا؟"
"وہ تمہارا مقدس فرشتہ! آج وہ تم سے
ملنے یہاں آیا تھا تم گھر پر نہیں تھے میں نے اُسے
اندر بُلا کر چائے پلائی وہ کوئی چیز تمھارے
ہاتھ پاکستان بھیجنا چاہتا تھا ــــ اس نے
مجھے بتایا کہ تم پاکستان صرف اور صرف شادی
کرنے جا رہے ہو ــــ" وہ ابھی تک ہچکیاں
لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے سُرخ انگارے
اُبل رہے تھے۔" اکبر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے
ہوئے کہا۔ میں ابھی تک اپنے گلاس سے شراب
کی چُسکیاں لے رہا تھا اور اس کی باتوں کے
دوران "ہوں" "ہاں" کہہ کر اپنی توجہ کا اظہار بھی
کر رہا تھا ــــ ٹیپ ریکارڈ میں چلتی ہوئی
ٹیپ بجانے کب کی ختم ہو کر رُک گئی تھی
"بات میری سمجھ میں آگئی تھی یہ شاہ جی کی
ہی ایک اور مکروہ کرتوت تھی۔ ان ہی کرتوتوں
کی وجہ سے میں نے ان کا نام "مقدس فرشتہ" رکھ
چھوڑا تھا۔ میں نے شیلاٹے کو بہت سمجھایا اور
دلاسہ دیتے ہوئے تسلّی رکھنے کو کہا کہ میں شادی
کرنے پاکستان نہیں جا رہا ہوں اور یہ کہ میں
شاہ جی سے پوچھتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟
شیلاٹے کے سر پر نہ معلوم وہ کون سا ٹونہ کر گیا
تھا کہ میری بات کا اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
وہ اٹھی اور اپنا اوورکوٹ لے کر چل دی، شام
کا وقت تھا میں سمجھا گھوم کر واپس آجائیگی تو دِل
کا غبار چھٹ جائے گا۔ میں نے روکنا مناسب
نہ سمجھا ــــ یہ میری غلطی تھی۔ وہ رات گئے واپس
لوٹی تو نشے میں دُھت تھی۔ میں ابھی تک سویا نہیں
تھا۔ اور یہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں

نے پوچھا کہ وہ کہاں تھی تو وہ مجھ پر برس پڑی
"جھوٹے، مکار تم مجھے دھوکہ دیتے رہے ہو،
بینک سے سود پر قرض لے کر پیسے گھر بھجواتے
رہے ہو اور اب شادی کرنے جا رہے ہو ____
مجھے تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا ہے۔" وہ غصے
سے کانپ رہی تھی۔ میں اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا
رہا۔ اور اپنی صفائی میں اس کی قسمیں کھاتا رہا
لیکن بے سود ____! دراصل وہ گھر سے نکل
کر ایک بار میں چلی گئی تھی جہاں اُسے شاہ جی کے
ہی چند مرید مل گئے جو بیٹھے شراب پی رہے
تھے۔ اُس نے ان سے پوچھا کہ کیا میں شادی کرنے
پاکستان جا رہا ہوں کیوں کہ شاہ جی ہی کہتے ہیں
شاہ کے ان شرابی مریدوں نے نہ صرف شاہ
کی بات کی تصدیق کر دی بلکہ ان کمینوں نے
شیلائے کو میری نام نہاد شادی اور مفروضہ
بیوی کی ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ اُسے یقین
ہو گیا کہ میں ہی جھوٹا ہوں۔ بس صفدر یار وہ پہلی
رات تھی جب ہم دونوں الگ الگ سوئے وہ بستر
پر اور میں صوفے پر لیکن نیند کہاں تھی ____
کیا بتاؤں تمہیں یار اس شاہ نے کیا کیا بیج نہیں
بوئے ____ مت پوچھو! وہ دن اور آج کا
دن میں اور شیلائے اکٹھے نہیں ہو پائے۔" اکبر
نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنی کلائی کی
گھڑی پر وقت دیکھا اور اُٹھنے کے سے انداز میں
پہلو بدلتا ہوا بولا ____ "کہو تو کافی یا چائے بناؤں
بوتل تو خالی ہو گئی ہے ____ تمہاری
گھڑی پر کیا وقت ہوا ہے؟" اس نے یوں پوچھا
جیسے اسے اپنی گھڑی یا دیوار پر لگے ہوئے کلاک
کے وقت پر یقین نہیں تھا۔
"ارے آٹھ بجنے والے ہیں۔" میں نے اپنی
گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا ____ "یار اکبر
مجھے اب چلنا چاہیے، تمہاری باقی کہانی پھر کبھی سنوں
گا ____ مجھے بڑا دکھ ہوا ہے یار ____ لیکن ____"
اب میں ایک طرح سے چلنے کے لیے ____
کھڑا ہو گیا تھا۔
"نہیں یار کچھ تو اور بیٹھو ____ دراصل
ساڑھے آٹھ بجے "ماریانا" کو آنا ہے میرے ساتھ
ہوٹل میں کام کرتی ہے، ضد کر رہی تھی کہ میرے
ہاں پاکستانی کھانا کھائے گی۔ میں نے تو اُسے کہا
تھا آج نہ آئے لیکن وہ بھی آج فارغ تھی
یار میرا دل چاہتا ہے تم سے اور باتیں ہوتیں۔ تم
نے تو کچھ اپنے بارے میں بتایا ہی نہیں۔" وہ میز
سے اپنا خالی گلاس اٹھاتے ہوئے میز کے نیچے
پڑی شراب کی خالی بوتل اٹھانے کو جھکا اور
پھر باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ صفدر یار
ان اپنوں سے بچ کر رہنا ____ کبھی منہ نہ
لگانا ان مقدس فرشتوں کو۔" باورچی خانے سے
اس کی آواز آ رہی تھی ____ میں نے اپنا
گلاس اٹھا کر شراب کا آخری لمبا گھونٹ لیا۔
اور خالی گلاس کو میز پر واپس رکھتے ہوئے
ایک طرح سے انگڑائی لی ____ اکبر ڈرائنگ
روم میں واپس آ چکا تھا ____ "کیا واقعی
چل دیے؟" اُس نے پوچھا۔ "یار افسوس ہے
کھانا بھی اکٹھا نہیں ہو سکا بہرحال ____!"
وہ بولا اور اپنی بات جاری رکھی ____ "یار
اچھا وقت گزر گیا ہے۔"
____ میں نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف
دیکھا اکبر کی نگاہیں بھی وہیں لگی ہوئی تھیں۔"
میرے خیال میں ماریانا اب آتی ہی ہوگی یار
یہ ڈینش وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں ____"
اس نے ایک طرح سے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی
بات ادھوری چھوڑ دی ____ "کیا اس نے
محض اس لیے تو اپنے ہاں نہیں بلایا تھا کہ معین
کے بارے میں جان سکے کہ اُس نے مجھے اس کے
متعلق کیا کیا بتایا ہے؟" میرے ذہن میں نجانے
اچانک کیسے یہ خیال اُبھرا ____ "نہیں! نہیں
اس نے تو معین کی بجائے شاہ جی کو زیادہ رگڑا ہے۔"
اپنی اس سوچ پر میں خود ہی مسکرا پڑا اور پھر
اس سے مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا
دیا۔ "یار کبھی میرے ہاں بھی آنا ____" میں نے
دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا ____
"کیوں نہیں، مگر یار تم جانتے ہی ہو کہ وقت
ہی کہاں ملتا ہے۔" وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔
____ میں نے اپنے جوتے پہنے اور اس نے آگے بڑھ
کر دروازہ کھول دیا ____ "خدا حافظ" کہہ کر
میں دروازے سے باہر نکلا اور جلدی سے بس
اسٹاپ کی طرف چل دیا میری بس آنے میں ابھی کچھ
منٹ باقی تھے میرے ذہن میں طرح طرح کے عجیب
غریب سوالات اُبھر رہے تھے۔ "یہ اکبر اور معین
کیسے لوگ ہیں، ہم بھی پاکستانی یا... محض راکھیاں
والے جاٹ، چوہدری اور غریب غربا جو اب یہاں
آ کر کچھ کمانے لگے ہیں؟ اور... اور وہ مقدس
فرشتہ؟" مجھے اپنے سامنے سے آنے والی میری بس
دکھائی دینے لگی۔ میں نے ایک جھٹکے سے ان سوالات
کو اپنی کھوپڑی سے نکالا اور بس اسٹاپ کی طرف
تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ ____ نہیں میں تو ایک
طرح سے بھاگ رہا تھا۔ میرے ساتھ ڈاکخانے میں
کام کرنے والی ہیڈ کلرک سوزینا نے اپنی شام کی ڈیوٹی
ختم کرنے کے بعد آج دس بجے کے قریب میرے
ہاں آنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اسے پچھلے ہفتے بھی شکایت
تھی کہ ہم ویڈیو پر پوری فلم دیکھے بغیر جلدی ہی بستر میں
چلے گئے تھے۔ میں بس میں سوار ہو کر جونہی ایک خالی
سیٹ پر بیٹھا تو مجھے یاد آیا کہ میں جلدی میں اپنا ڈاکخانے
والا بیگ تو اکبر کے ہاں ہی بھول آیا تھا۔ ►▷

یہ آنے والا زمانہ ہمیں بتائے گا
وہ گھر بنائے گا اپنا کہ گھر بسائے گا

پھر اس کے بعد اُجالے خریدنے ہوں گے
ذرا سی دیر میں سورج تو ڈوب جائے گا

نہیں ہے کوئی مروّت نہیں ہے پانی میں
جو ہاتھ پاؤں نہ مارے گا ڈوب جائے گا

سُنائی دیتی نہیں گھر کے شور میں دستک
میں جانتا ہوں جو آئے گا لوٹ جائے گا

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اِن اڑانوں میں
وہ اپنے گاؤں کی مٹّی کو بھول جائے گا

ہزاروں روگ تو پالے ہوئے ہو تم نظمی
بچانے والا کہاں تک تمھیں بچائے گا

اختر نظمی

صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کملا راجا گرلز کالج، گوالیار (ایم.پی)

عزیز اندوری

وہ جب کبھی مجھے عزمِ بلال دیتا ہے
مری صداؤں کو صدیوں میں ڈھال دیتا ہے

اُجالتا ہے اگر دل، تو مثلِ آئینہ
اُجاڑتا ہے تو گردِ ملال دیتا ہے

یقیں کرو کہ کم آگاہ کو نصیب نہیں
وہ اِک خلوص جو شہرِ خیال دیتا ہے

زمیں پہ چاند اُبھرتا ہے کس طرح لوگو!
وہ رُخ سے پردہ اُٹھا کر مثال دیتا ہے

ہمارے ظرف کی پہچان کے لیے اکثر
وہ اپنے قد کے برابر سوال دیتا ہے

۱۷۷، آشیانہ، جونا رسالہ، گلی نمبر ۱، اندور

اے روحِ شہرِ طلسمات! دے صدا مجھ کو
میں مُڑ کے دیکھوں تو پتّھر کا بُت بنا مجھ کو

جرس کی صوت وصدا ہے نہ کارواں کا غبار
کہاں یہ چھوڑ گیا میرا قافلہ مجھ کو

میں ایک عمر سے قیدِ طلسمِ خواب میں ہوں
ضیائے صبحِ حقیقت کبھی جگا مجھ کو

کسی مقام پہ کاندھے سے میرا بوجھ اُتار
چلی ہے لے کے کہاں عمرِ خستہ پا مجھ کو

نہ جانے چھین لیا کیسے نا امیدی نے
بہت عزیز تھا یادوں کا سلسلہ مجھ کو

ہیرانند سوز

7A/271، فریدآباد ۱۲۱۰۰۶

سیلِ سفر درمیاں ہے

(پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ایک مصاحبہ)

س: آپ اکثر باہر تشریف لے جاتے رہتے ہیں۔ اس بار بھی آپ چار مہینوں کے بعد لوٹے ہیں آپ کا سفر چیکوسلواکیہ کس سلسلے میں تھا؟

ج: اصلاً میں سفر سے گھبراتا ہوں لیکن بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے بچا نہیں جاسکتا۔ ۱۹۸۸ء میں تو میں یہیں تھا بس سرینگر جاکر اعتکاف میں بیٹھ گیا۔ آج کے زمانے میں یکسوئی محال ہے بہر حال، فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے، کچھ دیر کو بھی میسر آجائے تو اس کو خوش بختی سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری صاحب نے کشمیر یونیورسٹی میں لیکچر رکھے تھے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوتے رہے۔ ساختیات والی کتاب کے کچھ ابواب جو "شعر و حکمت" "اوراق" "ماہ نو" "فکر و نظر" "صریر" "شب خون" "کتاب نما" "آجکل" اور "جواز" میں شائع ہوئے ہیں وہیں لکھے گئے۔ اس سلسلے کا کچھ کام باقی تھا جب چیکوسلواکیہ سے ایکسچینج پروفیسرشپ کی دعوت ملی تو میں نے موقعہ غنیمت جانا کیونکہ ساختیات کا اولین کام پراگ ہی میں ہوا تھا اور ساختیات کے ارتقا میں پراگ کی بڑی اہمیت ہے۔ آج بھی وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس اندازِ فکر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

س: چیکوسلواکیہ کو کسی زمانے میں یورپ کا قلب کہا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جب جواہر لال نہرو ہندستان کی تحریکِ آزادی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے یوروپ کا دورہ کررہے تھے تو بطورِ خاص چیکوسلواکیہ بھی گئے تھے۔ فکر و ادب کی دنیا میں بھی پراگ کا ذکر اکثر آتا ہے۔ پراگ ادیبوں، شاعروں، مصوروں، فن کاروں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ آپ نے آج پراگ کو کیسا پایا؟

ج: ان چالیس پینتالیس برسوں میں چیکوسلواکیہ کو خاصا دھکا لگا ہے اور وہ ملک جو صنعتی اعتبار سے جرمنی کا ہم پلہ تھا، اس زمانے میں کچھ پچھڑ سا گیا ہے لیکن فکر و دانش کی صدیوں سے چلی آرہی روایت آج بھی وہاں کی فضاؤں میں ہے آپ کو تو معلوم ہے پراگ کافکا کا شہر ہے۔ پراگ میلان کندیرا کا شہر بھی ہے، ای وان کلیما کا بھی اور یارد سلاؤ سیفرٹ، واچلو ہاول اور جوزف سکوو ریچکی کا بھی۔ ان کا کام اور جدوجہد گہری معنویت رکھتی ہے۔

س: کیا اس سے پہلے بھی آپ پراگ گئے ہیں یا یہ پہلا سفر تھا؟

ج: پراگ میں جاچکا ہوں بیس برس پہلے ۱۹۷۰ء میں۔ وسکانسن یونیورسٹی میں اپنا دوسرا ٹرم ختم کرنے کے بعد پراگ جانا ہوا تھا اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر یان ماریک کی دعوت پر۔ وہاں کے رسالہ "نیو اورینٹ" میں میرے مضامین شائع ہوچکے تھے۔ اس سفر میں میں

پراگ: شہرِ خوباں

س: اس زمانے کے پراگ اور آج کے پراگ میں آپ نے کیا فرق دیکھا؟

ج: اب تو چیکوسلواکیہ کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کی ایک نئی لہر ہے جس سے بچے، بوڑھے، نوجوان عورتیں مرد سب سرشار نظر آتے تھے۔ عجیب گہما گہمی اور کیف و مستی کا عالم تھا۔ سیاسی تبدیلی کو پراگ والوں نے دوسری بہار کا نام دیا ہے۔ گویا بہار پر بہار ٹوٹی پڑتی تھی۔ پراگ یوں بھی خوبصورت شہر ہے۔ ونسس لاس اسکوائر، نیشنل میوزیم تک، گولڈن آرچ اور اولڈ ٹاؤن اسکوائر اور کاسل کا تو کہنا ہی کیا۔ جگہ جگہ تاریخی عمارتوں کی سربفلک برجیاں اور گنبد، گہرے فیروزی رنگ اور سنہری نقش و نگار سے جھلملاتے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ والتوا کے سبک خرام پانیوں پر چھوٹے بڑے تاریخی پل مجسمے ہی مجسمے، آرٹ اور فن کی نمائشیں، سرمئی پتھروں کی چمکتی ہوئی مسطح سڑکیں، سیاحوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ، دھوپ کی ہلکی کرنوں میں جسم کھولے پری زاد، چاہے اور چاہے جانے کی آرزوؤں سے پھولوں کی طرح کھلے چہرے، بدن بہ بدن، دست بدست، برق رفتار زمین دوز گاڑیاں، فٹ پاتھوں پر جرمنی، ہنگری، پوسطائی، فرانسیسی اور طرح طرح کے یورپی چہروں کی ریل پیل، زمرزلینا (آئس کریم) کھاتے اور اٹکھیل کرتے ہوئے بچوں کے غول کے غول، جگہ جگہ پھول

مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

داخوں سفارداوں اور ارٹ کی استیابیے وتو
کے گول کیونسک' نیشنل تھیٹر' میجک لنٹرنا
اور دوسرے ڈراموں کے اشتہاروں کے
ساتھ ساتھ صدر ہاول کی مسکراتی ہوئی شبیہہ
کہیں کہیں اسٹالن کا مرجھایا ہوا چہرہ' سوک
فورم کے قد آدم اشتہارات' انتخابات کا شور و
غوغا' باجے تاشے' انسانی آزادی اور جمہوریت
کے شکستہ آئینوں کو جوڑنے کی حوصلہ مندانہ
کوششیں' غرض ایک ایسی گہما گہمی تھی کہ
دیکھتے بنتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ چھ سات
ماہ کی برف باری اور یخ بستگی کے بعد جب
دھرتی سینہ کھولتی ہے اور خورشید کی شعاعیں
اس کے بدن کو چومتی ہیں تو دھرتی کا دامن
رنگارنگ پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ یوں
معلوم ہوتا ہے گویا کائنات کا سارا حسن ایک
ساتھ پھٹ پڑا ہو۔ یہی معاملہ انسان کی آزادی
کی تڑپ کا ہے۔ اسے لاکھ دبایئے' یہ جذبہ
جبر کے ہزاروں حیلوں کے باوجود ظلم و استبداد
کا سینہ چیر کر کلی کی طرح سر اٹھا ہی لیتا ہے۔

۱۹۶۸ء میں جب میں وہاں تھا مجھے یاد ہے ہم
نیشنل کاسل کا عجائب گھر دیکھنے کے لیے پراگ
کی سب سے اونچی پہاڑی پر تھے۔ اور نیچے
دریا کے کنارے سونے کے کلس جگمگا رہے
تھے اور چارلس کے بُت منجمد پھولوں کے خوشے
لٹکائے دریا کے پانیوں میں اپنی اداس شبیہیں
دیکھ رہے تھے تو کاسل کے وسیع آنگن میں
مارچ کرتے ہوتے فوجی بوٹوں کی گونج نے
سب کو چونکا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ
نے انگڑائی لینے کی کوشش کی تھی کہ اسے کچل دیا
گیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی دار و گیر کے بعد
غالب نے ایک خط میں ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا۔

"یہاں کا حال تن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور
ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ورنہ قصہ مختصر
قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔ فوجی
بوٹوں کی زپ زپ' ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ اور
سراسیمگی کے اس ماحول میں یان ماریک اور
ان کی بیگم ساریلا بھی کہہ سکیں تو بس اتنا "آپ تو
جانتے ہیں بڑا بھائی مارچ کر رہا ہے!

دامانِ باغباں اور کفِ گلفروش

س : ادھر چیکوسلواکیہ میں تو سیاسی تبدیلی

جمہوریت اور آزادی کی نیلم پری جس کے پوسٹر پراگ میں
ہر جگہ لگے ہوئے تھے

پُرامن ہوئی ہے۔ رومانیہ والی خوں ریزی تو
شاید وہاں نہیں ہوئی۔ کیا سیاسی تبدیلی کے
دوران آپ وہاں تھے ؟

ج : سیاسی تبدیلی تو چھ سات ماہ پہلے
نومبر میں ہو گئی تھی۔ چیک لوگوں نے اسے مخملیں
انقلاب کا نام دیا ہے۔ کیونکہ تبدیلی خوں ریزی
سے نہیں ہوئی خود اسمبلی نے کیئرٹیکر حکومت
بنا دی۔ عام انتخابات البتہ میرے سامنے آگئے
ایسا منظر میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اگرچہ متعدد
پارٹیوں میں معرکہ آرائی تھی' بعض پارٹیاں مذہبی
بھی تھیں' پرانے کمیونسٹ نظام کے حق میں اور
بعض اس سے بیزار' لیکن مجال کیا کہ کہیں کوئی
ہنگامہ آرائی یا بدمزگی پیدا ہوئی ہو۔ ونسس
لاس اسکوائر پر' ٹاؤن ہال اور دوسری قومی
جگہوں پر' خاص خاص بازاروں' چوکوں'
چوراستوں' یونیورسٹی' قومی تھیٹر' چھوٹی بڑی
گلیوں میں جگہ جگہ بوتھ بنے ہوئے تھے اشتہار
بٹ رہے تھے' جھنڈیاں' پوسٹر' بینر آویزاں
تھے۔ امیدواروں کی قد آدم شبیہیں لگی ہوئی
تھیں۔ کارکن لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ بینڈ بج
رہا تھا اور لوگ اپنے اپنے امیدواروں کا گن گان
کرتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھی لڑکے لڑکیوں
کے غول کے غول آتے' نیلی اسکرٹ اور پھولدار
لیس سے سجے سفید لباس پہنے جوان علاقوں کا
خاص لباس ہے۔ یہ لوگ بینڈ کے گرد دائرہ
بناتے' دُھن بجنا شروع ہوتی' دست افشاں
اور پاکوباں سب مل کر رقص کرتے اور قومی
گانے گاتے۔ کارکن اپنے اپنے امیدواروں کے
بیجز اور طغرے ڈاٹے آنے والی جمہوریت کی چمک
آنکھوں میں سجائے سرشار نظر آتے تھے۔ سوک فورم
جس نے انسانی حقوق کی بحالی اور آزادی کے نام
پر الیکشن جیتا' کئی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کا مجموعہ
ہے جو سب شخصی آزادی اور جمہوریت کے پروگرام
پر متفق ہیں ان میں اکثریت پرانے سوشلسٹوں
کی ہے جنھوں نے روسی تسلط کے خلاف بغاوت
کی ہے۔ ایسے لوگوں میں بہت بڑی تعداد دانشوروں
پروفیسروں' شاعروں' آرٹسٹوں اور ادیبوں
کی ہے۔ صدر ہاول خود ایک ڈرامہ نگار ہیں۔

جن کو نہایت احترام اور محبت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جیل میں گزرا۔ جہاں ان سے ٹرکوں میں بھاری سامان لادنے والے مزدور کا کام لیا جاتا تھا۔ نومبر میں سیاسی تبدیلی سے پہلے بڑے پیمانے پر طلبہ کی شورش ہوئی۔ جس میں عوام بھی شریک ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے اس تحریک نے اتنی شدت اختیار کی کہ حکام کو جھکنا پڑا۔ اور قومی اسمبلی نے کثرتِ رائے سے تبدیلی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور نگراں حکومت بنا کر اس کو حکم دیا کہ چھ ماہ کے اندر ملک میں عام انتخابات کرا کے نئی سرکار بنائی جائے جو نئے آئین کو نافذ کر سکتی ہے نگراں حکومت کی ذمے داری چیکوسلواکیہ کی محبوب شخصیت واچلو ہاول کو سونپی گئی جو بنیادی طور پر ایک ادیب، دانشور اور ڈرامہ نویس ہیں اور جن کے ڈرامے THE GARDEN PARTY اور AUD-IENCE کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور کئی ملکوں میں دکھائے جا چکے ہیں۔ ان کے جیل سے لکھے ہوئے خطوط بھی اپنے اظہار و اسلوب کے لیے مشہور ہیں۔

ادبی منظر نامہ: زندہ ہوجائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے۔

س: کیا پراگ کی ادبی فضا میں بھی کوئی تبدیلی آئی ہے۔ وہاں کی ادبی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟ زبان تو چیک ہوگی یا انگریزی اور دوسری زبانوں کا چلن بھی ہے؟

انگریزی سے زیادہ جرمن اور فرانسیسی کا چلن ہے، لیکن عام استعمال کی زبان چیک ہے۔ چیک ثقافت کا سب سے نمایاں پہلو ادب اور آرٹ ہے، ڈرامہ، تھیٹر، فلم یوں تو سب پر توجہ ہے۔ لیکن غیر معمولی بات یہ ہے کہ ادب کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، اور لکھنے پڑھنے والوں کا ہر سطح پر احترام کیا جاتا ہے۔ روسی قبضے کے بعد جب سٹالن ازم کا دور شروع ہوا تو سب سے پہلے اسی طبقے کی کمر توڑی گئی اور سب سے زیادہ دباؤ لکھنے پڑھنے والوں پر ڈالا گیا۔ موجودہ سیاسی تبدیلی اور جمہوریت کی توبحالی بہرحال دوسری بہار ہے۔ ہر طرف کتابوں کی ریل پیل ہے جگہ جگہ کتابوں کی دکانیں ہیں جو لوگوں سے لبالب نظر آتی ہیں۔ سڑکوں پر پگڈنڈیوں پر چارلس برج پر ہر طرف کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ کتاب کو چیک میں KNIHA کہتے ہیں، جگہ جگہ KNIHKUP-ECTVI کے بورڈ چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور "تباک" TABAK یعنی سگار تمباکو کی دکانوں پر بھی تمباکو کو سگریٹ سے زیادہ کتابیں بکتی ہیں۔ اخباروں، رسالوں میگزینوں NOVINY کے اسٹینڈ الگ ہیں سڑکوں کے کنارے کیوسک بنے ہوئے ہیں اخبار فروشوں کے اور پھول والوں کے جنھیں KVETINARSTVI کہتے ہیں۔

چیک لوگوں کو مطالعے کے معاملے میں 'حریص' کہا جاتا ہے۔ اوسطاً ہر شخص مہینے میں چار پانچ کتابیں ضرور پڑھتا ہے۔ اردو والوں کی طرح مانگے تانگے کی نہیں، باقاعدہ خرید کر پڑھتا ہے۔ ایسے سماج میں ادب کا جو رول ہو سکتا ہے آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ادبی روایت چیکوسلواکیہ کی مرکزی کلچرل روایت ہے۔ موجودہ صدر واس تو ہاول ڈرامہ نویس ہے جو آزادی کی تحریک میں بنفس نفیس شریک رہا ہے۔ تبدیلی تو گلاسنوسٹ ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ اب تو ہر طرف تازہ ہوا چل رہی ہے۔ ہزاروں کتابیں جو چالیس سالہ زمانۂ کنٹرول میں ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔ ان سے پابندی ہٹالی گئی ہے۔ ایسی کتابیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں۔ اور لوگ ان کو خریدنے کے لیے باقاعدہ لائن میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔

چیک سوسائٹی میں ادب کی ثقافتی مرکزیت ہی کا فیضان ہے کہ اس چھوٹے سے ملک نے کیسے کیسے جدید ادیب پیدا کیے ہیں: کافکا، میلان کنڈیرا، واچلو ہاول، ہرابل، ایوان کلیما، جروسلاو سیفرٹ، جوزف سکوریچکی اور کتنے ہی دوسرے چالیس سالہ غلبے کے زمانے میں مابعد کافکا ادیب نہ صرف استبداد کا شکار ہوئے اور ان پر ظلم ڈھائے گئے، اکثر اپنے وطن میں بے وطن ہوگئے یا پھر جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے جس کی سب سے نمایاں مثال میلان کنڈیرا ہے خوف اور دہشت کے اس زمانے میں بھی لکھنے والے برابر لکھتے رہے اور چیک دانشوری کی روایت کو زندہ رکھنے کا ہر ممکن جتن کرتے رہے۔ اگرچہ ٹراٹسکی کے لفظوں میں یہ نظام ایسی مشین تھا جو غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتی تھی: 'A MACHINE FOR TAKING INFALLIBLE DECISIONS' - تاہم اسی نے ادب سے اس کی وہ آزادی چھین لی جو نہ ہو تو ادب کا سانس گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جبر و استبداد کے اس دور میں ادیبوں نے اپنا جہاد کس طرح جاری رکھا۔ ہاول جو اس وقت چیکوسلواکیہ کا صدر ہے اپنے حریت پسند ڈراموں کی وجہ سے مسلسل جیل میں رہا اور اس کا کام بیئر کے بھاری بیرلوں کو ٹرکوں پر لادنا تھا۔ کلیما ایک ہسپتال میں مریضوں کا میلا اٹھانے پر مامور تھا۔ ہولب جو ممتاز شاعر ہے اس کو بھی ایک ہسپتال میں

جھونک دیا گیا۔ پروجاز کو واجو دورِ استبداد کی نسل سے تعلق رکھتی ہے اسے فرش صاف کرنے پر لگایا گیا' کندیرا اور سکوورتیکی چونکہ ان حالات کی تاب نہ لا سکے' پراگ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ٹولپول ایک ریستوراں میں ویٹر تھا۔ کافکا کے 'دی ٹرائیل' پر درس دیتا تھا' اسی طرح ارسطویات کا ماہر پابیچکا گیارہ برس تک چوکیداری کرتا رہا۔ یہی حال جیری گروسا کا تھا۔ وٹگنسٹائن پر جس کی کتاب شاہکار کا درجہ رکھتی ہے' اسے مدتوں کوئلے کی کان میں کام کرنا پڑا لیکن شدائد اور پابندیوں کے باوجود ان میں سے کسی کا بھی جذبۂ حرّیت ٹھنڈا نہیں پڑا اور خفیہ طریقے پر زیرِ زمین' نکلنے والے رسالوں بالخصوص "سنٹرل یورپا" میں یہ لوگ برابر لکھتے رہے تاکہ دوسروں کو بتا سکیں کہ اندرونِ ملک 'اجتماعیت' کے نام پر آزادی کا کس طرح گلا گھونٹا جا رہا ہے' سماجی حقیقت نگاری' کے تصوّر کے تحت غیر ملکی غلبے کے ڈھنڈورچی پیدا کیے گئے' انھیں سرکاری نظام نے "انسانی روح کے انجینیئر 'ENGINEERS OF HUMAN SOUL' قرار دیا۔ حقیقتاً یہ ادب کے نام پر P.R کا کام تھا جو آج سارے کا سارا کوڑا ہو چکا ہے۔ یہ چیک ادبی روایت کی ثقافتی جڑوں کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ زیادہ تر ادیب نہ تو ظلم کے آگے جھکے نہ خاموش کیے جا سکے اور نہ انھوں نے کوئی سمجھوتہ کیا اور اس دوران برابر ایسا ادب تخلیق کرتے رہے جو بین السطور آزادی اور وطنیت کا پیغام دیتا رہا۔ وہ ادب جس میں معنی سے پرے دوسرے معنی ہوتے ہیں اور جابر سے جابر حکمراں بھی جس کی گرفت نہیں کر سکتا۔ آج میلان کندیرا کی THE JOKE, THE BOOK OF LAUGHTER AND FORGETTING سکوورتیکی کی 'انجینیئر آف ہیومن سولز'، ایوان کلیما کی MY LOVE AND GARBAGE اور FIRST LOVES اور ان کے علاوہ لاطینی امریکی ناول نگار مارکیوز ONE HUNDRED YEARS OF SOLITUDE کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو رہی ہیں اور گھر گھر پڑھی جا رہی ہیں۔ عام کتاب دس ہزار شائع ہوتی

میلان کندیرا کی کتابیں جیکوسلواکیہ میں ممنوع تھیں اب سیاسی تبدیلی کے بعد یہ دھڑا دھڑ فروخت ہو رہی ہیں

ہے لیکن کندیرا' کلیما' مارکیوز جیسے مصنفین کی کتابوں کے ایڈیشن ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ کاپیوں سے کم نہیں نکلتے اور آبادی؟ چیک بولنے والے 10 ملین (ایک کروڑ سے بھی کم) اور سلوواک بولنے والے پانچ ملین (یعنی نصف کروڑ) اُردو میں سال بھر میں ایک ہزار نئی کتابیں بھی نہیں چھپتیں جبکہ چیک جیسی چھوٹی زبان اور چھوٹے ملک میں تقریباً تین ہزار نئی کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔

کنارِ دریا: روانیِ اُردو اور اورینٹل انسٹی ٹیوٹ

س: کیا پراگ میں اُردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے۔ ہندستان کی دوسری زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ بھی بتائیں کہ کیا آپ کا کام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھا؟

ج: میرا کام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سے متعلق بھی تھا اور چارلس یونیورسٹی کی فیکلٹی آف فلاسفی سے بھی جس میں علاوہ دوسرے علوم انسانیہ کے تمل' بنگالی' ہندی' اردو زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں' جبکہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں باقاعدہ تعلیم کے شعبے نہیں صرف ریسرچ کا کام ہوتا ہے اور جو بھی پروفیسر اور فیلو وہاں ملازم ہیں اپنے اپنے ریسرچ کے کام میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی دلچسپی کے موضوعات پر مقالے اور کتابیں شائع کرتے ہیں۔ یہاں پچاس سے زیادہ اسکالر کام کرتے ہیں جن میں اُردو کے ڈاکٹر یان ماریک بھی ہیں جو کئی مرتبہ ہندستان آ چکے ہیں۔ فارسی اور اُردو پر ان کی اچھی نظر ہے انھوں نے اُردو کے کئی کلاسک شاہکاروں کا چیک زبان میں ترجمہ کیا ہے اور اُردو ادب کی تاریخ بھی وہاں کے طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ اس کے علاوہ غالب' اقبال' میرامن' پریم چند' فیض احمد فیض کے تراجم بھی کیے ہیں۔ جدید اردو شاعری اور جدید اُردو افسانے سے بھی یان ماریک نے وہاں کے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اور چارلس یونیورسٹی دونوں جگہ میرے لیکچر ہوئے۔ چارلس یونیورسٹی میں ہندستانی زبانوں اور افریقی زبانوں کا شعبہ ساتھ ساتھ ہے۔ سنسکرت اور تمل کے

عالم پروفیسر واچیک اس کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر سمائیکل ہندی پڑھاتے ہیں۔ اُردو کے لیے ڈاکٹر یان ماریک یہاں مدد کرتے ہیں۔ میرا ایک پبلک لیکچر مشترک ہندستانی کلچر پر ہوا جس کی صدارت اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر میولر نے کی۔ ایک سمپوزیم علامہ اقبال کی فکر اور شاعری پر ہوا جس میں میں نے نقدِ اقبال سے متعلق مختلف تنقیدی رویّوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ اقبال کے پرستار کس طرح شعر اقبال کی ایک جہت کو لے لیتے ہیں اور ساخت کو نظرانداز کرتے ہیں، اور اس سے کیا نتائج مرتّب ہو رہے ہیں نقدِ اقبال کے سلسلے میں اقبال کی پوری تخلیقی شخصیت کی وحدت کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سمپوزیم میں برمنگھم یونیورسٹی کے ڈاکٹر سعید اختر درّانی نے یوروپ میں اقبال کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا اور بتایا کہ انھوں نے حیاتِ اقبال کے کن گوشوں کی دریافت میں مدد کی ہے۔ برسلز یونیورسٹی میں اقبالیات کا یوروپی مرکز قائم ہوا ہے۔ برسلز سے آئے ہوئے پاکستانی سفارت کار جناب توحید احمد نے اس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر یان ماریک نے مباحث میں مرکزیت پیدا کی اور سامعین کے استفسارات کے جواب دیے۔ پراگ میں ہندستانی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، سواحیلی، سوڈانی، کُردی وغیرہ زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہاں ڈاکٹر ہروشنکا (ماہر میسوپوٹیمیہ) ڈاکٹر ہروبیک (ماہر اسلامیات) ڈاکٹر مینڈل (عربی مطالعات) ڈاکٹر بیچکا (برما مطالعات) ڈاکٹر مارکووا (ہندی، ہندستانی) ڈاکٹر کراسا (تاریخ ہند) ڈاکٹر میلی نووا (عبرانی مطالعات) اور بعض دوسرے ماہرین سے ملاقات رہی۔

پراگ و باختنیات و ساختیات

س: شروع میں آپ نے ساختیات کے بنیاد گزاروں کا ذکر کیا تھا اس سلسلے میں پراگ میں کن شخصیتوں سے آپ کی ملاقات ہوئی؟ کیا ساختیات کے بارے میں بھی وہاں کچھ کام ہوا ہے؟

ج: ساختیات سے متاثر ادبی تنقید کے اوّلین نقوش روسی ہئیت پسندوں کے یہاں ملتے ہیں جس کا زمانہ ۱۹۱۵ء سے ۳۳-۱۹۳۲ء تک کا ہے۔ اس زمانے میں اس تحریک کو دبا دیا گیا، لیکن اس کے بعض مصنّفین ماسکو سے پراگ آئے اور برسوں انھوں نے یہاں کام کیا اور پراگ اسکول آف لنگوئسٹکس کی بنیاد ڈالی۔ ان میں روس جیکب سن اور رینے ویلک خاص تھے جنھوں نے بعد میں بہت شہرت پائی۔ اوّلین روسی ہئیت پسندوں میں بورس آئخن بام، وکٹر شکلووسکی، بورس توماشیوسکی، یوری تینیانوف، میخائیل باختن اور مکاروسکی نے نہایت اہم کام کیا جسے اس زمانے میں نظرانداز کیا گیا۔ انھوں نے ادب کی ادبیت یا شعریت کی بحثیں اُٹھائیں اور اُن وسائل اور اطوار کے تعیّن کی اساسی سعی کی جن کی بدولت ادب ادب بنتا ہے۔ چھٹی ساتویں دہائی میں جب ساختیات نے زور پکڑا تو روسی ہئیت پسندوں کی بھی از سرِ نو بازیافت ہوئی اور ان کے کارناموں کو پہچانا گیا۔ اور ان کی بنیادی کتابیں فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ ہوئیں فکشن کی شعریات پر ان مصنّفین کا کام قابلِ قدر ہے اور بالعموم اس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ ان سے بہتر کام آج تک نہیں کیا گیا۔ روسی ہئیت پسندوں کی اہمیت اور ان کی خدمات کا تفصیلی ذکر میں نے اپنے مضمون 'روسی ہئیت پسندی' میں کیا ہے جو سہ ماہی اوراق (سرگودھا) کے خاص نمبر جون ۱۹۹۰ میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مضمون ساختیات اور پس ساختیات پر میری زیرِ تحریر کتاب کا ایک باب ہے۔ پراگ میں اوّلین ساختیاتی فکر کے بارے میں میری گفتگو جن لوگوں سے ہوئی ان میں ڈاکٹر میلان نشکا اب بھی انسٹی ٹیوٹ آف چیک لینگویج میں ہیں۔ پروفیسر ولادیمیر سکالک چا اور پروفیسر دالینش اب بھی سرگرم ہیں۔ لنگوسٹک سوسائٹی کی ماریہ تیہر نووا سے بھی ملاقات ہوئی۔ پروفیسر چروِلنکا چیک ادبیات کے پروفیسر ہیں، انھیں مکاروسکی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے پروفیسر پیٹر سگال کمپیوٹر اور طبیعیات کے ماہر ہیں۔ اور فیکلٹی ریاضی میں ہیں۔

قافلے اس راہ سے کم گزرے ہیں

س: آپ ہمیشہ نئی زمینوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔ ساختیات پر آپ کے نئے مضامین ہمارے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں نئے تصوّرات کے قائم ہونے میں وقت لگے گا۔ اس کا اچھا بُرا ابھی بعد میں طے ہوگا لیکن یہ ایک مجتہدانہ کوشش ہے۔ ان تحریروں سے اردو میں نئی بحثیں قائم ہو رہی ہیں ہندستان پاکستان دونوں جگہ آپ نے ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ ساختیات دوسرے ادبی نظریات سے کس اعتبار سے الگ ہے؟

ج : ساختیات ایک مشکل موضوع ہے۔

جس بیابانِ خطرناک سے اپنا ہے گزر
مصحفیؔ قافلے اس راہ سے کم گزرے ہیں

اسے سہل بنا کر چند لفظوں میں بیان کرنا اور بھی مشکل ہے۔ آپ کی فرمائش ہے تو سامنے کی دو تین باتیں عرض کرتا ہوں۔ ساختیاتی فکر کئی اعتبار سے ایک انقلابی موقف ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں اس نے فکرِ انسانی کے بہت سے شعبوں کو متاثر کیا ہے اس لیے کہ ساختیات صرف ادب کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانی کارکردگی کا مسئلہ ہے یعنی ذہنِ انسانی ادراک کیونکر کرتا ہے۔ چیزوں کی حقیقت کو کس طرح انگیز کرتا ہے اور تمام ذہنی سرگرمی کن بنیادوں پر قائم ہے۔ چونکہ ادب بھی ذہنی سرگرمی بلکہ خاص ذہنی سرگرمی ہے، اس لیے ادب ساختیاتی فکر کا خاص موضوع ہے۔ پہلی بات یہ کہ ساختیات اور پس ساختیات دونوں فلسفۂ لسان بالخصوص سوسئیر کی فکر سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی بصیرت نے انسان اور اشیا کے رشتے کی نوعیت ہی بدل دی، یعنی یہ کہ کائنات اشیا سے عبارت نہیں بلکہ اُن رشتوں سے عبارت ہے جن کی بدولت حقیقت ہمارے شعور میں قائم ہوتی ہے۔ یا حقیقت ہرگز وہ نہیں کہ جو دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ حقیقت صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ہمارا شعور حقیقت کو انگیز کرتا ہے یعنی حقیقت زبان کی رو سے زبان کے اندر اور زبان کے توسط سے قائم ہوتی ہے۔

اس سے باہر ساختیات کچھ بھی نہیں کے مباحث کا اطلاق ادب پر کیا جاتا ہے تو ان کے مضمرات بہت گہرے اور بسیط ہیں۔ اور ان کو سہل کر کے مختصراً پیش کرنا گویا ان کا خون کرنا ہے۔ ساخت کا تصور بھی تحرک آشنا یعنی DYNAMIC تصور ہے اس کی جو بھی تعریف کی جائے وہ اس کو محدود کر دے گی اور اس کا رد لازم آئے گا۔ اس لیے ساخت یا ساختیے کے تصور کو متعین کرنے کی کوششیں اصلاً غیر ساختیاتی ہیں اور سہل پسندی کا شکار ہیں۔ اسی لیے سر دست میری کوشش یہ ہے کہ لوگ نظریے کو اور اس کے مضمرات کو سمجھیں۔ ادھر میں نے جتنا کام کیا ہے ساختیاتی ادبی نظریے پر اور اس کی تحرک آشنا شکلوں پر کیا ہے۔ لوگ فوری نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں یا اچھے بُرے پر رائے قائم کرنا چاہتے ہیں، میری درخواست ہے کہ پہلے نظریے کو اور اس کی بنیادوں کو سمجھ لیجیے۔ رائے قائم کرنے کی منزل بعد کی ہے۔ ادبی معاملوں میں اشتہاریت اور تجارتی ذہنیت نے اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ لوگ فوری نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں، یا ایجاد بندہ سے کام لے کر بقراطیت بگھارتے ہیں اور غلط تاویلیں کرتے ہیں۔ ادھر ایسا بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے جس کا اصل نظریے سے کوئی تعلق نہیں اس طرح کی ادھ کچری ایجاد بندہ سے دانشورانہ مسائل کو نقصان پہنچتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر کچھ جانے یا سوچے رائے زنی کرتے ہیں۔ اور اپنی لاعلمی اور تعصب پر اکڑتے بھی ہیں۔ اپنے کام کے سلسلے میں مجھے دونوں طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس وقت میری سعی و جستجو یہ ہے کہ اس ادبی نظریے کے مبادیات اردو کی فکری روایت میں قائم ہو جائیں تو پھر نئے مباحث کو صحیح سمت و رفتار ملے گی۔ میں کئی برسوں سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ نظریے پر لکھنا ۱۹۸۸ سے شروع کیا جب کئی ماہ سری نگر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ کتاب کا نام "ساختیات اور ادبی تنقید" ہے، گیارہ ابواب لکھ چکا ہوں، آخری تین ابواب پر ان دنوں کام جاری ہے۔ ان میں سے کچھ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ساختیات کوئی آئیڈیولوجی نہیں ہے، کوئی ساختیاتی پارٹیاں یا حکومتیں کہیں قائم نہیں ہوئیں۔ ساختیات کے نام پر مار دھاڑ بھی نہیں ہوئی، کسی کا حقہ پانی بند نہیں ہوا۔ یہ سوچنے کا ایک طریقہ، متن کی قرأت کا ایک انداز یا زیادہ سے زیادہ معنی کا فلسفہ ہے جس نے ادب کی نوعیت و ماہیئت کے بارے میں اب تک چلے آ رہے سوچنے کے انداز کو بدل دیا ہے۔ البتہ اس کے سیاسی مضمرات ہیں۔ یہ چونکہ انحراف، انقطاع اور اجتہاد کا فلسفہ ہے، یہ بائیں بازو کے ساتھ ہے۔ لیکن سکہ بند یا ادعائیت شکار فکر کے ساتھ نہیں۔ ساختیاتی مفکرین میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ بورژوا طرزِ فکر، بورژوا کلچر، بورژوا اندازِ نقد غرضیکہ بورژوائیت کی ہر شکل کے شدید طور پر خلاف ہیں اس لیے کہ بورژوائیت جاگیردارانہ نیز سرمایہ دارانہ فکر کی خاص تشکیل (CONSTRUCT) 'موضوعیت' پر قائم ہے، اور ساختیات نے 'موضوعیت' کو تہس نہس کر دیا ہے۔

مزید یہ کہ معنی کا مرکز چونکہ رشتوں کا نظام ہے نہ کہ انسان کا ذہن یا ماورائے انسان کوئی چیز، اس لیے معنی بے مرکز ہے اور جب معنی بے مرکز ہے تو موضوعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ پس ساختیات کی وہ شاخ جو ردِ تشکیل DECONSTRUCTION کہلاتی ہے اور جس کی نظریہ سازی کے لیے ژاک دریدا شہرت

رکھتا ہے، باغیانہ فکری روش اسی لیے ہے کہ وہ موضوعیت یا ماورائیت کے ہر منصب کو رد کرتے ہوئے ہر معنی کو اپنے مرکز سے بیدخل کرتی ہے۔ ردتشکیل گویا قرأت کا ایسا طریق کار ہے جو سامنے کے مروجہ یا متعیّنہ معنی کو ردّ کرتا ہے اور اس معنی کو بروئے کار لاتا ہے جو دبا ہوا ہے یا پس پشت ڈال دیا گیا ہے یا جسے جبر اور استحصال کی قوتوں نے اقتدار کے کھیل میں عمداً نظرانداز کر دیا۔ اس باغیانہ نقطۂ نظر کا ادبی تنقید پر بالخصوص اثر پڑا ہے کیونکہ رومانی نقطۂ نظر جو مصنف کی ذات پر زور دیتا تھا، اُسے تو نئی تنقید نے رد کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر فن پارہ خود مکتفی ہے۔ ساختیات اور مظہریت کی رو سے قاری یا نقاد متن کو موجود بناتا ہے متن میں معنی بالقوۃ موجود ہے قاری اس کو برآمد کرتا ہے سو فن پارہ نہ خود مختار ہے نہ خود کفیل کیونکہ قرأت کا عمل خلا میں نہیں ہوتا۔ یوں دیکھا جائے تو پس ساختیاتی فکر نہ صرف قرأت کے عمل اور قاری کی واپسی پر زور دیتی ہے بلکہ ادب کے مسائل کو سماج اور تاریخ کے اندر بھی لے آتی ہے، لیکن تاریخ کا ردّتشکیلی تصور کوئی سادہ فکری تصور نہیں۔

وِنارنا اور جانکلنا صبا کا پردۂ گل میں

س: کیا پڑوسی ممالک جرمنی، ہنگری، پولینڈ میں بھی آپ کا جانا ہوا یا سارا وقت چیکوسلواکیہ ہی میں گزرا؟

ج: بیچ میں میں دو بار لندن گیا چوں کہ برٹش میوزیم میں کچھ کام باقی تھا۔ اس زمانے میں جمشید مسرور نے ناروے یاد فرمایا، دو تین بار ان کا فون آیا کیونکہ جولائی میں اردو تقریبات تھیں، ان کا اور ہیرجرین چاؤلہ کا اصرار تھا کہ اوسلو ضرور آؤں۔ اسکاٹ لینڈ کی بھی دعوت تھی، ٹکٹ بھی آگیا، لیکن چونکہ کام کا حرج ہوتا تھا، جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ میں نے معذرت چاہی۔ البتہ ایشیائی فلموں کے میلے میں تاریخی مقام کارلووی واری ضرور گیا، یہ جگہ وسطی یورپ میں آرٹ تھیٹر اور فلم کا مرکز ہے۔ مختلف ملکوں کے آرٹ کے شائقین یہاں جمع ہوتے ہیں اور زبردست رونق رہتی ہے پہاڑیوں اور وادیوں کے قدرتی مناظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عجیب پُرفضا جگہ ہے۔ شہر چھوٹا سا ہے، پہاری چشموں اور جنگلوں سے قریب، دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ، سڑکیں، راستے خوشنما، اُجلے روشن، بشاشت اور شادمانی کا ماحول تھا۔ ایشیائی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ بھی بڑی تعداد میں تھے۔ برلن یونیورسٹی میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اُردو پڑھاتی ہیں ان کا کام اُردو فکشن پر ہے اور سینٹل انسٹی ٹیوٹ میں ان کا فون آیا کہ چند روز کے لیے برلن آؤں اور لیکچر دوں۔ پاس ہی سوئٹزرلینڈ میں ڈاکٹر ارسلا روتھن ڈبرز ہیں جو ڈاکٹر جے بور گل کے ساتھ برن میں جنوب ایشیائی مرکز میں ہیں۔ ڈاکٹر بورگل کا نہایت عمدہ سیمینار CONCEPT OF FATE AND REALITY IN LITERATURE ڈاکٹریان ماریک کے یہاں دیکھا تھا۔ اُرسلا سے دو برس پہلے ہائیڈل برگ میں ڈاکٹر فتح محمد ملک کے توسط سے جرمنی میں ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر ان کی نہایت خوبصورت کتاب "اللہ کا ہندستانی باغ" جو اردو ادب کی انتھالوجی ہے، جرمن زبان کے شائقین کے لیے شائع ہوئی ہے جی تو چاہتا تھا کہ ان کرم فرماؤں کی دعوت قبول کروں، لیکن وہی اپنے کام کی مجبوری تھی۔ تسلسل بیچ میں ٹوٹ جائے تو پھر کئی دن تھاہ نہیں ملتی۔ بالآخر کرسٹینا ختم ہفتہ پر پراگ آگئیں۔ وِن سِس لاس پلازہ پر پیڑوں کی چھاؤں میں کئی خوبصورت VINARNA ہیں کچھ وقت وہاں گزرا، باتیں چیتیں ہوئیں۔ برسوں کے بعد کسی ہمدم دیرینہ کے ملنے پر جو کیفیت ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

میں چار سو ہوں سیل سفر درمیاں ہے
ٹورینٹو، کینیڈا، کنگسٹن، آٹوا ڈی سی

س: اگرچہ اس کا ذکر شروع میں ہی آنا چاہیے تھا کہ کینیڈا اور امریکہ کا سفر کس سلسلے میں تھا؟ یہ ذاتی سفر تھا یا آپ کسی یونیورسٹی یا ادارے کی دعوت پر گئے تھے۔ سُنا ہے واشنگٹن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی المنائی ایسوسی ایشن اور ٹورینٹو میں کنیڈین فورم آف پاکستانی رائٹرز اردو کے سلسلے میں کافی فعال ہیں؟

ج: مانٹریال (کینیڈا) کی کنکورڈیا یونیورسٹی میں غالب پر ۱۱۔ اور ۱۲ مئی کو سیمپوزیم تھا۔ اس کا اہتمام اردو لٹریری سوسائٹی کیوبک کی جانب سے تھا۔ احمد فراز، ملک زادہ منظور احمد، حمایت علی شاعر، داؤد رہبر، عبدالقوی ضیا، عبید صدیقی، شاہد ملک، خالد سہیل، سیّدہ نسیم نکہت بریلوی اور بہت سے دوسرے شریک ہوئے۔ میرا قیام عارف حسین کے یہاں تھا۔ "جو نئی پرانی نظمیں" اور اردو افسانوں کی انگریزی انتھالوجی والے فاروق حسن کے پڑوس میں ہیں میں زیادہ رکنا چاہتا تو بھی رک نہ سکتا تھا کیونکہ اگلے دن اتوار تھا اور مجھے ٹورینٹو پہنچنا تھا جہاں اروِن کے بیٹے کا نام کرن سنسکار،

مُنڈن اور ہون کی تقریب میری آمد کی وجہ سے
طے کی گئی تھی۔ فاروق حسن سے تفصیلی ملاقات
سمپوزیم کے پروگراموں کی وجہ سے نہ ہو پائی
تھی، ادھر ہلکے سے دل کے دورے کے بعد
صحت یاب ہو رہے تھے۔ بہرحال رات کے
بارہ بجے وہ آئے اور قہوے کے کئی دور ہوئے
اور دیر رات گئے تک گفتگو کا سلسلہ جاری
رہا۔ پو پھٹتے ہی رندھیر سنگھ گاڑی لے کر آگئے
ایئرپورٹ جانے کے لیے اور گھنٹہ بھر کی فلائٹ
کے بعد جب صبح آٹھ بجے میں ٹورنٹو پہنچا تو
ارون اور وینا اپنی نئی بی۔ ایم۔ ڈبلیو لیے
منتظر تھے۔ ایئرپورٹ سے سیدھے ہم اندرون
شہر راما کرشنا مشن چلے گئے جہاں اعزہ اور
احباب جمع تھے۔ پوتے کو دیکھنے کی جو خوشی
ہوتی ہے وہ کیفیت ہی الگ ہے۔ اس کا نام
'رشی' رکھنا طے پایا۔ کئی دن اسی عالم میں گزرے
لکھنا پڑھنا سب موقوف، زیادہ تر وقت رشی،
ارون اور وینا کے ساتھ گزرا۔ ان کا تقاضا
بھی یہی تھا۔ بہرحال کچھ دنوں بعد میں اپنی
ادبی دنیا میں لوٹ آیا۔ اشفاق حسین سے
ملاقاتیں ہوئیں۔ بیدار بخت بھی اس دوران
چین سے واپس آگئے۔ کرنل انور احمد،
عابد جعفری، جاوید دانش اور دوسروں سے
بھی ملنا ملانا رہا۔ کینیڈین فورم کی جانب سے
"فیض: شاعری کی دوسری آواز" پر میرا
توسیعی خطبہ ہلٹن ہوٹل میں ہوا جو جھیل کے
کنارے نہایت پُرفضا جگہ پر ہے۔ لابی کی
سیڑھیوں پر ہزاروں ٹیولپ کھلے ہوئے تھے۔
زرد اور ہلکے سُرخ رنگ کی بہار دیدنی تھی۔
صدارت احمد فراز نے کی۔ سوال جواب کے بعد
لنچ کا اہتمام تھا۔ سیدہ نسیم نے مانٹریال ہی
میں کنگسٹن یونیورسٹی کے استقبالیے کا ٹکٹ کرا
لیا تھا۔ وہ کنگسٹن میں رہتی ہیں۔ میں اشفاق
صاحب کے ساتھ ٹورنٹو سے نکلا، راستے میں
موسم ابر آلود تھا اور کنگسٹن پہنچتے پہنچتے بارش
نے آلیا کیونکہ یونیورسٹی میں آخر ہفتے کے پروگرام
کی وجہ سے وہ ہجوم تھا کہ خدا کی پناہ۔ لگتا تھا
دنیا کے تمام حسین اپنے بہترین لباس میں
طرح طرح کی خوشبوؤں میں بسے گھروں سے
باہر نکل آئے ہیں۔ جلسے کی صدارت ولی عالم
شاہین ایڈیٹر اردو کینیڈا نے کی۔ خاکسار کے
ادبی کام اور حالیہ پدم شری کے سلسلے میں
اشفاق حسین، ملک زادہ منظور احمد، حمایت
علی شاعر اور سیدہ نسیم نے اظہارِ خیال کیا۔
ان کی محبت تھی ورنہ میرا یہ استحقاق کہاں۔
ان کی سوسائٹی کے بیس بائیس اراکین نے
اپنے دستخط ثبت کر کے ایک بیش قیمت
یادگارِ علمی تحفے سے نوازا جس کا شکریہ ادا نہ
کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگلے دن دعوتوں کا
سلسلہ رہا اور پروگرام کے مطابق شام میں
سب سے اجازت لے کر میں شاہین صاحب
کے ساتھ آٹوا آگیا جہاں ان کی بیگم روشن
شاہین اور بچوں نے بہت خیال رکھا،
اشرف صاحب اور دوسرے احباب سے
ملاقات رہی اور دو دن کے بعد بیگم صاحبہ اور
بچے بطور خاص آٹوا سے ٹورنٹو موٹر میں پہنچانے
آئے۔ ارون وینا کے ساتھ اب چار پانچ
دن ہی گزار سکتا تھا کیونکہ ۲۵ کو واشنگٹن
کا ٹکٹ تھا۔ شکاگو سے حبیب صاحب کا فون
آیا اور افتخار نسیم کا بھی، ریحانہ سے ہربنس لال
نارنگ کا لیکن جانے کا وقت نہ تھا۔ واشنگٹن
میں میرے بڑے بھائی جگدیش چندر رہتے
ہیں۔ جمعہ کی شب میں علی گڑھ المنائی ایسوسی
ایشن کی جانب سے خاکسار کے اعزاز میں جلسہ
تھا جس میں میں نے "مشاعرے کی ثقافتی
اہمیت" کے موضوع پر خطاب کیا، ہال کھچا کھچ
بھرا ہوا تھا۔ شمیم جے پوری، وسیم بریلوی، اطہر عنایتی
ان دنوں وہیں تھے۔ ان سے بھی نیاز حاصل ہوا۔
جلسے کے بعد شعری نشست ہوئی، بارہ بجے
تک لطف صحبت رہا اول شب تھی بزم کی
رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی، اچھے سامعین
بھی، اچھے چہرے اچھے لوگ، وطن سے ہزاروں
میل دُور اردو کا نوسٹلجیا بھی عجیب نشہ
رکھتا ہے اور ایک تخلیقی معمل کا کام کرتا ہے۔
اگلے دن صبح میں نیویارک کے لیے نکلا، وہاں
سے ایئر انڈیا کی فلائٹ بدل کر لندن اور پھر
لندن سے بذریعہ برٹش ایئرویز اگلے دن دو بجے
تک پراگ پہنچ گیا جہاں یکم جون کو مجھے چارلس
یونیورسٹی اور اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں بطور
ایکسچینج پروفیسر حاضری دینا تھی اور اپنا کام
شروع کرنا تھا۔ پراگ کا احوال آپ کو پہلے
بتا چکا ہوں۔ لندن مجھے دوبارہ آنا پڑا وسط
جون میں کچھ دنوں کے لیے، اس کے بعد میں
پراگ لوٹ گیا اور مسلسل وہیں رہا۔ بہرحال
اوائل اگست میں پراگ کو خیرباد کہا اور ستمبر
میں دہلی واپس لوٹنے سے پہلے مہینہ بھر لندن
میں گزرا۔

لندن: جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے

س: لندن کی اُردو مرکزیت کے بارے میں
آپ نے 'سفر آشنا' میں جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح
بعض شخصیتوں کو آپ نے زندہ جاوید کرداروں
کے طور پر پیش کیا ہے، اس بارے میں کئی لوگوں

نے لکھا ہے۔ کچھ لندن کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بتائیں؟

ج، اگر قیامِ لندن کی تفصیل عرض کرنے لگوں تو یہ انٹرویو پوری کتاب ہو جائے گا۔ لندن تو اردو کے سوادِ اعظم سے باہر اُردو کا سب سے بڑا مرکز ہے ہی، یہاں آئے دن ادبی تقریبات، مشاعرے، مجادلے، مذاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اخبار، رسالے، میگزین نکلتے ہیں۔ اردو کے ادیب شاعر، اساتذہ، دانش ور، انشائیہ نگار، افسانہ نگار، خواتین شعرا کون ہے جو اس معمورۂ خراب آباد میں آباد نہیں پھر ساقی فاروقی کا کہنا ہے، کچھوے اور بلیاں ہیں جو جدید شاعری کے کلیشوں سے عاجز آکر نئے لفظوں اور نئی زمینوں کی تلاش میں کہیں اور بھاگ گئی ہیں۔ علاوہ شعروادب کے یہاں شعروادب کے غیر شعری اور غیر ادبی ہنگامے ہیں۔ انجمنیں بنانے اور انجمنیں توڑنے والے ادیب ہیں، ہنگامے باز، پرچے باز اور مقفّے باز ہیں جن سے ادب کی رونق ہے۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جن کی "ہوائی" کمپنیاں ہیں اور جہاز اُڑتے ہیں جن کے پائلٹ دہلی میں رہتے ہیں اور ریموٹ کنٹرول سے ان کو اڑاتے ہیں، لیکن سُنا ہے اب ہواؤں نے رُخ بدل لیا ہے اس لیے کہ لندن لندن ہے اور موسم وقت بے وقت بدل جاتا ہے۔ پھر یہاں اردو مرکز ہے جو بی سی سی آئی کے عرب نژاد ہو جانے سے اب بے مرکز ہو رہا ہے۔ پھر ہمارا دوست افتخار عارف ہے جو بے مرکز ہو کر بھی با مرکز ہے کہ اپنا حلقہ رکھتا ہے۔ جس کے شب و روز ستم گروں سے عذاب ہے ہوں اُس کے سدھرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، اب بھی آدھی آدھی رات کو جو کنگسٹن پارک کے پیڑوں کو شعر سناتا ہو (وہ بھی غزل کے) اس کا حشر بھلا کیا ہوگا پھر ہمارے کرم فرما مشتاق احمد یوسفی ہیں جن کی "آبِ گم" نے دیارِ غیر میں آبِ حیات کا کام کیا۔ زہرہ نگاہ اور ماجد بھائی ہیں جن کے یہاں ایم۔ ایف حسین بھی آتے ہیں۔ الطاف گوہر اور ڈاکٹر بھرت رام بھی۔ عبداللہ حسین اور ڈاکٹر فاخر حسین ہیں جو لندن میں رہتے ہوتے بھی لندن سے دُور ہیں۔ بخش لائل پوری ہیں جو کھرے جٹ ہوتے ہوئے بھی کھرے شعر کہتے ہیں۔ سشما اور او لگا اور جرمن مارتھا ہیں جو شاعری کی رسیا ہیں۔ چاند کرن ہیں جن پر ایک دن فلم ضرور بنے گی۔ گیت نگار سوہن راہی (عرف سیٹھ سوہن) ہیں جو ابن انشا کے آخری دنوں کی داستان دردناک انداز میں سناتے ہیں اور جو سچے دوستدار اور بھولے ساہوکار ہیں۔ بہن صدیقہ شبنم ہیں جو حبیب صاحب کی جدائی کی صلیب اٹھائے ہیں۔ دور افتادگان میں اکبر حیدرآبادی، اطہر راز، ابرار ترمذی، راج کھیتی، عباس زیدی اور سلطان فاروقی ہیں۔ صفیہ صدیقی، شاہدہ احمد اور عزیز بھائی ہیں جو مردانہ وار شدائد کا مقابلہ کرتے ہیں اور افسانے سنتے سناتے ہیں، اور ہاں جوان رعنا افسانہ نگار محسن شمسی ہیں جن کی داستانیں اُن سے دو قدم آگے ہیں۔ قیصر تمکین اور ان کا خورد بینی مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر دھرم پال، جاوید حکیم قریشی اور امین مغل ہیں۔ تنویر کا فلیٹ، نشاطِ روح اور ہاؤ ہو ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین ہے۔ جنگ اور راوی اور معین الدین شاہ اور ان کا ٹائپ دار اخبار ہے۔ فیض اکیڈمی، مجاہد ترمذی، بلونت کپور ہے، انقلابی شاعری ہے شیرِ پنجاب ہے اردو پنجابی اور ہندی ہے اور ان کا گھال میل ہے۔ یہ سب ہے اور بہت کچھ اور ہے، کیا کیا اور کہاں تک عرض کیا جائے۔ لندن تو شہرِ عجائبات ہے، یہاں پرانی سے پُرانی اور نئی سے نئی کتابوں کی دُکانیں ہیں جس نے ڈلنز یا فوئیلز نہیں دیکھا۔ سمجھیے برٹش میوزیم یا ٹرافلگر اسکوائر نہیں دیکھا۔ جیتندر بلو اور ارشد لطیف سے ملنے کا مزہ الگ ہے جے ایس چوہان اور ان کی چوکڑی برمنگھم میں ہے۔ پھر لندن بی۔ بی۔ سی کی اردو سروس ہے جہاں ہمارے دوست رضا علی عابدی اور ان کی کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اُردو ہے، وقار احمد اور یاور عباس، سارا نقوی اور سید حسن ہیں، عزیز گرامی عبید صدیقی ہیں، شاہد ملک اور عارف وقار ہیں، اور بی بی سی کلب ہے جہاں پیاس کے ماروں کا ساز و سامان اور آلات حرب و ضرب ہیں اور بھولے بھٹکے دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اسکول آف اورئینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز ہے جہاں رالف رسل بھی گاہے ماہے آجاتے ہیں، جہاں کرسٹوفر شیکل، خالد قادری، زوار حسین زیدی اور ڈیوڈ میتھیوز ہیں جو نیپالی پر بھی اکتفا کر لیتے ہیں۔ SOAS ایسی جگہ ہے جہاں امیر زہرہ اور شبانہ محمود سے لے کر شبانہ اعظمی اور جاوید اختر تک سب سے ملاقات ہو جاتی ہے پھر قریب ہی رائل سوسائٹی اور بیلے اور کانسرٹ اور نمائشیں ہیں، اور لندن یونیورسٹی کے آئے دن کے ہنگامے، یونین کی غپ شپ اور سیر تماشے۔ بس خرابی یہ کہ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو، اکثر SOAS کی لائبریری میں گھسے یا برٹش میوزیم کے ریڈنگ روم کے گنبد میں بند ہو گئے تو صبح

کے بھولے شام کو چوک میں آئے تو کیا آئے ابھر جال آنے جانے والوں کی رونق الگ، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، میر خلیل الرحمٰن، ناروے کے مسعود منور، شکاگو کے افتخار نسیم، لاہور کے سعادت سعید اور سب سے بڑھ کر نواب زادہ عالی مقام جناب جمیل الدین عالی جو صحیح معنوں میں بین الاقوامی ہو رہے ہیں، ان کے ساتھ کچھ شامیں لطف و انبساط اور کیف و نشاط کی گزریں۔ لندن لندن ہے قدم قدم پر پب کنٹری کلب اور بار اور بیر یا ارل گرے کی مہک دار چائے یا بھبھکا اڑاتی کافی۔ بس یہ سمجھیے مہینہ پر لگا کر اُڑ گیا:

زشیشہ تا بہ قدح ریختم بہار گزشت ـــــ!

مسئلہ معنی: تماشائی نیرنگ تمنا؟

س: آپ نے کسی خاص ادبی جلسے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جہاں آپ ہوں وہاں کوئی تقریب نہ ہوئی ہو؟

ج: تقریبات بھی ہوئیں جلسے بھی لیکن میرا دل دراصل کہیں اور تھا۔ ان دنوں سوائے ساختیات کے کچھ جی کو نہیں لگتا۔ اسی لیے اکثر بُرا بننا پڑا۔ صرف دو تقریبات کا ذکر کرتا ہوں۔ بزم اردو لندن اور حلقۂ ارباب ذوق لندن کا جلسہ بسلسلہ مجید امجد۔ بزم اُردو کے جلسے میں بطور مہمانِ خصوصی میں نے ادبی معنی اور اخذ معنی، کے مسئلے پر خطاب کیا جو ادب کا مرکزی مسئلہ ہے یعنی معنی کا حکم کون ہے؟ یا معنی کی ترسیل کیوں کر ہوتی ہے اور سامعین اور قارئین جن معانی کو قبول کرتے ہیں۔ کس طرح قبول کرتے ہیں۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ نو آبادیاتی اثرات سے جب افادیت اور مقصدیت کو ہم نے سامنے رکھا اور ترقی پسندی کی زمانے میں جس کی لَے بڑھی، اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ یہ گمرہی عام ہو گئی کہ معانی کوئی قائم بالذات چیز ہیں اور زبان کو محض میڈیم سمجھ کر مقہور و مردود قرار دیا گیا، اور ہر وہ طرز فکر جو زبان کو اہمیت دیتا تھا اس کو گالی بنا دیا گیا۔ یہ گویا ادب کی جڑوں پر وار کرنا تھا یا اُسی سرچشمے کو خاک ریز کرنا تھا جس سے اخذ معانی ہوتا ہے۔ یہ طے ہونے کے بعد کے اخذ معنی خلا میں نہیں ہوتا زبان ہی کے ذریعے ہوتا ہے، میں نے مرکزی مسئلے کو لیا کہ معنی کا حکم کون ہے تخلیق کار کی ذات، فن پارہ یا فن پارے کو پڑھنے والے یعنی اس کے قارئین۔ ادب میں سب سے قدیمی نظریہ یہی رہا ہے اور بالعموم یہی سمجھا جاتا ہے کہ معنی کا سرچشمہ فنکار کی ذات ہے۔ ادب کے تمام رومانی نظریوں میں اسی پر زور ملتا ہے۔ لیکن اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کیا وجہ ہے کہ فنکار کے عہد کے بعد معنی برابر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کئی فن پارے مصنف کا نام معلوم نہ ہونے کے باوجود پڑھے جاتے ہیں۔ یعنی معنی کے سرچشمے کی عدم موجودگی کے باوصف اخذِ معانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر معنی کا واحد سرچشمہ مصنف کی ذات یا اس کے منشا کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ناسخ یا ذوق کی جو معنویت انیسویں صدی میں قائم تھی، اس کے بعد وہ بدل گئی۔ یا غالب کی جو معنویت ان کے عہد میں تھی، آگے چل کر اس میں بنیادی تبدیلیاں ہو گئیں غرض یہ کہنا کہ معنی کا حکم مصنف کی ذات ہے جتنا صحیح ہے اتنا ہی غلط بھی ہے۔ دوسرا نظریہ جو رومانی نظریے کے بعد وجود میں آیا اور جس کا اثر اب بھی ہے اس کی رو سے معنی کا حکم فن پارہ یعنی متن ہے۔ جو بھی معنی اخذ ہوتے ہیں متن سے اخذ ہوتے ہیں۔ متن ہر عہد میں موجود رہتا ہے اور ایک سا رہتا ہے جبکہ معنی بدلتے رہتے ہیں۔ کہا گیا کہ متن خود کفیل ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر پر یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ اگر معنی کا حکم متن ہے تو شعرِ غالب کا متن تو عہدِ غالب میں بھی موجود تھا پھر وہ معنویت قائم کیوں نہ ہوئی جو آج ہے یا ناسخ کی معنویت متن کے جوں کا توں ہونے کے باوصف کیوں کر بدل گئی جبکہ متن وہی ہے۔ غرض کوئی چیز تو ہے جو ماورائے متن ہے۔ جس کی بدولت نسل بعد نسل اسی متن سے نئے نئے معانی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ غرض یہ مفروضہ بھی کہ معانی کا حکم متن ہے اسی طرح سو فیصد صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح مصنف کی ذات والا مفروضہ غلط ہے۔ تیسرا نظریہ جس پر ادھر کچھ نئے فلسفوں کا اصرار ہے یہ ہے کہ معانی کا حکم نہ تو مصنف ہے نہ متن بلکہ متن کے پڑھنے کا عمل یعنی قرأت ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قاری فن پارے کو موجود بناتا ہے۔ قاری نہ ہو تو فن پارہ بے جان چیز ہے مصنف تو ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔ فن پارہ البتہ موجود رہتا ہے لیکن قاری ہے جو اس سے اخذ معنی کر کے اسے موجود بناتا ہے چونکہ ہر عہد کے ساتھ قاری کی ذہنی اور جمالیاتی توقعات بدلتی رہتی ہیں اس لیے معنویت بھی بدلتی رہتی ہے۔ اس پر یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ اگر مصنف نے فن پارہ تخلیق نہ کیا ہو یا متن میں معانی کی گنجائش نہ ہو تو قاری اخذ معانی کیوں کر کرے گا۔ چنانچہ یہ بات بھی جتنی صحیح معلوم ہوتی ہے اتنی ہی ادھوری بھی ثابت

کی جاسکتی ہے اور یہ مسئلہ اپنی جگہ پر قائم ہے
کہ معنی کا حکم کون ہے ؟ یا ادبی تفہیم میں ان
تینوں منابع کو برابر برابر اہمیت حاصل
ہے۔

دل دریا سمندروں ڈونگے

مجید امجد کی شاعری پر سمپوزیم کا اہتمام
حلقۂ ارباب ذوق لندن نے کیا تھا۔ موضوع
کا انتخاب اس اعتبار سے مستحسن تھا کہ مجید امجد،
راشد اور میراجی کے ساتھ جدید شاعری کے
ایک اہم ستون تھے۔ لیکن ادبی حلقوں نے انھیں
مسلسل نظرانداز کیا۔ جلسے میں لندن کی تمام اہم
ادبی شخصیتوں نے شرکت کی مجھ سے افتتاحی
خطبے کے لیے کہا گیا۔ میں نے بنیادی طور پر تین
چیزوں کی طرف توجہ دلائی۔ اوّل یہ کہ جس
طرح کسی کا نظرانداز کیا جانا غیر ادبی فعل
ہے۔ اسی طرح نظرانداز کیے جانے کو ادبی اہمیت
کا جواز قرار دینا بھی غیر ادبی رویّہ ہے۔ مجید امجد
ایک فطری شاعر تھے۔ عزلت پسند، کم سخن، کم آمیز
پھر انھیں زمانہ ایسا ملا جب راشد اور میراجی
کی بغاوت ان سے بڑی بغاوت تھی۔ نیز فیض
کی غنائیت اور انقلابیت بھی فضا پر چھائی
ہوئی تھی۔ چنانچہ ایسے تجرباتی شاعر کا اپنی حیثیت
کو آہستہ آہستہ منوانا سمجھ میں آسکتا ہے۔
وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں
انتقال ہوا۔ اپنی زندگی میں ہی وہ اہم شاعر
تسلیم کیے جانے لگے تھے لیکن ان کی زیادہ شہرت
ان کے انتقال کے بعد ہوئی جو فطری ہے۔
دوسری بات جس کی طرف میں نے توجہ دلانے
کی کوشش کی یہ کہ فیض، راشد یا میراجی،
ان سب سے ہٹ کر مجید امجد کی شاعری میں
ایک ایسا قصباتی ذائقہ ہے، چھوٹی چھوٹی
بستیوں، گاؤں، کھیت کھلیان کی ایسی فضا
ہے جو اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے
یہاں اس انداز میں نہیں ملتی۔ ثبوت میں میں
نے ان کی کئی نظموں سے حوالے دیے۔ "بیساکھ"
"گھٹا ہے" "بھادوں" "سوکھا تنہا پتا" "دور
کے پیڑ" "کنواں" "چولہا" "پنواڑی" "ہری
بھری فصلو" "ریوڑ" "بن کی چڑیا" "صبح و
شام" "دھوپ چھاؤں" وغیرہ نظموں میں
قصباتی زندگی کا زمینی پن، کھلا آسمان، تاحدِ نظر
ہری بھری فصلیں، پیڑوں کی ہلکی گہری دھوپ
چھاؤں، دھول اُڑاتے ریوڑ ایک الگ کیفیت
پیدا کرتے ہیں۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ مختصر
نظم کو ایک فنی پیکر دینے اور اسے بطور صنف
قائم کرنے میں اس عہد کے دوسرے شاعروں
کے ساتھ مجید امجد کا ہاتھ بھی ہے۔ اُردو نظم
کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی مجید امجد
کی نظم "دوام" کو خارج نہ کیا جاسکے گا۔ یہی
کیفیت "آٹوگراف" "توسیع شہر" "دل دریا
سمندروں ڈونگے" "خرقہ پوش و پابہ گل"
"میرے خدا میرے دل" یا اپنی خوبی کسی
ایک خوبی کی ہے۔ مجید امجد نے اپنی ایک نظم
کو "نظمینہ" کہا ہے۔ تاریخ میں یہ خوبی انھیں
تادیر زندہ رکھے گی۔

برٹش میوزیم اور فشارِ تنگیٔ خلوت

س : اُردو کے حوالے سے انڈیا آفس لائبریری
اور برٹش میوزیم کی اہمیت مسلّم ہے۔ کیا اسکول
آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں اب
بھی اُردو کی تعلیم ہوتی ہے ؟ رالف رسل تو
غالباً اب وہاں نہیں ہیں۔

ج : رالف رسل ریٹائر ہوگئے ہیں لیکن آتے
جاتے رہتے ہیں۔ SOAS لندن یونیورسٹی کا
ادارہ ہے بالکل یونیورسٹی سینٹ کی مرکزی
عمارت کے ساتھ لگا ہوا۔ اُردو کی تعلیم حسبِ
سابق ہوتی ہے بلکہ طلبہ کی تعداد پہلے سے زیادہ
ہے۔ SOAS کی لائبریری ایشیائی زبانوں کی بہترین
لائبریری ہے اور کتاب کو RETRIEVE کرنے
کا سسٹم اور کیٹلاگ نہایت عمدہ ہے۔ اسی طرح
ریفرنس سیکشن بھی لاجواب ہے یہاں فلسطینی
شاعر عبداللہ العذیری سے بھی ملاقات ہوئی
جو جاہلیہ کی شعریات پر تھیسس لکھنے میں
مصروف تھے۔ انڈیا آفس لائبریری اب برٹش
لائبریری کا حصّہ ہے اور اورینٹل سیکشن جو
پہلے اسٹور اسٹریٹ پر تھا اب بلیک فرائرز
کی عمارت میں منتقل ہوگیا ہے جہاں ڈاکٹر
سلیم قریشی نگراں ہیں جنھوں نے ہندستانی
کتب کے کیٹلاگ کے ضمیمے بھی شائع کیے ہیں
اور نہایت ذمّے دار اسکالر ہیں۔ مرکزی ریڈنگ
اور ریفرنس روم برٹش میوزیم کے تاریخی گنبد
کے نیچے واقع ہے جسے ۱۸۵۷ء میں سڈنی سمرک
کی نگرانی میں مکمل کیا گیا تھا۔ یہ بیس کالموں پر
ایستادہ ہے اور فلک بوس گوتھک دریچوں
سے روشنی چھن کر نیچے ہر میز پر پڑتی ہے۔ بیک
وقت ساڑھے سات سو اسکالر صبح سے رات
گئے تک یہاں کام کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم
کے دوران ۱۹۴۰ء میں بم کے دھماکے سے
گنبد کو کچھ نقصان پہنچا لیکن دارالمطالعہ
بند نہیں کیا گیا۔ بعد میں فولادی گرڈروں کے
معائنے سے معلوم ہوا کہ ڈھانچہ بدستور ہے،
گنبد کا اندرونی ڈیکور فیروزی ہے اور گرڈروں
پر سنہری حاشیے ہیں اور بیچوں بیچ پتلی اونچی

محراب دار روشنی کی جالیاں ہیں۔ یہ دنیا کا
سب سے بڑا ریفرنس دارالمطالعہ ہے جہاں
کبھی مارکس اور لینن نے بھی کام کیا تھا، ان
کے علاوہ سر والٹر اسکاٹ میکالے، ڈکنس،
کارلائل، تھیکرے، تھامس ہارڈی، جارج
برنارڈ شاہ اور کئی دوسری اہم شخصیات
کے نام یہاں بیٹھنے والوں میں ملتے ہیں۔ اعداد
کے مطابق یہاں کتب کی تعداد ایک کروڑ
سے بھی زائد ہے۔ یعنی اگر کتابوں کے شیلف
پھیلائے جائیں تو ایک سو دس میل جگہ چاہیے
ہوگی۔ ہر سال تقریباً چھ لاکھ کتابوں کا اضافہ
ہو جاتا ہے جس میں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں
کی کتابیں ہیں۔ ہر سال ساڑھے آٹھ لاکھ لوگ ان
سے استفادہ کرتے ہیں، فقط کیٹلاگ کی دو
ہزار ایک سو دس جلدیں ہیں جو ماخذ SOAS
میں دستیاب نہ تھے ان کے لیے اکثر میرا یہاں
آنا ہوتا تھا۔ ۱۹۷۶ء کے بعد کی تمام مطبوعات
کے کیٹلاگ مائکروفش پر موجود ہیں جن کو ریڈر
پر دیکھنا میرے لیے مسئلہ تھا۔ ایک ہسپانوی
نژاد اسکالرہ 'ماریہ' فرشتہ ثابت ہوئیں،
پری پیکر، گل چہرہ، حور شمائل . . .

قصہ درد کہ ماند ایں ہمہ ناگفتہ بسے
با تو گویم بشرطیکہ نہ گوئی بہ کسے

واشُدِ زخمِ سفر

س: اب آپ کتنے دن دہلی رکیں گے۔ پھر کب کا ارادہ ہے اور کہاں کا؟

ج: محبت میں مبالغہ جائز ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں۔ سفر ہو یا حضر اگر اُردو سفرِ عشق ہے تو بندہ مسلسل سفر میں ہے۔ ادھر اول تو ایک انگریزی کتاب پریس میں ہے۔ اردو لینگویج اینڈ لٹریچر: کرٹیکل پرسپکٹوز، دوسرے ساختیات والے کام کے ابھی دو ابواب باقی ہیں۔ میٹریل جمع کر چکا ہوں، بہت کچھ لکھ بھی چکا ہوں، لیکن کچھ کام باقی ہے۔ پھر سفر محض سفر نہیں۔ ایک سفر خارجی اور جسمانی ہوتا ہے تو ایک ذہنی و باطنی بھی ہوتا ہے۔ اور باطنی سفر میں بھی اصل چیز 'واشُدِ زخمِ سفر' ہے۔ ظفر اقبال کا کیا اچھا شعر ہے:

کتنے دلوں میں واشُدِ زخمِ سفر نہیں
کیا کیا مکاں ہیں جن میں ہوا کا گزر نہیں

اگر واشُدِ زخمِ سفر عطا ہو، اور دریچۂ دل کھلا رہے تو پھر کیا چاہیے جس کی طلب ہو۔

نظمیں

مُتضاد زاویے

اور بساطِ خیال بے پایاں
اور مُعیّن حدودِ شرح و بیاں
تیز رفتار گردشِ حالات
اور آہستگیِ عمرِ رواں
اجنبیّت کا مستقل اِک بوجھ
اور شناسائیوں کا بارِ گراں
عقل کی خامی، نارسی دل کی
اور تصوّر شکن حقیقتِ جاں
مختلف ہر وجود پیشِ نظر
اور امکانِ وحدتِ امکاں
فکر عقدہ کشائیوں پہ مُصِر
اور سر رشتے ہی کا خود فقداں
انتہا سلسلوں کی نا معلوم
اور ہر لمحہ سلسلہ جنباں
متواتر مراحلِ تعلیم
اور مسلسل مدارجِ نسیاں
شعبہ ہائے خیال بے تمیز
اور بہر شناخت مہر و نشاں
چار جانب صراحتوں کا ہجوم
اور بحرِ رموز بے پایاں
سیلِ بیروں رواں بہ طرزِ دگر
اور جوئے دروں الگ سی رواں
ایک کھوئی ہوئی فضائے حیات
اور احساس و فکر سب غلطاں
اور سانسوں کی رہ گزر پہ ہجوم
اور آنکھوں کی رہ گزر ویراں

عبدالاحد ساز

زکریا مینور، چوتھا منزلہ، ۱۲۹، یوسف مہر علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

یاد

دیارِ قلب میں کچھ ایسے تیری یاد آئی
کہ جیسے ذہن میں جھونکا بہار کا آئے
عروسِ ناز کوئی ریگ زار سے گزرے
کہ شاہزادی کوئی جھونپڑی میں آجائے
دہانِ زخم پہ جیسے لگے کوئی مرہم
مریضِ عشق کو جس طرح نیند آجائے
زمینِ خشک پہ بارش کا پہلا چھینٹا ہو
جھلستے دشت پہ جیسے گھٹا برس جائے
نوید جیسے ملے کوئی موسمِ گُل کی
سُراغ جیسے کسی گمشدہ کا مل جائے
ہوائے تُند میں جیسے کوئی چراغ جلے
اندھیری رات کو جس طرح صبح مِل جائے
دلہن حیات کی جیسے برائے جشنِ طرب
زری کا جوڑا پہن کر خوشی سے اِترائے
ترا خیالِ منوّر کچھ اس طرح جیسے
شبِ سیاہ میں آنچل سحر کا لہرائے
اِسی طرح جو رہے یاد ساتھ ساتھ تری
ہجومِ غم میں بھی شاہدؔ کبھی نہ گھبرائے

شاہد نجیب آبادی

پوسٹ بکس نمبر ۲۶۵۷۲، منامہ، بحرین

دورِ خزاں ہے موسمِ گُل کے زوال تک
قصّہ ہمارے ہجر کا لکھیے وصال تک

بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے خواب کی طرح
وہ آئے ہم کو چھوڑنے شہرِ خیال تک

وہ شاخِ گُل ہے خوشبو ہے یا کوئی لہر ہے
وہ کیا ہے جس کی کوئی نہیں ہے مثال تک

پہچان ہی نہ پائے مجھے گھر کے لوگ بھی
دھندلا دیے تھے وقت نے یوں خدوخال تک

گردش میں جو زمانے کی ہم سے بچھڑ گئے
مِلنے کے وہ نفیسؔ نہیں ماہ و سال تک

رواں دواں ہے زندگی کا کارواں جہاں جہاں
فضائے دشت ساتھ ہے اُٹھائے سر وہاں وہاں

غبارِ راہ جسم پر سجائے پیرہن سا ہم
تلاش کرتے پھر رہے ہیں منزلیں کہاں کہاں

قدم قدم پہ سُن رہے ہیں جسم کی پکار ہم
فسوں زدہ سے چل رہے ہیں بے خبر کشاں کشاں

بہک نہ جائیں آج کیوں گنوائیں ہوش ہم نہ کیوں
یہ چاند سر پھرا سا ہے یہ رات ہے جواں جواں

کوئی چراغ بجھ گیا یہ نیند کس کو آگئی !
نفیسؔ روئے ماہتاب کیوں ہے پھر دھواں دھواں

نفیسؔ غازی پوری

۵۸۲/۴، سرسید نگر، علی گڑھ (یو۔ پی)

ظفر مرادآبادی

سخن کو فکر، ہر اک فکر کو ہنر کرنا
مذاقِ دیدہ وری اتنا معتبر کرنا

مجھے یقین نہیں، اور کوئی سچ بولے
تم اُس کے رُوپ کی اے آئینو! خبر کرنا

ترے سوا، یہ ہُنر اور کس کو آتا ہے
کہ جو بھی لفظ برتنا اُسے گہر کرنا

مرے لہو کا اُجالا افق افق پھیلے
ہُوائے تُند! مجھے اور دربدر کرنا

جَلا رہا ہوں نئی فکر کے چراغ ظفر
مرے سخن کے حریفوں کو یہ خبر کرنا!!

۱۸۸۹، فرسٹ فلور، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تین زاویے

"کہتے ہیں، جب تک دشتِ وفا میں تجربات کی خاک نہ چھان لی جائے، لیلیٰ زندگی کسی پر مہربان نہیں ہوتی۔"

منصور نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی۔

'یہ ادیب اور افسانہ نگار بھی عجیب مخلوق ہیں۔' وہ دل ہی دل میں بُدبُدایا ——— نہ سر نہ پیر، جو چاہا لکھ مارا۔ گھسی پٹی باتیں۔ فرضی قصّے۔

اب تجربات کی خاک چھانتے چھانتے ہی تو وہ اپنی عمر کی ۳۰ منزلیں گزار چکا تھا لیکن لیلیٰ زندگی اُس پر ابھی تک مہربان نہیں ہوئی تھی۔

اپنا گھر بسانے کے لیے یہ اُس کی دوسری کوشش تھی۔ اِس بار اُس نے لڑکی کو دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ لڑکی کا بھائی سرفراز اُس کے ساتھ اے۔ جی۔ آفس میں ٹائپسٹ تھا۔ سرفراز کے علاوہ لڑکی کے ماموں اسے دیکھ پرکھ چکے تھے اور منصور کے پہنچنے سے پہلے ہی سرفراز ۱۵ دِن کی چھٹی لے کر احمد آباد جا چکا تھا۔

اب منصور جس گاڑی سے جا رہا تھا، اُسے کل صبح احمد آباد پہنچنا تھا۔ پھر کل شام کو ہی بہت سادہ سے انداز میں اُس کی شادی ہو جانا تھی۔

منصور نے سوچا "شاید اس بار لیلیٰ زندگی اس پر مہربان ہو جائے اور وہ اپنی تنہائیوں کے قبرستان سے چھٹکارا حاصل کر لے۔

اس نے اکتا کر ایک بار پھر وہی ناول اٹھا لیا۔ ٹرین ایک ہچکولے کے ساتھ رک گئی۔ کمپارٹمنٹ میں چڑھنے والوں کا ایک ریلا اور باہر کا شور بھی اندر گھس آیا۔ کسی نے باہر سے ایک آواز لگائی "راجستھانی مینے کی چوڑیاں، سہاگ کی نشانی۔" منصور اوپر والی برتھ پر لیٹا تھا۔ اس نے بدن کو سمیٹا اور تھوڑا جھک کر گردن نیچے کی طرف لٹکاتے ہوئے کھڑکی سے پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی۔ یہ جے پور تھا ——— اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسلنا شروع کر دیا۔ جلدی سے گردن اندر کر کے وہ بے جان سا اپنی برتھ پر پھیل گیا ——— اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اُسے ایسا لگا جیسے پلیٹ فارم پر اس نے کوئی بھیانک منظر دیکھ لیا ہو ——— یہ وہی شہر تھا جس میں آج سے آٹھ برس پہلے اس نے اپنی تنہا اور زخمی زندگی کو انور کے مہربان ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔

پھر اچانک اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا ——— کمپارٹمنٹ میں کوئی عورت تیز آواز میں سامان اُٹھا کر لانے والے قلی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔

منصور کی طرف اس کی پُشت تھی ——— سفید زمین پر بڑے بڑے پنک کلر کے پھولوں والی جارجٹ کی ساڑی میں اس کا گداز جسم منصور کو خاصا پُرکشش لگا، گردن کے پاس سے بلاؤز کے پچھلے حصّے کا کٹاؤ اتنا زیادہ تھا کہ

کی طرح دمک رہی تھی اور بھورے بالوں کی موٹی سی چوٹی کمر کے نیچے تک بڑی بے ترتیبی سے لہرا رہی تھی ———

منصور کو خیال آیا کہ انور کے بال بھی تو ایسے ہی بھورے اور گھنے تھے۔ اکثر وہ انھیں سنوارتے سنوارتے جھنجلا کر کنگھا پھینکتے ہوئے کوسنے لگتی اور منصور اس کی ٹھوڑی کو اپنی ایک انگلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہتا "نہیں انو نہیں، اتنے خوبصورت بالوں سے تو تمھیں پیار کرنا چاہیے۔"

"خاک کرنا چاہیے۔" وہ روہانسی ہو کر اپنی ہتھیلیاں دبانے لگتی۔ "کمبخت ہاتھ دُکھنے لگتے ہیں سُلجھاتے سُلجھاتے۔"

پھر منصور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگتا...

وہ عورت قلی سے نمٹ کر اب اپنا سامان برتھ کے نیچے قرینے سے لگا رہی تھی، سارا سامان رکھ کر اس نے پلاسٹک کی باسکٹ برتھ سے اُٹھا کر نیچے رکھی اور اپنے پاس کھڑی چار پانچ برس کی ایک خوبصورت سی بچی سے کہا "نیلی تم یہاں بیٹھ جاؤ۔"

اچھا تو بچی بھی ہے منصور نے سوچا۔

وہ بچی کو بٹھا کر نیچے کی دونوں برتھوں کے درمیان پھنسے ہوئے ہولڈال پر بیٹھنے لگی تو منصور نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔

"ارے وہی تو ہے، بالکل وہی۔"

منصور نے اسے پہچانتے ہی فوراً اپنی بغل میں پڑا ناول کھول کر اپنے چہرے پر کر لیا۔

کوارٹر نمبر ایف، بلاک نمبر ۴۴، بڑی موور سرائے، دہلی ۶

کے دونوں صفحے اسے قطعاً سادے لگ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی" اگر وہ ہے بھی تو کیا ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کیوں ڈر رہا ہوں۔ قصوروار تو وہ خود ہے۔ اپنا گھر بسا کر مجھے زندگی بھر کے لیے اکیلا چھوڑ دینے کا جرم تو اس نے کیا ہے۔ میں کیوں پریشان ہوں؟"

منصور نے اپنے کانپتے ہاتھوں میں پکڑی کتاب کو تھوڑا ترچھا کر کے نیچے کی طرف دیکھا، اب وہ اطمینان سے ہولڈال پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ منصور نے ایک گہری سانس لی۔ وہ بالکل نہیں بدلی ہے بس گالوں پر گوشت کی دبیز پرتوں نے چہرے کو بھاری کر دیا ہے۔ ہاں آنکھوں میں پہلے جیسی شوخی اور چمک بھی نہیں ہے۔ پھر اسے یاد آیا۔ اس کی آواز بھی تو بدل گئی ہے۔ کچھ تیز اور بھاری، وہ پہلے جیسی کھنک اور ٹھہراؤ بھی نہیں رہا۔

گاڑی وسل دے کر پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی تو منصور نے سوچا، کل صبح تک سفر کرنا ہے اور انو یقیناً احمد آباد سے بھی آگے، اپنی سسرال، بڑودہ جا رہی ہوگی۔ پھر میں کہاں تک منہ چھپاؤں گا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا — اپنے چہرے پر سے کتاب ہٹا کر اس نے کروٹ بدل لی۔ اب انو کی طرف سے منصور کی پشت تھی۔

کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ خاصی اونچی آوازوں میں گفتگو کر رہے تھے، لیکن منصور کو ایسا لگا جیسے الف لیلیٰ کی کہانیوں والے بھیانک عفریت نے اسے کسی معصوم شہزادے اور انو تیرتے ہوئے خاموش جزیرے میں قید کر دیا ہو۔

پہلا زاویہ

منصور کو جے پور آئے ہوئے دو مہینے اور ریگزوں کی کوٹھی والے اس مکان میں پندرہ دن ہوئے تھے انور جہاں کو اس نے اس مکان میں آنے کے تین دن بعد ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کا کمرہ اقبال منزل کی تیسری منزل پر تھا — اقبال منزل کی چھت سے بالکل ملی ہوئی رفعت منزل کی چھت تھی۔

انور کو منصور نے پہلی بار رفعت منزل کی چھت پر چھوٹے چھوٹے رنگین رومال کاڑھتے دیکھا تھا۔ اسی شام منصور نے اپنے جگری یار سجاد سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ رفعت منزل میں اپنے وقت کی مشہور ڈیرے دار طوائف اور ریڈیو سنگر رفعت جہاں رہتی ہیں — بعد میں پتا لگا کہ رفعت بائی کے گھرانے میں ایک زمانہ ہوا گانے بجانے کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور انور جہاں، رفعت بائی کے بڑے بھائی شریف کی بڑی بیٹی ہے۔ سجاد نے بتایا کہ شریف صاحب مقامی پوسٹ آفس میں ملازم ہیں اور انور مہارانی گرلز کالج میں بی۔ اے فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔

منصور پر انور سے پہلی نظر کے ٹکراؤ کی وہ رات بڑی بھاری گزری۔ اردگرد بکھری مسکراہٹوں میں وہ پہلی جان لیوا مسکراہٹ تھی جو منصور کو دیکھ کر انور کے لبوں پر آ گئی تھی۔

آج سے پہلے کبھی منصور کا دل کسی لڑکی اس شہر کی ہر گلی میں لڑکیاں خوشبو کی طرح بکھری ہوئی تھیں، لیکن منصور کی زندگی کے سونے آنگن میں کسی لڑکی کے قدموں کی یہ پہلی چاپ تھی۔ اس کے احساس پر انور کی مسکراہٹ کا یہ پہلا گھاؤ تھا جس نے اس کا سکون چھین لیا تھا اور اس سکون کی جگہ درد کی دولتِ نایاب بخش دی تھی۔

کہتے ہیں جب آگ دونوں طرف برابر کی لگی ہو تو مسکراہٹوں کی روشن قندیلوں میں سلام و پیام کا تبادلہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔

کچھ ہی دن میں اقبال منزل اور رفعت منزل کے درمیان سیمنٹ اور پتھر کی پختہ منڈیر کو دو بے تاب دلوں کی حرارت نے پگھلا دیا۔ چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں دو جسموں کے سائے ایک ہوئے تو چھتوں کے ساتھ وہ فاصلے بھی مٹ گئے جو سماج نے منصور اور انور کے بیچ پیدا کیے تھے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب انور کی معصوم آنکھوں کے موتی منصور کی ہتھیلی پر ٹپک پڑے۔

"سچ منصور، میں زہر کھا لوں گی۔" وہ منصور کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر رونے لگی۔

"مگر کیوں؟"

"میں اس بھتنے سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"تو مت کرو، کون کہتا ہے۔"

انور روہانسی ہو گئی۔ "تمھیں مجھ پر رحم نہیں آتا، وہ لوگ اسی مہینے بارات لے کر آ رہے ہیں، خدا کی قسم میں چوڑیاں پیس کر پھانک لوں گی۔"

منصور نے اس کی آنکھوں کے آنسو

"چلو کہیں بھاگ چلیں" وہ بولی۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"فرار کا راستہ عیاشی تلاش کرتی ہے، محبت نہیں۔"

اور وہ اپنے ہونٹوں کا تمام رس میٹ کر آوارہ بدلی کی طرح بوند بوند کر کے صور کے احساس پر برس گئی۔

پیار کا طوفان تھما اور خوابناک رزوؤں کے بادل چھٹ گئے تو وہی ہوا جس اڈر تھا ـــــ سچائیوں کی تیز اور نوکیلی سنگینوں نے دونوں کے سینے چھلنی کر دیے۔

انور کی شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو منصور ا پورا وجود زخمی تھا۔ روح تھکن اور محرومی ے احساس سے چور تھی۔ اس نے انور کو ایک ط لکھا۔ آخری خط...

"انو! زندگی ایک بازار ہے اور یہاں یار کے معیار کی کوئی قیمت نہیں، اس بازار یں تو قیمت ہی معیار ہے، اور قیمت کے معیار ر زندگی کا یہ نیا سودا تمھیں مبارک ہو۔ میں تمھارے پیار کی قدروں کے ٹوٹے ہوئے شیشے لے کر آج یہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔"

ط لکھ کر اس نے انور کی چھوٹی بہن قمر کو ے دیا۔ وہ رات انور کے شہر میں اس کی آخری رات تھی۔

دوسرا زاویہ

ایسا نہیں تھا کہ شیخ طائی کو شادی سے نفرت تھی۔ شادی تو اس کی دیرینہ کمزوری تھی لیکن اسے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ سے کوئی لڑکی شادی بھی کر سکتی ہے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی ماں کسی زمانے میں بڑودہ، فتح پور چوک کی طوائف تھی۔ ماں کے پاس جوانی کی کمائی ہوئی اتنی دولت بھی تھی کہ اگر شیخ طائی چاہتا تو اسے زندگی بھر معمولی سے پرائمری اسکول میں ماسٹری نہ کرنی پڑتی۔ لیکن سماج میں اپنی ماں کے نام پر زندہ رہنا اسے پسند نہ تھا۔ اس کے لیے تو اپنے اس ریٹائرڈ تھانے دار باپ کا نام ہی بے حد اہم تھا، جس نے اس کی ماں کو فتح پور چوک کے بازار سے اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔

تھانے دار صاحب مرے تو ماں کو شیخ طائی کی شادی کی فکر ہوئی، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شیخ کی شادی جے پور میں رفعت بائی کی بھانجی سے کرے گی۔

شیخ طائی شادی تو کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی ماں کی برادری میں نہیں، پھر بھی ماں کی ضد کے آگے اس نے سر جھکا دیا۔

شادی کے بعد انور جہاں، انور شیخ بن کر گھر میں آئی تو سیاہ فام بونا حیرت سے بت بن گیا ـــ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اسے اتنی خوبصورت بیوی مل سکتی ہے۔ اس کے دوست تو اسے بھتنا کہہ کر چھیڑتے تھے ـــــ

پھر یوں ہوا کہ خوبصورت اور مجبور شہزادی عفریت کے محل میں قید ہو گئی۔

تیسرا زاویہ

انور اُن لڑکیوں میں سے تھی جو پیار میں سب کچھ کر سکتی ہیں ـــ زہر بھی کھا سکتی ہیں منصور ہی بزدل نکلا، جو اسے بھگا کر لے جانے پر تیار نہیں ہوا۔ وہ بے وقوف تو اکیسویں صدی کی لڑکی سے اٹھارہویں صدی کا عشق کر رہا تھا ـــــ

انور، منصور کے ساتھ بھاگ کر تو نہ جا سکی، لیکن جس دن بڑودہ سے اس کی بارات آئی اُسی دن انور نے زہر کھا لیا۔ رفعت منزل میں ڈاکٹروں کی قطار لگ گئی۔ لیکن زندگی اور موت کی اس جنگ میں زندگی جیت گئی۔ انور بچ گئی۔ پھر موت کو شکست دینے والی انور کے حصے کا زہر جب اس کی ماں نے پی جانے کی دھمکی دی تو انور ہار گئی اور مسز شیخ طائی بن گئی۔

انجام

بہت دیر تک اس طرح پڑے پڑے منصور کے بائیں طرف کی پسلیاں سن ہو گئیں۔ ہمت کر کے اس نے کروٹ بدلی ـــ وہ نہ جانے کیوں اوپر کی سمت ہی دیکھ رہی تھی۔ اچانک دونوں کی نظریں ملیں، ایک پل بس ایک ہی پل کے لیے انور کے چہرے کی ساری سرخی سفیدی میں بدل گئی۔ آنکھوں میں عجیب سی ویرانی اور چہرے پر وحشت پھیل گئی۔

منصور نے دیکھا کہ شرمندگی کے بوجھل احساس نے انور جہاں کی پلکوں کو جھکا دیا تھا۔ منصور کو اس کی گھبراہٹ اور بے چارگی نے چند لمحوں کے لیے بڑی طمانیت بخشی ـــ پھر انور کی انگلیوں کے کپکپاتے پوروں اور آنکھوں کے بھیگے کنارے دیکھ کر منصور کو اس پر رحم آ گیا۔

[illegible] سامنے
چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔
گاڑی کشن گڑھ پر رُکی تو نیچے والی برتھ کے دو مسافر اُتر گئے۔ انّو کی بچی کھڑکی کے پاس والی خالی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگی ——
انّو نے اُسے اپنی گود سے اُتار کر کھڑکی کے پاس بٹھا دیا۔ اور خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برتھ پر اب بھی ایک اور آدمی کے بیٹھنے کی جگہ خالی تھی۔
منصور اپنی اوپر والی برتھ سے نیچے آترا۔
انّو کے سامنے والی برتھ پر تین سیدھے سادے دیہاتیوں کے پاس ایک جٹادھاری سادھو آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔
منصور کچھ سمٹ کر انّو کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی —— گاڑی کشن گڑھ سے بھی چل پڑی۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔
اچانک انور نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"
منصور ابھی تک چُپ کے جزیرے میں بھٹک رہا تھا۔
کچھ دیر بعد منصور نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو؟"
"بڑودہ۔"
"اپنی سسرال۔"
اس بار وہ خاموش رہی۔
منصور نے بچی کی طرف دیکھ کر کہا "بہت پیاری بچی ہے۔"
انور اس بار بھی خاموش رہی —— ہاں منصور کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی

منصور نے جھلا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔
انور نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"
"احمد آباد" منصور نے انور کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "کل وہاں میری شادی ہے۔"
"مبارک ہو۔" انور نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔
"یہ تم کہہ رہی ہو!" منصور کی ہنسی میں کھوکھلا پن تھا۔
منصور! ہو سکے تو میری تمام یادیں مجھے لوٹا دو۔"
"کیوں لوٹا دوں؟ ان یادوں کو واپس مانگنے کا حق تمھیں کس نے دیا؟"
انور نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کر منصور کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے انور کے چہرے کا سورج دھندلا گیا ہو۔ آنکھوں کی کرنیں ماند پڑ رہی ہوں۔
وہ بولی "منصور! میں ان چھ برسوں میں ہر پل، ہر سانس کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹی ہوں۔ کیا میں تمھیں وہی انّو نظر آتی ہوں؟ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے تمھیں مجھ سے چھین کر ایک کھوٹا سکّہ میری جھولی میں ڈال دیا۔ تم نے اپنے خط میں سچ ہی لکھا تھا۔ اس بازار میں قیمت ہی معیار ہے۔"
منصور نے کوئی جواب نہیں دیا ——
اس نے ایک پل کے لیے انور کی ویران آنکھوں میں جھانکا، پھر اچانک کسی فیصلہ کن جذبے کے تحت اُٹھ کر اپنا

خاموشی سے دیکھتی رہی۔
گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔
شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔
"سامان کیوں باندھ لیا؟" انور نے پوچھا۔
"یہیں اُترنا ہے۔"
"احمد آباد تک نہیں چلو گے؟"
"نہیں —— دوسری گاڑی سے واپس دہلی جاؤں گا۔"
"کیوں؟"
منصور نے کوئی جواب نہیں دیا ——
گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو انور کی طرف دیکھے بغیر وہ چھوٹا سا ہولڈال اور سوٹ کیس لے کر کمپارٹمنٹ سے نیچے اُتر آیا۔
پلیٹ فارم پر سامان رکھ کر وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ——
تبھی گاڑی نے وسل دی ان دونوں کو لگا جیسے سیٹی کی یہ تیز آواز انجن کے سینے سے نہیں، اُن کا دل چیر کر نکلی ہو۔

ر لیا آنکھوں میں کل خواب کا منظر اُس نے
نے کیا بات تھی چھوڑا نہیں بستر اُس نے

رد تیروں کی ہے ہر سمت ہے بارش اُس پر
ھوپ کو اوڑھ لیا ننگے بدن پر اُس نے

یا سنائے وہ ہمیں حالِ سفر صحرا کا؟؟
وَں رکھا ہے کبھی شہر کے باہر اُس نے؟

تل کرتا رہا دن رات وہ لفظوں سے ہمیں
وَن میں تر نہ کیا ہاتھ کا خنجر اُس نے

یچھے اُس نے سُنے، رُک گیا وہ رستے میں
بھی دیکھا ہی نہ تھا چڑیوں کا لشکر اُس نے

ھ کو جانا تھا اندھیروں کے سفر پر اے فیضؔ
ے دی چلتے ہوئے اِک نور کی چادر اُس نے

جاوید اشرف فیضؔ اکبر آبادی

روزن کاٹیج، قربان اسٹریٹ، ہل سائڈ، پہاڑی ٹولی، رانچی ۸۳۴۰۰۱

انور باری

تعلّق کے نئے انداز سے خاکے بناتا ہے
کوئی دیوار چنتا ہے وہ دروازے بناتا ہے

گزر جاتی ہے اپنی حد سے جب آنگن کی تنہائی
لکیریں کھینچ کر کاغذ پہ گُل بوٹے بناتا ہے

سزا کا مستحق ٹھہرا رہے ہو کس لیے اس کو
حقیقت تم سمجھتے ہو وہ افسانے بناتا ہے

نتیجہ اپنی فنکاری کا ہے پیشِ نظر اس کے
مگر وہ پتّھروں کی زد میں آئینے بناتا ہے

لہو تو صاف ہو جائے گا سڑکوں کا مگر انورؔ
اسے بھی ذہن میں رکھو جو منصوبے بناتا ہے

۱/۵۰۷، چھتہ بھائی جان، کوچہ رحمٰن، چاندنی چوک، دہلی ۱۱۰۰۰۶

رنگوں کی یلغار سے ڈرنے والی ہیں
اپنی ہی تلوار سے مرنے والی ہیں

ناؤ ہوں میں اور پار اُترنے والا تو
آگ کا دریا، اور گزرنے والی ہیں

تُو بیری طوفان ہے پت جھڑ پھول ہوں میں
تیرے تھپیڑے اور بکھرنے والی ہیں

اشکوں کا سیلاب، ڈبونے والا تُو
ڈوب ڈوب کے روز اُبھرنے والی ہیں

جھوٹے تیرے اعلان مری آزادی کے
زنجیروں کا لمس، بپھرنے والی ہیں

عذرا پروین

۲۰۱/۱۴، عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ (یو۔پی)

میں کھینچ کر زور سے سمیٹ لیا۔ بچی گھبرا کر ماں کے
چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

گاڑی کشن گڑھ پر رُکی تو نیچے والی برتھ
کے دو مسافر اُتر گئے۔ انّو کی بچی کھڑکی کے پاس
والی خالی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگی ——
انّو نے اُسے اپنی گود سے اُتار کر کھڑکی کے پاس
بٹھا دیا۔ اور خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برتھ پر
اب بھی ایک اور آدمی کے بیٹھنے کی جگہ خالی تھی۔

منصور اپنی اوپر والی برتھ سے نیچے اُترا۔
انّو کے سامنے والی برتھ پر تین سیدھے سادے
دیہاتیوں کے پاس ایک جٹادھاری سادھو
آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

منصور کچھ ہمت کر کے انّو کے پاس والی
سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی —— گاڑی
کشن گڑھ سے بھی چل پڑی۔ لیکن دونوں میں
سے کوئی بھی ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی
ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

اچانک انور نے اس کی طرف دیکھ کر
پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

منصور ابھی تک چُپ کے جزیرے میں
بھٹک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد منصور نے پوچھا "کہاں
جا رہی ہو؟"

"بڑودہ۔"

"اپنی سسرال۔"

اِس بار وہ خاموش رہی۔

منصور نے بچی کی طرف دیکھ کر کہا
"بہت پیاری بچی ہے۔"

انور اس بار بھی خاموش رہی —— ہاں
منصور کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی

منصور نے جھنجلا کر اس کی طرف سے
مُنہ پھیر لیا۔

انور نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا
"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"احمد آباد" منصور نے انور کی طرف
دیکھے بغیر جواب دیا "کل وہاں میری شادی
ہے۔"

"مبارک ہو۔" انور نے تھرتھراتی آواز
میں کہا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو!" منصور کی ہنسی
میں کھوکھلا پن تھا۔

منصور! ہو سکے تو میری تمام یادیں مجھے
لوٹا دو۔"

"کیوں لوٹا دوں؟ ان یادوں کو واپس
مانگنے کا حق تمھیں کس نے دیا؟"

انور نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کر منصور
کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے انور کے
چہرے کا سورج دھندلا گیا ہو۔ آنکھوں کی
کرنیں ماند پڑ رہی ہوں۔

وہ بولی "منصور! میں ان چھ برسوں
میں ہر پل، ہر سانس کچے دھاگوں کی طرح
ٹوٹی ہوں۔ کیا میں تمھیں وہی انّو نظر آتی ہوں؟
وقت کے بے رحم ہاتھوں نے تمھیں مجھ سے
چھین کر ایک کھوٹا سکہ میری جھولی میں
ڈال دیا۔ تم نے اپنے خط میں سچ ہی لکھا
تھا۔ اس بازار میں قیمت ہی معیار ہے۔"

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا ——
اس نے ایک پل کے لیے انور کی ویران
آنکھوں میں جھانکا، پھر اچانک کسی
فیصلہ کن جذبے کے تحت اُٹھ کر اپنا

خاموشی سے دیکھتی رہی۔

گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔
شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔

"سامان کیوں باندھ لیا؟" انور
نے پوچھا۔

"یہیں اُترنا ہے۔"

"احمد آباد تک نہیں چلو گے؟"

"نہیں —— دوسری گاڑی سے
واپس دہلی جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا ——
گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو انور کی
طرف دیکھے بغیر وہ چھوٹا سا ہولڈال
اور سوٹ کیس لے کر کمپارٹمنٹ سے نیچے
اُتر آیا۔

پلیٹ فارم پر سامان رکھ کر وہ
کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ——
تبھی گاڑی نے وسل دی ان دونوں کو
لگا جیسے سیٹی کی یہ تیز آواز انجن کے
سینے سے نہیں، اُن کا دل چیر کر
نکلی ہو۔

بھر لیا آنکھوں میں کل خواب کا منظر اُس نے
جانے کیا بات تھی چھوڑا نہیں بستر اُس نے

سرد تیروں کی ہے ہر سمت سے بارش اُس پر
دھوپ کو اوڑھ لیا ننگے بدن پر اُس نے

کیا سُنائے وہ ہمیں حالِ سفر صحرا کا؟
پاؤں رکھا ہے کبھی شہر کے باہر اُس نے؟

قتل کرتا رہا دن رات وہ لفظوں سے ہمیں
خون میں تر نہ کیا ہاتھ کا خنجر اُس نے

پیچھے اُس نے سُنے، رُک گیا وہ رستے میں
کبھی دیکھا ہی نہ تھا چڑیوں کا لشکر اُس نے

مجھ کو جانا تھا اندھیروں کے سفر پر اے فیضؔ
دے دی چلتے ہوئے اِک نور کی چادر اُس نے

جاوید اشرف فیضؔ اکبرآبادی

روزن کاٹیج، قربان اسٹریٹ، ہل سائڈ، پہاڑی ٹولی، رانچی ۸۳۴۰۰۱

انور باری

تعلّق کے نئے انداز سے خاکے بناتا ہے
کوئی دیوار چنتا ہے وہ دروازے بناتا ہے

گزر جاتی ہے اپنی حد سے جب آنگن کی تنہائی
لکیریں کھینچ کر کاغذ پہ گُل بوٹے بناتا ہے

سزا کا مستحق ٹھہرا ہے ہو کس لیے اس کو
حقیقت تم سمجھتے ہو وہ افسانے بناتا ہے

نتیجہ اپنی فنکاری کا ہے پیشِ نظر اس کے
مگر وہ پتّھروں کی زد میں آئینے بناتا ہے

لہو تو صاف ہو جائے گا سڑکوں کا مگر انورؔ
اسے بھی ذہن میں رکھو جو منصوبے بناتا ہے

۱۰۷، چھتّہ بھائی جان، کوچہ رحمٰن، چاندنی چوک، دہلی ۱۱۰۰۰۶

زنگوں کی یلغار سے ڈرنے والی میں
اپنی ہی تلوار سے مرنے والی میں

ناؤ ہوں میں اور پار اُترنے والا تُو
آگ کا دریا، اور گزرنے والی میں

تُو بیری طوفان ہے پت جھڑ پھول ہوں میں
تیرے تھپیڑے اور بکھرنے والی میں

اشکوں کا سیلاب، ڈبونے والا تُو
ڈوب ڈوب کے روز اُبھرنے والی میں

جھوٹے تیرے اعلان مری آزادی کے
زنجیروں کا لمس، بہرنے والی میں

عذرا پروین

۱۴/۲۰۱، عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ (یو۔پی)

تنہا، تمھارے ساتھ

تنہا، تمھارے ساتھ
کبھی کبھی تمھارے ساتھ تنہا ہوتے ہوئے
ڈر جاتا ہوں میں
سوچتا ہوں
شاید تم میرے متعلق کچھ جان نہ لو
اور ممکن ہے تم ایسے سوال پوچھ ڈالو
جن کے لیے میں تیار نہیں
اور شاید یہ ہمارے حسین رشتے کو ختم کر ڈالے

کیوں کہ جب ہم تنہا ہوتے ہیں
تو میں خود کو تم پہ اور بھی جتانا نہیں چاہتا
تب میرے تمام انحرافات کھو جاتے ہیں
اور تم میرے سامنے کھڑے ہوتے ہو
میں کبھی کبھی خوفزدہ ہو پڑتا ہوں
کہ کہیں میں تمھارے متعلق کچھ جان نہ لوں
ایسا کچھ جو مجھے پسند نہ آئے

کچھ ایسا جیسا میں دیکھنا بھی نہ چاہوں
کیوں کہ یہ میرے خواب بکھرا دے گا
اور بالکل اسی خوف کی وجہ سے
میں چاہتا ہوں تمھارے ساتھ تنہا ہونا
میں چاہتا ہوں اپنے خوف کا سامنا کرنا
میں دیکھنا چاہتا ہوں، تم کون ہو
میں تمھیں دکھانا چاہتا ہوں، میں کون ہوں
میں ان سب سوالوں سے اپنی دوستی کو دوچار کرنا چاہتا ہوں
جو ہمیں الگ بھی کر سکتے ہیں
اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہوتا ہے کیا
میرے پاس آؤ
ہم پیار کے ڈھنگ سیکھنا چاہتے ہیں
پیار جیسے خوف کا شائبہ تو ہے
لیکن دن بہ دن جو اسے زیر کرنے پہ
کمربستہ بھی ہے

(جرمن سے براہِ راست ترجمہ)

منشی پریم چند سے منسوب بعض تحریروں کے بارے میں

منشی پریم چند (۱۸۸۰ - ۱۹۳۶) اُردو کے بڑے مصنفین میں سے ہیں۔ انھوں نے ناول، افسانہ، ڈراما کے علاوہ ادب، تنقید، شخصیات، سماج، تہذیب، تعلیم، لسانیات، مسائل اور سیاست پر قابلِ قدر مضامین لکھے ہیں۔ ناول نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے انھیں بے پناہ شہرت اور مقبولیت ملی۔ اس نے ان کے دوسرے تمام کاموں اور کارناموں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے مصنف کے بارے میں اُردو میں تحقیقی نوعیت کا کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے۔ منشی پریم چند کے بارے میں سب سے پہلی کتاب جناب مدن گوپال کی تصنیف ہے جو انگریزی میں ہے اس کتاب میں اُن کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب پریم چند کو ایک ناول نگار کی حیثیت سے اور ڈاکٹر جعفر رضا کی دونوں کتابیں انھیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اور بنیادی طور پر تنقیدی کتابیں ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں پریم چند صدی تقریبات کے دوران بعض اصحاب نے پریم چند کی ذات اور شخصیت پر نازیبا حملے کیے جناب مانک ٹالا نے "پریم چند اور تصانیفِ پریم چند کچھ نئے تحقیقی گوشے۔ (۱۹۸۵ء) اور پریم چند کچھ نئے مباحث (۱۹۸۸ء) دو کتابیں شائع کر کے ان اعتراضات کے مُدلّل اور مسکت جواب دینے کے ساتھ ساتھ بعض نئے امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تحقیقی ہیں، اگرچہ اس تحقیق کی نوعیت دفاعی اور وضاحتی ہے، لیکن ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہندی میں پریم چند کے بارے میں تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کے کام کثرت سے ہوئے ہیں۔ پریم چند کے فرزند جناب امرت رائے کی کتاب "پریم چند ـــــ قلم کا سپاہی" تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بہت اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب پر مصنف کو ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔ تحقیقی نوعیت کا سب سے اچھا کام ہندی میں ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کا "پریم چند وشوکوش" (انسائیکلوپیڈیا) اور پریم چند ـــــ اپرابیہ ساہتیہ (پریم چند کا گم شدہ اور نایاب ادب) ہے۔

چند برس پہلے ساہتیہ اکادمی نے انعام یافتہ کتابوں کو مختلف ہندستانی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مجھے جناب امرت رائے کی کتاب "پریم چند ـــــ قلم کا سپاہی" کو اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں نے ترجمہ کر کے دے دیا ہے جو کتابت اور طباعت کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اسی دوران مجھے پریم چند کی دیگر تحریروں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو احساس ہوا کہ ان کی تحریروں کے بارے میں [illegible] اور ضرورت ہے۔

میں نے سب سے پہلے منشی پریم چند کے مضامین جمع کرنا شروع کیے۔ اُردو میں "مضامینِ پریم چند" مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس اور "مضامینِ پریم چند" مرتبہ عتیق احمد (شائع کردہ انجمن ترقی اُردو، کراچی) شائع ہو چکے ہیں۔ اوّل الذکر کتاب میں سترہ اور موخر الذکر میں چھوٹے بڑے ۲۶ مضامین ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مجموعے ان کے تمام مضامین کے حامل نہیں۔ کیوں کہ ان کے مقالات کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔

میں یہاں جس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ منشی پریم چند نے ناول اور افسانہ لکھنے سے پہلے مضامین لکھنا شروع کیے تھے۔ یہ مضامین اُردوئے معلی، زمانہ، مخزن، آزاد لاہور، ادیب، کہکشاں اور دوسرے معاصر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ لوگوں نے ان کی تحریریں جمع کرنا شروع کیں تو انھیں ان رسالوں میں بعض تحریریں د، ر کے نام کے تحت چھپی ہوئی ملیں۔ ان لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ د، ر مخفف ہے دھنپت رائے کا اور چوں کہ نواب رائے / پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا، اس لیے ان لوگوں نے د، ر کے تحت چھپی ہوئی تمام تحریریں منشی پریم چند کی جھولی میں ڈال دیں۔ میں نے بھی مضامین جمع کرتے وقت د، ر کے تحت چھپی ہوئی تمام تحریروں کے عکسی چربے حاصل کیے اور اسی خیال کے تحت حاصل کیے کہ یہ

شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی ۲۲۱۰۰۵

چھپے ہوئے مندرجہ ذیل مضامین اب تک دستیاب ہو چکے ہیں:

۱۔ آبشارِ نیاگرا' زمانہ جولائی ۱۹۰۷ء
۲۔ اردو ادب اور ناول' ادیب اگست ۱۹۱۰ء
۳۔ رامائن اور مہابھارت' زمانہ مئی جون' ۱۹۱۲ء
۴۔ ہندستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ' زمانہ جنوری' ۱۹۱۴ء
۵۔ اپنے فن کا استاد (ترجمہ) زمانہ ستمبر ۱۹۱۶ء
۶۔ زراعتی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ زمانہ مئی ۱۹۱۸ء
۷۔ دل شکن حادثے اور ہمارا فرض' زمانہ دسمبر ۱۹۲۷ء
۸۔ دوسری شادی' چندن ستمبر ۱۹۳۱ء

بیسویں صدی کے ابتدائی تین چار دہوں کے اُردو رسائل میں د' ر کے نام سے چھپے ہوئے مزید مضامین بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ بہر حال' ان مضامین کا بغور مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے سے مجھے جو باتیں کھٹکیں' وہ یہ ہیں'

اوّل یہ کہ منشی پریم چند دسمبر ۱۹۰۹ تک یعنی "سوزِ وطن" کے چھپنے تک نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے۔ ان کی سب سے پہلی تحریر" آلی ورکرام ویل" بنارس کے ہفتہ وار آوازۂ خلق میں ۸ر مئی سے ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۳ء تک بالاقساط نواب رائے بنارسی کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۸ر اکتوبر ۱۹۰۳ء کے شمارے سے تقریباً ڈیڑھ برس تک اسی اخبار ہوتا رہا۔ اس کی بعض قسطوں کے تحت مصنف کا نام نواب رائے بنارسی اور بعض قسطوں کے تحت نواب رائے الٰہ آبادی درج ہے چونکہ ۱۹۰۴ء میں وہ ٹیچرز ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں زیرِ تعلیم تھے' اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے خود اپنے نام کے ساتھ الٰہ آبادی یا الٰہ آباد لکھا ہو' یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدیر آوازۂ خلق نے ان کے نام کے ساتھ الٰہ آبادی لکھ دیا ہو کہ یہ قسطیں اُسے الہ آباد سے مل رہی تھیں۔

دوم یہ کہ زمانہ کے جولائی ۱۹۰۷ء کے شمارے میں دو مضمون شائع ہوئے ہیں۔ ایک "گیری بالڈی مصنفہ" نواب رائے اور دوسرا 'آبشارِ نیاگرا' مصنف د' ر۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ایک مصنف کسی رسالے کے ایک ہی شمارے میں اپنی ایک تحریر نواب رائے کے نام سے چھپوائے اور دوسری تحریر د' ر' کے نام سے۔ ہر مصنف اپنی تحریریں ایک ہی نام تخلص' یا عرف یا مخففات کے تحت چھپواتا ہے' بیک وقت دو ناموں کے تحت کوئی مصنف اپنی تحریریں نہیں چھپواتا۔ مزید برآں اس سے پہلے زمانے کے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ان کے دو مضامین راجہ ٹوڈر مل اور راجا جہان سنگھ' نواب رائے کے نام سے چھپتے تھے اور زمانہ اپریل ۱۹۱۱ء کے شمارے میں ان کے دو مضامین 'بیک اَبر' اور 'بہاری لال' پریم چند کے نام سے چھپے۔ چونکہ تصنیف و تالیف کا کام شہرت حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اور ہر مصنف خود کو ایک ہی نام سے علمی و ادبی دنیا میں معروف و مشہور کرتا ہے۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضا منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ ۱۳ر مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

" نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں کے لیے اس جہان سے گئے۔ دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے' مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون' خواہ کسی موضوع پر' ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ لکھوں' مجھے پہلے وہ فیض مآب جناب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا' اور مجھے چھٹے چھ ماہ سے لکھنا نہیں' یہ تو میرا روز کا دھندا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون صاحب والا کی خدمت میں پہنچے گا' تو وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام میرے سر تھوپا جائے گا۔ اس لیے کچھ دنوں کے لیے' نواب رائے' مرحوم ہوئے۔ ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔ آپ میرا مضمون کتابت کرانے کے بعد منشی چراغ علی کو دے دیا کریں گے۔"

پھر ستمبر ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں 'نواب رائے' کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی' وہ اکارت گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔"

ظاہر ہے کہ اگر وہ 'نواب رائے' کے ساتھ ساتھ د' ر' کے تحت بھی لکھتے رہے ہوتے تو یہاں اس کا اظہار ضرور کرتے اور کہتے کہ میں د' ر' کو بھی فروغ دیتا رہا ہوں۔

سوم یہ کہ نواب رائے/ پریم چند'

تھے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء کے "سوزِ وطن" کے قضیے کے بعد جب وہ کلکٹر کی اجازت کے بغیر نواب رائے کے نام سے کوئی تحریر شائع نہیں کرا سکتے تھے، تو د، ر، یعنی دھنپت رائے کے نام سے (جس نام سے وہ سرکاری ملازم تھے) کوئی تحریر کیسے اور کیوں شائع کراتے؟ حالانکہ د، ر کے نام کے تحت چھپی ہوئی اس کے بعد کی چھ تحریریں دستیاب ہو چکی ہیں۔

چہارم یہ کہ د، ر کے نام سے اگست ۱۹۱۰ء کے ادیب میں 'اردو ادب اور ناول' کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے:

"راقم کو بھی ان دنوں ناول نگاری کی دُھن سوار ہوئی تھی۔ شاعری کی طرح ناول نگاری بھی بیکاری کا مشغلہ ہو رہا تھا۔ ناول کے چند صفحے لے کر ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اپنے تئیں شاعر کہا کرتے تھے اور نثر میں بھی دعوائے کمال رکھتے تھے۔ نو مشق مصنفوں کو دادِ کلام لینے کا خبط ہوتا ہے۔ راقم کو بھی یہی ہوس ان کے پاس لے گئی۔"

۱۹۱۰ء تک ان کے تین ناول 'اسرارِ معابد'، 'کِشنا' اور 'ہم خُرما و ہم ثواب' شائع ہو چکے تھے۔ وہ یہ کیوں لکھتے کہ راقم کو بھی ان دنوں (اگست ۱۹۱۰ء میں) ناول نگاری کی دُھن سوار ہوئی۔ . . ناول کے چند صفحے لے کر ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابھی تک ہمیں اس کا کوئی علم نہیں کہ د، ر/ نواب رائے/ پریم چند اپنی تحریریں کسی کو بغرضِ اصلاح دکھلاتے ہوں۔

اور ہمارا فرض' مطبوعہ زمانہ دسمبر ۱۹۲۷ء کے نیچے 'د، ر، از انبالہ' لکھا ہوا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ د، ر/ دھنپت رائے/ نواب رائے/ پریم چند کا انبالہ سے کوئی تعلق کبھی نہیں رہا۔

اس ضمن میں یہ بھی خاطر نشین رہنا چاہیے کہ نواب رائے/ پریم چند کی کوئی ادبی تحریر سوائے نجی خطوط کے دھنپت رائے یا د، ر کے نام سے کبھی نہیں چھپی۔ ذاتی خطوط بھی دھنپت رائے کے نام سے تو ملے ہیں، د، ر کے نام سے کوئی خط نہیں ملتا۔

اِن شواہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ د، ر کے نام سے چھپنے والی تحریروں کے مصنف دھنپت رائے/ نواب رائے/ پریم چند نہیں کوئی اور صاحب ہیں۔ د، ر کے نام سے چھپنے والی ان تحریروں کے مصنف ایک دوسرے صاحب دھنپت رائے ہیں جو جناب مالک رام کے خُسرِ معظم تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈیفنس ڈپارٹمنٹ کی ڈیری فارم واقع انبالہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے پورے نام کے بجائے د، ر کے تحت مضامین لکھتے تھے۔ مالک رام صاحب نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ انھوں نے اپنے خُسرِ معظم جناب دھنپت رائے کی بعض مطبوعہ تحریریں دیکھی تھیں اور انھوں نے دو سال قبل اس ضمن میں ایک وضاحتی نوٹ 'ہماری زبان' میں شائع کرایا تھا۔

زمانہ مارچ ۱۹۲۷ء کے شمارے میں 'شادی کی وجہ' چھپا ہے۔ مصنف کا نام 'بمبوق' لکھا ہوا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ میں جب دھنپت رائے/ نواب رائے/ پریم چند ٹیچرز ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں زیرِ تعلیم تھے، تو ٹھٹھا کے مار کر ہنسنے کی وجہ سے وہ اپنے احباب کے حلقے میں 'بمبوق' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ شاید اسی لیے یہ مضمون پریم چند کی جھولی میں ڈالا گیا ہے۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ دھنپت رائے/ نواب رائے/ پریم چند نے اپنی کوئی تحریر بمبوق کے نام سے کبھی نہیں چھپوائی۔ اس نام سے انھوں نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ یہ مضمون منشی پریم چند کا نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مضمون کے آخر میں بمبوق کے ساتھ لکھا ہے (ایم، ایس، سی) ظاہر ہے کہ منشی پریم چند ایم، ایس سی نہ تھے۔ وہ بی اے تھے اور اُن کی متعدد تحریروں کے ساتھ پریم چند بی۔ اے لکھا ہوا ملتا ہے۔

اس گفتگو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ د، ر کے نام سے چھپی ہوئی تحریریں اگرچہ دھنپت رائے کی ہیں، لیکن یہ شخص دھنپت رائے/ نواب رائے/ پریم چند سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان تحریروں کو پریم چند کی تحریریں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح بمبوق کے نام سے چھپی ہوئی تحریر کو بھی پریم چند کی تحریر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بدلتے موسم کا غم

اور کپل خاموش تماشائی بن کر رہ گیا ہے۔

بالکل بے بس۔ لاچار و مجبور۔

اسے لگا تھا جیسے وہ اور مَوسی دریا کے دو کناروں پر کھڑے ہوں، دریا کے دو گھاٹ، جو آمنے سامنے تو رہتے ہیں لیکن مل نہیں سکتے ہیں۔

وہ اپنی بات کیسے سمجھائے اور کہے؟

ایک طرف، اس کی بیوی بچّے اس سے ناراض ـــــ دوسری طرف مَوسی خفا۔

ایک طرف اس کے بچّے اپنا پروگرام رد ہونے سے کھنچے کھنچے۔ دوسری طرف مَوسی کے بچّے چُپ چُپ خاموش خاموش۔

کپل نے بار بار اپنی مَوسی کی آنکھوں میں وہی ممتا، وہی پیار ڈھونڈنا چاہا۔ لیکن!

کپل کی ماں اور مَوسی سگی بہنیں تھیں۔ آشا اور سرلا۔ آشا کو کپل ہی پیدا ہوا تھا کہ ایک سفر کے دوران میں کپل کے پتا رمیش کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ رمیش کے پاس گاؤں میں کافی جائیداد تھی۔ لیکن اس کے مرتے ہی آشا اور کپل دونوں خاندان کے لیے بوجھ بن گئے۔ خاص طور پر رمیش کے بڑے بھائی کی آنکھ میں یہ دونوں کانٹا بن کر کھٹکنے لگے۔

آشا کچھ دنوں گاؤں میں رہ کر طرح طرح کے دکھ جھیلتی رہی لیکن کچھ عرصے بعد اس کو ٹی بی ہو گئی اور وہ بالکل لاچار و مجبور ہو گئی۔ اسی عالم میں ایک دن سرلا آ گئی۔ اسے آشا کی حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوا اور وہ اُسے اپنے ساتھ لے آئی۔

شہر لا کر، سرلا نے آشا کا کافی علاج کیا، لیکن وہ اس کو موت کے مُنہ سے نہیں بچا سکی۔

شاید آشا نے، موت کی آہٹ سُن لی تھی، مرنے سے چند روز پہلے، ایک روز اس نے کپل کو سرلا کی گود میں ڈال دیا۔

"تمھیں اپنی یہ امانت سونپ رہی ہوں۔ اسے اپنی ہی اولاد کی طرح سمجھنا اور الگ مت کرنا۔ جب یہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائے تو، تم خود اس کا بیاہ کر دینا۔ اس سے میری آتما کو شانتی مل جائے گی۔"

آشا اتنا کہہ کر چُپ ہو گئی لیکن خود سرلا کی آنکھوں سے دیر تک آنسو بہتے رہے۔

سرلا کے لیے، آشا کی یہ وصیت نبھانا، کانٹوں بھرا راستہ طے کرنا تھا۔ اس کے شوہر کی آمدنی محدود تھی اور کئی بچّوں کا خرچ ـــــ دن رات بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بڑھتا ہوا خرچ ـــــ لیکن وہ یہ سب باتیں کہہ کر آشا کو اور ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا تھا:

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی آشا! ویسے اطمینان رکھو، میں ایسا ہی کروں گی۔ اپنے جیتے جی کپل کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔"

آشا کی وصیت پوری کر رہی تھی۔ وہ کبھی اس کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے کپل کی اپنے بچّوں کی طرح ہی پرورش کی۔ اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ کبھی گاؤں سے اگر کوئی کپل کی خبر لینے آیا تو اس نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ گاؤں میں پڑھنے لکھنے کا مناسب انتظام نہیں ہے، وہاں جا کر اس کی پڑھائی لکھائی نہیں ہو سکے گی۔

کپل نے جب سے ہوش سنبھالا، اس نے ماں کی جگہ سرلا کو ہی دیکھا تھا اور اسی کو اپنی ماں سمجھتا تھا، سرلا بھی کپل کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتی۔ وہ خود تکلیف اُٹھا لیتی۔ اپنے بچّوں کے ساتھ زیادتی کر لیتی، لیکن کپل کو، ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتی اور اس کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھتی۔

سرلا کی ممتا کی چھاؤں تلے، آشا کا یہ ننھا سا پودا بہت جلد پروان چڑھ گیا۔

کپل نے بی اے پاس کر لیا اور جلد ہی اُسے نوکری بھی مل گئی تو سرلا نے کچھ دنوں بعد، کپل کے سامنے اس کی شادی کی بات پیش کر دی۔

"ابھی میری شادی کی کیا جلدی ہے؟"

کپل نے سر جھکا کر شرماتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

لیکن سرلا کو تو جلدی تھی، وہ چاہتی تھی کہ آشا کی آخری خواہش کے احترام میں، وہ کپل کا گھر بسا کر یہ فریضہ بھی اپنے ہاتھوں انجام دے دے۔ ساتھ ہی،

مقام و پوسٹ مانی کلاں، ضلع جونپور (یوپی)

اس بات کے لیے اس پر انگلی اٹھاتے کہ وہ بھانجے کی روٹی کھارہی ہے اس لیے اس نے کپل کے لیے دیپا کا رشتہ تلاش کرلیا اور اس کی شادی کرادی۔

جس دن، دیپا کے ساتھ کپل کے پھیرے ہوئے، اس دن سرلا اتنی خوش تھی، جیسے اُسے سات جہاں کی دولت مل گئی ہو بڑے ارمان سے، وہ نئی نویلی دیپا کو اپنے گھر لائی تھی۔

لیکن کبھی کبھی عین بہار میں ہی خزاں چھا جاتی ہے۔ اُدھر دیپا کے قدم گھر میں آئے، اِدھر سرلا ودھوا ہوگئی۔

ہوا یہ کہ سرلا کے پتی کا یکایک ہارٹ فیل ہوگیا دیکھتے ہی دیکھتے گھر کا نقشہ بدل گیا سرلا کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔

سرلا کے لیے دیپا کے قدم مبارک نہیں ثابت ہوئے، پھر بھی وہ کوئی ایسی بات زبان پر کبھی نہیں لائی۔ جس کو کپل اور دیپا محسوس کریں۔ لیکن دیپا اپنی نگاہ میں جیسے خود مجرم ہوگئی ہو۔ کچھ ہی دن میں وہ عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگی اور آخر ایک دن اس نے کپل سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"مجھے یہاں الجھن سی ہونے لگی ہے۔ میں بھی اب تمھارے ساتھ چل کر رہوں گی۔"

کپل کو دیپا کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی لیکن نئی نویلی بیوی سے وہ جھگڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے صرف "اچھا" کہہ کر بات ٹال دی تھی۔

یوں کپل بھی، گھر کے اداس ماحول کو چھن گیا ہو۔ سب کی دنیا اندھیری ہوگئی ہو۔ وہاں لوگوں کے چہروں پر خوشیوں کا گزر کیسے ہوتا!

کپل چاہتا تھا دیپا مَوسی کے ساتھ رہے۔ مَوسی کو سہارا دے، اس کا دُکھ بانٹے۔ اس کے من کا بوجھ ہلکا کرے لیکن دیپا کو تو جیسے وہاں کا ماحول کاٹنے لگا تھا۔

مَوسی، کریا کرم سے فارغ ہوگئی اور کپل اپنی نوکری پر جانے کے لیے تیار ہوا تو دیپا بھی اس کے ساتھ چلنے کے لیے اُڑ گئی۔

"ہاں تم، دیپا کو بھی لیتے جاؤ —— بیچاری یہاں جب سے آئی ہنسی کو بھی ترس گئی ہے۔"

کہنے کو تو سرلا نے کہا، لیکن اس نے شاید دیپا کے رویّے سے کچھ ایسا محسوس کرلیا تھا۔ مگر کپل اور دیپا جس وقت گھر سے نکلنے لگے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

اس دن کے بعد دیپا سرلا کے یہاں کبھی نہیں گئی۔ کپل کبھی کبھی چلا جاتا۔ دو ایک دن رکتا، پھر لوٹ آتا۔ پھر گھنٹہ، دو گھنٹہ کے لیے مَوسی کے یہاں اس کا جانا ہوجاتا۔ پھر یہ سلسلہ بھی دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا۔

اِدھر کپل ایک مدّت سے سرلا کے یہاں نہیں آیا تھا، بس کبھی کبھار اپنی خیریت لکھ بھیجتا۔ اس بیچ دیپا کو دو بیٹیاں پیدا ہوئیں پھر ایک چاند سا بیٹا بھی۔ سرلا یہ سب خبریں سُن سُن کر خوش ہوتی، اس کا جی چاہتا کسی طرح وہ اڑ کر کپل کے بچّوں تک پہنچ جائے اور انھیں اپنے کلیجے سے لگالے لیکن سفر اور سب سے بڑھ کر خرچ کا سوال تھا۔

وہ من مسوس کر رہ جاتی ——!

سرلا کبھی کبھی اپنے خط میں اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتی تو کپل بڑی فراخدلی سے لکھ دیتا:

"مَوسی! کیا کروں، مجھے تو بالکل فرصت نہیں ملتی ہے۔ ہاں تم، جب جی چاہے چلی آؤ۔ سب کو ساتھ لے آنا، خرچ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ سوچنا، بس چلی آنا۔"

سرلا کا من کپل کا خط پڑھ کر باغ باغ ہوجاتا اور وہ دیر تک سپنے دیکھتی رہتی۔

کپل کے یہاں جانے، اس کے بچّوں کو پیار کرنے، دیپا سے جی بھر باتیں کرنے اور کچھ دنوں، کپل اور دیپا کے ساتھ خوشی خوشی وقت گزارنے کے سپنے۔

زندگی میں کتنی ہی خوشیاں خواب کی سی ہوتی ہیں، پھر بھی ہم ان کے سہارے جیا کرتے ہیں۔

سرلا، کپل کے بچّوں کو دیکھنے کے لیے بے چین سی تھی۔ اور اب کے چھٹیوں میں جب اس کے بچّے اسکول سے خالی ہوئے تو وہ کپل اور دیپا سے ملنے چلی آئی۔

آنکھوں میں کتنے خواب، دل میں کتنی خوشیاں لیے وہ اپنے بچّوں کے ساتھ سورت آئی تھی۔

کپل اچانک اُسے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ اس کے بچّوں کو لپٹالے گا۔ وہ خود کپل کے بچّوں کو اپنی آغوش میں چھپا کر جی بھر کر پیار کرے گی —— اور دیپا اس کے قدموں سے لپٹ جائے گی۔

لیکن خوابوں کے یہ محل جیسے ایک ہی پل

میں ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں۔ سورت آنے، کپل اور دیپا سے ملنے، ان کے بچّوں کو دیکھنے کی خوشیاں جیسے بہت پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔

سورت آکر سرلا کو لگا تھا، جیسے وہ کپل، جس کی اس نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کی تھی۔ وہ دیپا، جس کو وہ اپنے گھر میں بہو بنا کر لائی تھی، وہ یہاں نہ ہوں۔

ہوا یہ تھا کہ سرلا جب اچانک سورت پہنچی، تب ہی دیپا اپنے بہن بہنوئی کے ساتھ رشی کیش جانے کو تیار تھی۔ وہ تو کہیے دیپا کے بہنوئی کو آنے اور خود کپل کو چھٹی ملنے میں کچھ دیر ہوئی ورنہ سرلا، جب یہاں پہنچی تو اُسے کوارٹر میں تالا لگا ملتا۔

حالانکہ کپل نے سرلا کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ اس کے بچّوں کو لپٹایا اور ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، لیکن دیپا اور اس کے بہن بہنوئی کو سرلا کا اس طرح اچانک پہنچ جانا عجیب سا لگا تھا۔

"موسی! آپ نے آنے سے پہلے ہمیں سُوچنا دے دی ہوتی۔" دیپا اور اس کی بہن نے دبی زبان میں کہہ دیا تھا۔

"بیٹا! کپل مجھے اکثر آنے کو لکھتا رہا۔ پھر میں تو اس گھر کو اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ اس لیے بنا سُوچنا دیے ہی چلی آئی۔"

سرلا نے دیپا کی بات محسوس کی۔ اس کی بہن، بہنوئی اور بچّوں کے رویّے سے اسے رنج پہنچا۔

سرلا کو بار بار اپنا زمانہ یاد آیا۔ اُن کے یہاں اگر کوئی مہمان آجاتا تو وہ اور اس کے پتی کتنے خوش ہوتے۔ اگر کوئی رشتے دار آجاتا تو اس کے پتی اکثر آفس سے چھٹی لے کر اس کی خدمت میں لگے رہتے۔

کہاں گئے وہ دن۔ جب اپنے پرائے میں بھی فرق نہیں تھا، مہمان کی آؤ بھگت ایک مذہبی اور اخلاقی فریضہ سمجھا جاتا تھا!

سرلا کو شدت سے آشا اور رمیش بھی یاد آئے۔ جب کبھی سرلا ان کے یہاں جاتی تو دونوں اس پر اپنی جان چھڑکتے اُسے بڑی محبت سے روکتے۔ اس کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن جتن کرتے۔

سرلا کا دل یہ ساری باتیں سوچ کر کُڑھتا اور دُکھتا رہتا مگر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تھا تو اس کی بڑی بیٹی مالا نے —— مالا کافی سمجھ دار تھی اور یونیورسٹی میں داخل ہو چکی تھی۔

"وہ زمانہ ختم ہو گیا ——" مالا اپنی ماں کی باتیں سن کر بول اٹھتی۔

"ماں اب ان پرانی باتوں کو چھوڑ دو، تب لوگوں کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ لوگ اطمینان سے ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے، اُٹھتے بیٹھتے، ملتے جلتے۔ سیر و تفریح کرتے۔۔۔"

"۔۔۔ مگر اب کس کے پاس وقت ہے کہ کوئی ذرا دیر کے لیے کسی کے پاس کھڑا بھی ہو جائے۔ کچھ دیر رُک کر کسی کا دُکھ درد پوچھ لے۔۔۔"

"۔۔۔ ہر آدمی جیسے مشین کا کوئی پُرزہ ہو، بے جان، لیکن مشغول و مصروف —— ہر شخص اپنے درد میں مبتلا ہے سب کے پاس اپنی مصروفیت ہے۔ اپنی ضرورت ہے۔ اپنے کام ہیں اور وہ انھیں پورا کرنے کے لیے وقت کے ساتھ بے تحاشہ دوڑ رہا ہے —— کدھر؟ اب شاید اُسے یہ بھی پتا نہیں ہے۔"

سرلا سمجھتی ہے، مالا کپل اور دیپا کی طرف دار ہے۔

مالا کہتی ہے:

"ہمیں سچ مچ، ان لوگوں کو سُوچنا دے کر ہی آنا تھا۔"

کیا واقعی یہ بات صحیح ہے؟

کیا اس نے سچ مچ غلطی کی ہے؟

سرلا سوچتی ہے —— اس کی سوچ بڑھ جاتی ہے —— لیکن، مالا کی باتیں، شاید اس کی سمجھ سے بالاتر ہیں!!

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

—— ادارہ

عزیز الحسن جعفری

صحافت پر مضامین کا سلسلہ —— ۲

خبروں کے سرچشمے

(اس سلسلے کا پہلا مضمون مارچ ۹۱ء کے 'ایوانِ اُردو' میں شائع ہو چکا ہے)

دنیا کے موجودہ سیاسی وسماجی نظام میں صحافیوں کو خبریں فراہم کرنے والے سرچشموں کی کمی نہیں ہے اگر کوئی خبر نگار/نامہ نگار اُن مراکز و ذرائع سے مسلسل روابط رکھے تو یومیہ خبروں کا ایک بڑا ذخیرہ حاصل کر سکتا ہے۔ ان میں مندرجۂ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ سرکاری دفاتر

مرکزی حکومت کا ایک شعبہ پریس انفارمیشن بیورو ہے، مخفف پی۔ آئی۔ بی (P.I.B.) ہے۔ اس کا مرکزی دفتر پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے زیرِ نگرانی نئی دہلی میں ہے۔ بعض بڑے شہروں مثلاً بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں بھی اس کے دفاتر ہیں۔ مرکزی وزرا کی تقاریر، بجٹ پیپر اور دیگر سرکاری دستاویزوں کے لیے نامہ نگار کا انحصار انھی دفاتر پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پی۔ آئی۔ بی۔ دفتر —— صدر جمہوریہ یا وزیرِ اعظم کی متوقع تقریر کا متن اہم اخبار نویسوں کو قبل از وقت تقسیم کر دیتے ہیں۔

ہر صوبائی حکومت میں نشریات و اطلاعات کے ذرائع سے روابط رکھنے کے لیے ایک مکمل شعبہ ہوتا ہے۔ عموماً ضلع کے صدر دفتر میں بھی اس کی شاخیں ہوتی ہیں۔ یہ شعبے صوبائی حکومت کی کارکردگی کو نمایاں کرنے میں کافی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ شعبے نامہ نگاروں کو وزرا کی تقاریر کا متن اور بجٹ اور بل سے متعلق اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ مگر مرکزی اور ریاستی وزرا اپنی تقریروں کے دوران اہم اعلانات بھی کرتے ہیں چنانچہ خبر نگار کسی بھی ایسے جلسے کو نظر انداز نہیں کرتے، جس میں کسی وزیر کو تقریر کرنی ہوتی ہے۔

مرکز اور صوبے کے سکریٹریٹ اور ضلع کے انفارمیشن آفس سے نامہ نگار کے لیے خبریں حاصل کرنا آسان ہے۔ عدالتوں سے بھی اہم خبریں حاصل ہو جاتی ہیں۔ عدالتی کارروائی اور فیصلوں میں خبری مواد موجود ہوتا ہے۔ پولیس کا محکمہ بھی خبر نگاروں کے لیے خبروں کا اہم وسیلہ ہے۔ اہم شخصیات کی موت اور صحت سے متعلق خبریں حاصل کرنے کے لیے اسپتال کے ڈاکٹروں اور منتظمین سے ربط رکھنا چاہیے۔ آتش نشان (فائر برگیڈ) آفس سے آتش زنی کے سانحات کی تفصیلات حاصل ہو سکتی ہیں۔

۲۔ سیاسی اور نیم سرکاری ادارے

صدر جمہوریۂ ہند کی رہائش گاہ —— راشٹرپتی بھون، صوبائی گورنر کی رہائش گاہ —— راج بھون، وزیرِ اعظم کے دفتر اور دیگر وزرا کے دفتروں میں خبروں کے چشمے اُبلتے ہی رہتے ہیں۔ مرکز میں لوک سبھا اور راجیہ سبھا اور صوبوں میں اسمبلیوں اور کونسلوں سے اہم خبریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ مقامی طور پر میونسپل کارپوریشن، میونسپل بورڈ، ضلع پریشد، پنچایت۔ بورڈ، ڈولپمنٹ کمیٹی، یونیورسٹی، ٹرسٹ جیسے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے خبروں کا مآخذ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اداروں میں رابطۂ عامہ افسران متعین کر دیے گئے ہیں جو نامہ نگاروں کو خبریں اور خبروں سے متعلق تفاصیل مہیا کر دیتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے دفتروں میں اکثر چہل پہل رہتی ہے۔ اگر ان سیاسی پارٹیوں کے وفاتر سے رابطہ رکھا جائے تو خبر کے لیے اہم نکات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ سرکاری افسران، غیر ملکی سفیر یا دیگر اہم شخصیات خطاب کرتے ہیں تو وہاں خبریں سر اُبھارے رہتی ہیں، کیوں کہ ایسی شخصیات کے مُنہ سے اکثر ایسی باتیں ادا ہو جاتی ہیں جن میں بھرپور خبری مواد ہوتا ہے۔ ریلوے کے اہم دفاتر، سرکاری روڈویز اور ایئر لائنز کے مقامی دفتروں سے بھی ایسی خبریں مل سکتی ہیں جن کی اشاعت عوام کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

۳۔ سماجی ومعاشی تنظیمیں اور ادارے

عموماً ہر شہر میں مذہبی اور سماجی انجمنیں ہوتی ہیں، ان کے علاوہ طلبا یونین، ٹریڈ یونین اور مزدور یونین جیسی تنظیمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ان تنظیموں سے خبر نگار کے دوستانہ تعلقات مفید ثابت ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں اسٹاک ایکسچینج، چیمبر آف کامرس اور ایسی ہی تجارتی تنظیموں سے تجارت و صنعت سے متعلق خبریں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

آج کل خبروں کا سرچشمہ صنعتی اداروں کے شعبۂ اطلاعات بھی ہیں۔ یہ اطلاعاتی شعبے —— نئی تنصیبات، پیداوار، اور اس کی مقدار اور قسم سے متعلق صحافیوں کی گزارشات کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ وسیع تجارتی اور صنعتی مراکز میں تو شعبۂ روابط عمومی کے ساتھ شعبۂ اشتہارات و نشریات بھی ہوتے ہیں، جن کا کام دنیائے صحافت کی مدد سے اپنی مصنوعات و خدمات کی تشہیر و توصیف ہوتا ہے۔

تقریباً ہر تنصیب یا تنظیم میں کم از کم ایک شخص پروپیگنڈہ کرنے والے عہدے پر مامور ہوتا ہے۔ اس کا اہم کام تنظیم و تنصیب کی مشتہری اور اس کو عوام میں روشناس کرانا نیز اپنی تنظیم سے متعلق اخبار کے تراشوں کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے —— خبر نگار ان کی اس خواہش سے فائدہ اٹھا کر خبروں کے ذخیرے میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر بڑے تاجروں، صنعت کاروں، سائنسدانوں، عظیم کھلاڑیوں، فلمی ستاروں، مذہبی پیشواؤں، ممبران پارلیمنٹ، ممبران اسمبلی اور دیگر قائدین کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی جائے تو نامہ نگاروں کو بہت عمدہ خبریں مل جاتی ہیں۔ مختلف مذہبی اداروں، مدرسوں، مسجدوں، آشرموں، مندروں، گرجا گھروں اور گرودواروں سے بھی ایسی اطلاعات مل جاتی ہیں جن کی بنیاد پر گزارش تیار کی جا سکے۔

تفریحی و ثقافتی خبریں

موسیقی، ڈراما، فلم اور رقص جیسے فنون کی مہارت رکھنے والے افراد اخبار کے لیے ضروری مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو عجیب و غریب اور نایاب اشیا مثلاً ڈاک ٹکٹ، ماچس کے لیبل، سکے، قدیم رسالے وغیرہ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایسے افراد سے خبر نگار مستفید ہو سکتا ہے۔ شہر میں اگر عجائب گھر، چڑیا گھر تحفظ آثارِ قدیمہ کا دفتر ہو تو اُن کے افسران کے ذریعے ایسی اطلاعات فراہم ہو سکتی ہیں جو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔

نامہ نگار کو یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ خبر کے سرچشمے صرف اسی کی پیاس بجھاتے ہیں جو مضطرب و متفکر ہو۔ مذکورہ بالا تشریح میں خبر کے سارے سرچشموں کو نہیں سمویا جا سکا ہے تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لاپروا اور کاہل نامہ نگار ان کے علاوہ ہزاروں خبر کے آبشاروں کا علم رکھ کر بھی فیضیاب نہیں ہو سکتا ہے۔

کی ایک نمایاں پہچان بن گئی ہے۔ کہانی کہنے کے آرٹ کی تازگی، دلکشی اور جامعیت کہانی کی واپسی کی صورت میں ان افسانوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

—— عزیز پریہار

شعبۂ انگریزی، گورنمنٹ کالج، لدھیانہ ۱۴۱۰۰۱

نئی مطبوعات

اپنی اپنی زنجیر

مصنف : ستیہ پال آنند
قیمت : ۵۰ روپے
پبلشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

زیرِ نظر کتاب ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کی دو نمایاں خوبیاں ہیں ان کا کہانی پن اور تنوع۔ آنند کو احساس اور مشاہدے کو کہانی بنانے کا ہنر آتا ہے۔ وہ سلیس اور سادہ نثر میں واقعے کے بیان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ آنند کے افسانے مشاہدات کے نئے معیار قائم کرنے کے علاوہ کرداروں اور ان کے دائرۂ عمل نیسز ٹریٹمنٹ کو ایک منفرد جہت عطا کرتے ہیں۔

EMPATHY کا رجحان "اپنی اپنی زنجیر" کے افسانوں کا غالب رجحان ہے۔ افسانوں کا مبصّر OMNISCIENT ہے جو صحیح اور غلط کے امتیاز کی بشارت دیتا ہے۔ عام انسانی ہمدردی کا جذبہ مجموعے میں شامل سبھی افسانوں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انسان کی ناقدری اور محرومی آنند کے ہاں محض ایک فرد کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے سماج کا مسئلہ ہے۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں کے کیف و کم سے پوری طرح واقف ہے۔ اس کا پرتو "اپنی اپنی زنجیر" "ملنگ اور کمبل" "مٹی کے کھلونے" میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

افسانہ نگار نے فنی مطالبات کو کہیں نظر انداز نہیں کیا۔ افسانوں کی فضا ایک دم الگ ہے۔ اگرچہ افسانوں کے موضوع بڑے نہیں لیکن انھیں پیش کرنے کا انداز متنوع ہے۔ غیر اہم دکھائی دینے والے واقعات پر افسانہ نگار کی نظر گہری ہے۔ جن واقعات سے افسانہ نگار نے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا ہے وہ واقعات زندگی اور سماج کی مختلف جہتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے بعض افسانے بے حد دلچسپ ہیں۔ ان کے مطالعے سے افسانہ نگار کی فنی چابک دستی اور زبان پر قدرت کا پتا چلتا ہے۔ مزاح کا عنصر ان افسانوں کا ایک ایسا وصف ہے جو کرداروں کے خدوخال اور ان کی نفسیات کو بھرپور انداز سے ابھارنے میں معاونت کرتا ہے۔ افسانہ "ملنگ اور کمبل" اس جملے پر ختم ہوتا ہے "جاتے ہوئے وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کمبل کو ٹانگیں لگ گئی ہوں۔" اس نوع کی اور بہت سی مثالیں ان افسانوں میں مل جائیں گی۔

یہ افسانے جتنے دلچسپ اور خوبصورت ہیں اتنے خوب سیرت بھی ہیں۔ ان کی ارضی فضا اس امر کی غمّاز ہے کہ افسانہ نگار معاشرے کی خامیوں کے تئیں بیدار ہے۔ یہ بیداری احساسِ جمال میں اس طرح مدغم ہوگئی ہے کہ ارضی رومانیت ڈاکٹر آنند کی افسانوی دنیا

بدلتے موسم کی آہٹ

شاعر: اشہر ہاشمی
قیمت: ۲۲ روپے
ناشر: رائٹرز سرکل ہوڑہ، ۹ سری ناتھ پوریل لین، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱ (مغربی بنگال)

اشہر ہاشمی کی غزلیہ شاعری احساس کی شاعری ہے۔ اس کے احساس کے آئینے میں غمِ ذات زیادہ ہے اور غمِ کائنات کم۔ وہ اپنے احساسات کا ایک کھردری سادگی کے ساتھ اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اس شاعری میں وہ شعلہ افشانی نہیں ہے جو مایوسیوں اور محرومیوں کے بیچ پلنے والے ایک شاعر کے یہاں ہوتی ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ شعلہ افشانی سے احتراز شعوری ہے یا لاشعوری۔ شاعری میں شعلہ افشانی پر اصرار کرنا کچھ مناسب نہیں ہے لیکن زیادہ احتیاط برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شاعری بہت دیر تک قاری کا ساتھ نہیں دے پاتی یا بالفاظ دیگر قاری کے احساس کو وہ زبان نہیں دے پاتی جس کا وہ متلاشی ہے۔ اس شاعری سے اشہر اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں دور ٹمٹماتے کسی چراغ کی طرح تو رہ سکتے ہیں لیکن نشانِ راہ کے طور پر نہیں۔ اشہر کے یہاں کسے بندھے مصرعے، لہجہ اور اسلوب اس بات کا اشارہ

ہے کہ وہ فنّی پختگی کی منزل سے آگے نکل چکے
ہیں۔ اب اس کے آگے وہ منزل دشوار ہے
جس کے اِدھر اور اُدھر کے درمیان ایک پُل
صراط حائل ہے اس تخلیقی وژن کی، جس کے
بغیر شاعر اپنے عہد میں جیتا ہے اور اپنے عہد
سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ
اس پُل صراط کو پار کرنے میں کتنی جانفشانی
دکھا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے اشہر
کو اس بھیڑ سے باہر نکلنا ہوگا جس میں وہ
اور ان کی طرح بہت سارے باصلاحیت شاعر
ابھی سانس لے رہے ہیں۔ اشہر کو اس بات کا
احساس ہے کہ وہ بھیڑ کے ساتھ نہیں چل سکتے:

میں دے رہا ہوں تغافل کو راہ دانستہ
کہ بھیڑ آگے بڑھے اور راستہ بدلوں

"بدلتے موسم کی آہٹ" اس شاعر کا
نقشِ اوّل ہے سو یہ کسی اثبات و نفی کے لیے
ناکافی ہے۔ البتہ اشہر کا یہ تخلیقی جوش اگر
ایک تازہ کار تخلیقی وژن کے ساتھ شیر و شکر
ہو جائے تو اس سے شاعر کے مستقبل کا قیاس کیا
جا سکتا ہے۔

اشہر کے یہاں شکست اور مایوسی کی
جو ہلکی سی پرچھائیں نظر آتی ہے وہ اس کے اثباتِ یقین سے
زیادہ گھنی معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بلند خوابوں سے رکھ پائے تال میل کہاں
خمیدہ پشت کے قابو میں ایسے کھیل کہاں

سناٹا ہی سناٹا، تنہائی ہی تنہائی
دیواریں ہی دیواریں کیا جانے کدھر کیا تھا

آنکھوں میں چنگاری ہے

اتنے اُونچے تھے دام خوابوں کے
آنکھیں لوٹیں دُکان سے خالی

لمس، تنہائی، موج، ہوا، خواب، سفر،
سراب، موجود، غائب ——— اشہر کی شاعری
کے کلیدی الفاظ ہیں۔ ان لفظوں کے کولاج سے
جو ادھوری پوری تصویر بنتی ہے وہ اشہر کی
شاعری ہے۔

——— خورشید اکرم

پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

آواز کا سایہ

شاعر: محمد عبدالقادر ادیب
صفحات: ۱۰۴
قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کا پتا: (مصنف) ۲۹، سی۔ ایم۔ ایچ روڈ،
سیکنڈ اسٹیج، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

"بنگلور" کو ہندستان کا "وینس" کہا گیا
ہے۔ اس شہر کی شادابی، قدرتی مناظر کی
دل فریبی اور رہن سہن کی شائستگی قابلِ تعریف
ہے۔

زیرِ نظر کتاب ادیب صاحب کی غزلوں
اور نظموں پر مشتمل ہے، جو کرناٹک اُردو اکادمی
کی مالی معاونت سے شائع ہوئی ہے کتاب پر
محمود ایاز اور حمید الماس کی مختصر مگر جامع آرا
بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ جہاں تک ادیب
صاحب کی نظموں کا تعلق ہے وہ مختصر ضرور ہیں
مگر پُر معنی اور دعوتِ فکر کی حامل ہیں۔ ان
کی نظموں کے موضوعات میں تنوع بھی ملتا ہے۔
ان کی ایک نظم "راشہر" ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے

روش در روش
پھول، پتّے، شجر
جن میں شامل ہے
میرا بھی خونِ جگر
اِس دمکتے ہوئے آئینے پر
نہ برسیں کبھی نفرتوں کے، عداوت کے سنگِ گراں
اور تعصّب کا کالا دھواں بھی نہ پھیلے کہ شہر میں
یہ زمیں سازشوں کی خزاں سے بچے
اور مہکتی رہے

مندرجہ بالا نظم ہندستان کے موجودہ ماحول
میں ایک امن پسند انسان کے جذبات کی
مُنہ بولتی تصویر ہے۔

ادیب صاحب کی ایک اور نظم "غنچوں
کی چٹک" ملاحظہ فرمائیے جو مستقبل کے اندیشوں
کا واضح اشاریہ ہے:

یہ ہل چل
یہ بے تابیاں
اور غنچوں میں سرگوشیاں کس لیے ہیں
یہی سلسلہ
اور کچھ دن چلے تو
نہ جانے
وہ کس دن دھماکہ بنیں

ادیب صاحب کی غزلوں میں اکثر اشعار
ایسے ہیں جو ان کی شناخت قائم کرتے ہیں:

جب تجھے رات کے زینے سے اُترتے دیکھا
شب کی راہوں سے اُجالوں کو گزرتے دیکھا

گزرے ہیں جب سے زاویۂ آگہی سے ہم

سورج کے باوجود اندھیرا ہے ہر طرف
کیسا ہے یہ نظام، زمانہ خراب ہے

کتاب کا سرِ ورق اور کتابت وطباعت خوبصورت ہے۔

—— دلیپ بادل

۴۲۵، چراغ دِلّی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

پتھروں میں پھول

شاعر : میکش اجمیری
صفحات : ۹۶
قیمت : ۲۰ روپے
ناشر : ساغر کدہ نماہیڑہ، ضلع چتوڑ (راجستھان)

"پتھروں میں پھول" میکش اجمیری کی غزلوں کا مجموعہ ہے میکش صاحب مشہور شاعر ساغر اجمیری مرحوم کے فرزند ہیں اور شاعری انھیں ورثے میں ملی ہے میکش کی شاعری روایت، جدت اور ترقی پسندی کا امتزاج ہے۔ اُن کے اشعار میں رومانیت کے عناصر کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ حقائق بھی نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا کی طرح وہ انقلاب اور محنت کشوں کی حمایت کرتے ہیں:

یہ سرد سرد ہوا کہہ رہی ہے لوگوں سے
لہو میں گرمی لیے انقلاب آئے گا

میکش اجمیری روایتی شعرا کی طرح زندگی سے مایوس نہیں ہیں اور ایوانِ روح میں اُمیدوں کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں:

ضرور ظلمتِ شب کا جواب آئے گا
نیا سویرا لیے آفتاب آئے گا

ہمدردی ہے:

اُڑ اُڑ کے کر رہی ہے بیاں ظلم آگ کے
محنت کشوں کی بستی کے جلتے گھروں کی خاک

میکش اجمیری کو اپنے اجداد کی روایت پر ناز ہے اور وہ اس ورثے کو اپنے فرزند کو سونپ دینے کے بعد مطمئن ہیں:

میرا بیٹا میرے والد کے لہو کا ہے امیں
جو بھی پوچھے گا وہ با صدِ ادب پوچھے گا

فسادات نے ہر ذی شعور کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے میکش اجمیری فسادات کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں:

قاتلوں کو پناہ میں لے کر
زندگی لے رہی ہے موت سے داد
لوگ سنتے ہی کانپ جاتے ہیں
پوچھیے مت فساد کی روداد

میکش اجمیری خانقاہِ عشق کے درویش ہیں اور اسی لیے اُن کی شاعری میں عشق کا غلبہ ہے:

کچھ دنوں تک ہے عمر کا زنداں
عشق کی قید تو ہے بے میعاد

عشق کا کھیل ہے شطرنج نہیں ہے میکش
تم سمجھ بوجھ کے ہر خانے پہ مہرے رکھنا

میکش کی غزلوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ جدت بھی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

روشنی کے واسطے سورج کو جب جب دی صدا
دھوپ کا سایہ اندھیرے گھر کے نیچے آگیا

اُمید ہے کہ پتھروں میں پھول کھلانے والے میکش اجمیری کا یہ مجموعہ شائقینِ ادب کے ذہنوں کو معطر کرے گا۔

—— اسد رضا

پیاسے لوگ

مصنف : ممتاز شارق
صفحات : ۸۸
قیمت : ۱۰ روپے
ناشر : ادارہ "بزم" آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۲۱۱۰ (بہار)

"پیاسے لوگ" ممتاز شارق کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہم ان افسانوں کو ۲ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں وہ افسانے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا فرسٹیشن ہے اور دوسرے حصے میں ان افسانوں کو رکھا جاسکتا ہے جن میں راوی روزگار حاصل کرنے کے بعد نت نئے تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ افسانے اظہار و بیان کے لحاظ سے ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے بلکہ یہ روایتی پیرایۂ بیان کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

"پیاسے لوگ" کے افسانوں میں تین افسانوں کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکتا ہے جو قاری کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ "بھابی" "امانت" اور "مسیحا کی موت"۔ انسان اپنے آپ میں کتنا پُر اسرار ہے اور ساتھ ہی حالات کے شکنجے میں کس طرح جکڑا ہوا ہے۔ "بھابی" اور "مسیحا کی موت" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ "کینچلی اتارا ہوا سانپ" اور "دھوپ میں چمکتی ریت" بھی اچھے افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ یہاں فنکار خود غرضی کے درمیان گھٹن محسوس کرتا ہے۔ ظاہر اور باطن کا تضاد، عیاری، ریاکاری اور اخلاقی زوال

بن جاتے ہیں۔
زبان اور محاورے سے افسانہ نگار کی لاپروائی قاری کو گراں گزرتی ہے۔ یہ ایسی کوتاہی ہے جو نئی نسل کے بیشتر افسانہ نگاروں میں پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں درج ہیں:
کافی دوڑ دھوپ، پیسہ خرچ کرکے، سفارش بھڑا کر مکھیا نے نہر کھدوانے کا ٹھیکہ حاصل کر ہی لیا۔
(پیاسے لوگ)

مرنے والے شخص کے لواحقین کو قصاص کی صورت میں ایک لاکھ ریال دینا ہوگا اور یہ رقم ایک ہفتے کے اندر دینا ہوگا۔
(مسیحا کی موت)

اس کے چھوٹے بیٹے رضوان کی معصوم آواز آسیب کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔
(مسیحا کی موت)

یہاں آسیب کا گونجنا محل نظر ہے۔
اس کے باوجود "پیاسے لوگ" کے افسانوں میں آشوب زندگی کی بڑی تیکھی، بھرپور اور سہ پہلو تصویریں نظر آتی ہیں۔ خوبصورت سرورق، ڈیمائی سائز اور اوسط درجے کی طباعت کے ساتھ دس روپے میں یہ مجموعہ مہنگا نہیں ہے۔

——— ساغر برنی

صدر شعبۂ اردو، بی۔ وی۔ ہاریکھ، جتنا کالج، جمشید پور

نرخنامہ اشتہارات

ایوانِ اُردو اور اُمنگ

ایک صفحہ ———	ایک ہزار روپے
آدھا صفحہ ———	چھ سو روپے
سرورق، دوسرا صفحہ ———	سترہ سو روپے
سرورق، تیسرا صفحہ ———	چودہ سو روپے

اشتہارات کے ساتھ، نرخنامے کے مطابق معاوضے کی رقم کا ڈرافٹ بھی بھجوائیں جو "سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی" کے نام ہو۔ رقم صرف ڈرافٹ ہی سے بھجوائیں، چیک یا منی آرڈر سے نہیں۔
مخربِ اخلاق اشتہارات قبول نہیں کیے جائیں گے۔

اشتہارات اور ڈرافٹ اس پتے پر ارسال کریں:

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی ——— گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اُردو خبر نامہ

سالانہ جلسہ راجستھان اُردو اکادمی

راجستھان اُردو اکادمی کا سالانہ جلسہ
سوچنا کیندر، جے پور میں منعقد ہوا۔ جلسے کی
صدارت محترمہ گرجا ویاس صاحبہ، ڈپٹی منسٹر
اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے کی۔ ڈاکٹر
ثاقب رضوی چیئرمین راجستھان اُردو اکادمی نے
مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
سیکریٹری راجستھان اُردو اکادمی نے ۹۱-۹۰ء
کی رپورٹ پیش کی۔

سیکریٹری کی رپورٹ کے بعد اکادمی کی
جانب سے حسبِ ذیل شعرا و ادبا کو اعزاز سے
نوازا گیا:

(۱) جناب ممتاز راشد (۲) مولانا عبدالخالق
خلیق (۳) جناب مہدی ٹونکی (۴) جناب حبیب کیفی۔
اعزاز پانے والوں کو صدرِ جلسہ ڈاکٹر گرجا ویاس نے
شال اُڑھایا اور توصیف ناموں کے علاوہ انعامی
رقومات کے چیک پیش کیے۔ توصیف نامے
جلسے کے کنوینر جناب خداداد خاں مونس نے
پڑھ کر سنائے اور ڈاکٹر رضوی صاحب نے اعزاز
یافتگان کی گل پوشی کی۔ اس کے بعد جناب ساجد
علی ٹونکی کی تصنیف "ہندستانی اقتصادی مسائل"
پر اکادمی کی جانب سے مبلغ دو ہزار روپے کا
چیک پیش کیا گیا۔ جلسے کی کارروائی کو آگے
بڑھاتے ہوئے جناب خداداد خاں مونس نے
کتابوں کی رسم اجرا کا اعلان کیا اور اکادمی کی
حسبِ ذیل کتابوں کی رونمائی کی گئی:

(۱) تاریخ جنگ آزادی، مصنف مولانا
قمر واحدی (۲) آئینہ، مصنف موہن لال کول
(۳) خوابوں کی دھنک، مصنف نسیم اجمیری
(۴) تذکرہ شعرائے جودھپور، مصنف شین
کاف نظام۔ مونوگراف، جناب لکشمی نرائن فارغ۔
مونوگراف، جناب شمیم جے پوری۔ مونوگراف،
جناب مخمور سعیدی۔

ان کتابوں کے علاوہ راجستھان اُردو
اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی جانے والی
حسبِ ذیل تصانیف کا اجرا بھی عمل میں آیا:
(۱) سنگ زر، مصنف ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
(۲) کلام حسین، مصنف حسین کوثری (۳) خلش
نیم شب، مصنف حضور احمد شفق (۴) پتھروں
میں پھول، مصنف میکش اجمیری۔

مہمانانِ گرامی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور
جناب شریف الحسن نقوی نے مختصراً اپنے
تاثرات کا اظہار فرمایا۔ صدرِ جلسہ ڈاکٹر گرجا
ویاس نے اُردو سے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار
کرتے ہوئے کہا کہ دُور درشن اور آکاش وانی
میں اُردو کو اس کا مقام دیا جائے گا اور اس
کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

اس سالانہ جلسے کے موقع پر اکادمی کے
اوّلین چیئرمین الحاج مولانا قمر واحدی کی یاد میں
صبح ساڑھے نو بجے ایک آل انڈیا سمینار منعقد
کیا گیا جس کا موضوع تھا "مولانا قمر واحدی
شخصیت اور علمی و ادبی خدمات" سمینار کی صدارت
ڈاکٹر خلیق انجم نے کی اور مہمانِ خصوصی کی
حیثیت سے جناب ماہر آزاد ایم۔ ایل۔ اے
اور جناب شریف الحسن نقوی سمینار میں شریک
ہوئے۔ حسبِ ذیل حضرات نے مولانا قمر واحدی
کی حیات شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں پر
اپنے مقالے پیش کیے: (۱) جناب بشیر الدین
قریشی (۲) جناب مختار الرحمٰن راہی (۳) ڈاکٹر
محمد علی زیدی (۴) ڈاکٹر فیروز احمد (۵) جناب
شریف الحسن نقوی۔

صدرِ جلسہ جناب خلیق انجم نے مقالات
پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا قمر واحدی کی علمی و
ادبی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مولانا قمر واحدی کی یاد میں رات ½9
بجے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت
مولانا عبدالخالق خلیق نے کی اور نظامت کے
فرائض اکادمی کے رکن جناب شین کاف نظام
نے انجام دیے۔ (محمد یوسف)

کتابوں کا اجرا

معروف ادیب و شاعر رفعت سروش کی
نئی کتاب "قلم کے صفیر" کا اجرا اُردو گھر، نئی دہلی
میں عمل میں آیا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر ظہیر احمد
صدیقی نے کی۔ جلسے میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے
منتخب اور معتبر ادیبوں، دانشوروں اور شائقین
اُردو نے شرکت کی۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے
ڈاکٹر گرجا ویاس (نائب وزیر اطلاعات و نشریات)
نے رفعت سروش کو مبارکباد دی اور کہا کہ میں
ریڈیو پر ان کی آواز سے برسوں سے آشنا ہوں۔
انھوں نے نظم، غزل، اوپیرا، بیلے، ڈرامے، ناول
سب کچھ لکھا ہے اور پھر ریڈیو کی مصروفات،

مگر قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں ایک توازن ہے۔

صدرِ جلسہ پروفیسر اشتیاق عابدی نے کہا کہ مختلف اصنافِ ادب میں نت نئے تجربات کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ رفعت سروش کا تخلیقی سفر ہمہ جہت ہے اور انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا ایسا مثبت رویّہ ہے جو آج کے مسائل سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے اور یہ رویّہ اور جذبہ نئی نسل میں منتقل ہونا چاہیے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رفعت صاحب سے اپنی طویل رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جیسے نیاز فتح پوری کا ایک نام "نگار" تھا اور نگار کا ایک نام نیاز فتح پوری، اسی طرح میرے اور بہت سے اُردو والوں کے نزدیک رفعت سروش کا ایک نام اردو مجلس تھا، اور اُردو مجلس کا ایک نام رفعت سروش۔ ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد رفعت صاحب نے نثر کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور یکے بعد دیگرے اُن کی پانچ کتابیں آگئیں۔ بحیثیت شاعر تو وہ اپنا مقام پہلے ہی بنا چکے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے رفعت سروش کی حق گوئی و بیباکی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے یہاں یادوں کا قیمتی سرمایہ ہے جسے وہ بہ حسن و خوبی اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں اور ایسا مواد تاریخ ادب کی ترتیب کے لیے بے حد ضروری ہے، مشہور شاعر بیکل اُتساہی نے بے تکلف انداز میں کہا کہ رفعت اپنا یار ہے اور ایسا فنکار جس کی زنبیل میں سب کچھ ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے اس موقع پر ایک خاکہ پڑھا جس میں انھوں نے رفعت صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

لندن سے آئے ہوئے ادیب ڈاکٹر ضیاالدین شکیب نے کہا کہ میڈیا سے متعلق ہونے کے باعث ان کی نثر میں شگفتگی اور خوبصورتی ہے۔ م۔ م۔ راجندر نے رفعت سروش کو ہمہ صفت اور ہشت پہلو شخصیت قرار دیا۔ ابوالفیض سحر نے کہا کہ رفعت سروش کی فکر تازہ اور نظر وسیع ہے۔

○

اندور کے شری مایا ہوٹل کے کانفرنس ہال میں پروفیسر مختار شمیم کے تحقیقی مقالے "ظہیر دہلوی" کی اشاعت کے سلسلے میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ محترمہ شفیقہ فرحت نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ مختار شمیم نے بڑی محنت سے کام کیا ہے ان کا مقالہ عمدہ اور معیاری مقالوں میں شمار کیا جائے گا۔

ڈاکٹر عزیز اندوری، پروفیسر اسعد احمد عباسی، محترمہ ریحانہ نظام، جناب نظام الدین اور جسٹس غیور قریشی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر نلنی ریواڑیکر نے جناب مختار شمیم کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "انھوں نے ہمارے کالج کا نام روشن کیا ہے"۔ ڈاکٹر مسز کشور سلطان نے اس جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(کشور سلطان)

○

ہوٹل ڈپلومیٹ، قلابہ بمبئی میں نوجوان طنز و مزاح نگار فیاض احمد فیضی کے طنزیہ و مزاحیہ مجموعے "قند و زقند" کی رسم اجرا پروفیسر جاوید خاں، وزیر ہاؤسنگ حکومتِ مہاراشٹر کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں "شگوفہ" حیدرآباد کے مُدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، بمبئی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس وی۔ ایس۔ دیشپانڈے اور کوکن مرکنٹائل کوآپریٹو بینک کے چیئرمین جناب علی ایم شمسی تشریف فرما تھے۔ جلسے کی نظامت پروفیسر انور ظہیر نے کی۔ تقریب کا اہتمام بمبئی شہر کی چار نمائندہ ادبی انجمنوں، زندہ دلانِ بمبئی، ادارہ ہم سب، کردار آرٹ اکادمی اور تکمیل رائٹرس گروپ نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔

○

کاسموپالیٹن ویلفیئر ایسوسی ایشن مدراس کا ایک جلسہ بمقام راجا انا ملے ہال میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں تین کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔۔۔

پہلی کتاب علیم صبا نویدی کی غزلیات کا مجموعہ "اثر خامہ" کی رسم اجرا جناب راز امتیاز، ایڈیٹر روزنامہ "سالار" بنگلور نے انجام دی۔ دوسری کتاب ساغر جیدی کے دوہوں کے مجموعے کا اجرا بدستِ ڈاکٹر نذیر محمد عمل میں آیا۔ تیسری کتاب "روشن لکیر" (علیم صبا نویدی کی ہائیکو نظموں پر مشاہیرِ ادب کے مضامین کا مجموعہ) کی رونمائی ایم۔ بشیر احمد، ایڈوکیٹ بنگلور نے کی۔

جلسے میں مدراس، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے ادبا و شعرا اور باذوق حضرات نے شرکت کی۔

(شیخ عبداللطیف)

اقرا کلچرل سوسائٹی کی جانب سے
مُفت اُردو کوچنگ کلاسیز

گذشتہ سال کی طرح امسال بھی اقرا کلچرل سوسائٹی سکندرآباد کی جانب سے جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات ابتدائی، ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل، معلّم اُردو

...ے مفت کوچنگ کلاسیز کا اہتمام کیا گیا ہے۔
...سیں ۱۶ ستمبر ۱۹۹۱ء سے اقرأ پبلک اسکول، محلہ
...مداران، سکندرآباد میں شروع کی جائیں گی۔
...نریشن کی آخری تاریخ یکم ستمبر ہے۔

(حافظ شفاعت خاں بستوی)

ہندستانی تناظر
اب خریدا جاسکتا ہے

مشہور مزاح نگار جناب دلیپ سنگھ کی
...رت میں وزارت خارجہ کے پبلسٹی ڈویژن کا
...ہو یہ انگریزی ماہنامہ "انڈیا پرسپیکٹوز" نکلتا
...۔ اور اسی کا اردو ایڈیشن "ہندستانی تناظر"
...ں پچھلے کچھ ماہ سے شائع ہو رہا ہے اور ملک
...باہر تقسیم کیا جاتا ہے۔

اردو کے قارئین کا اصرار تھا کہ "ہندستانی
...ظر" کی فروخت کا سلسلہ ہندستان میں شروع
...جائے۔ اس تجویز کو منسٹری نے منظور کرلیا ہے۔
...ں کے ایک شمارے کی قیمت پانچ روپے اور
...لانہ چندہ پچاس روپے ہے۔ اس رقم کا
...افٹ یا منی آرڈر سینٹرل نیوز ایجنسی ۲۳/۹۰
...ات سرکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ کو بھیج کر یہ رسالہ
...ریعہ ڈاک حاصل کیا جاسکتا ہے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ابھی حضرت شعری بھوپالی کے انتقال کا
...م تازہ تھا کہ ایک اور اندوہناک خبر ملی ۲۴
...ولائی کو اردو کے ایک اور محترم شاعر، شعری
...صاحب کے ہموطن اور ہمعصر حضرت کیف
بھوپالی نے اپنے آبائی وطن بھوپال میں داعیِ اجل
کو لبیک کہا۔ کیف صاحب ڈیڑھ دو سال سے
بیمار تھے۔ انھیں گلے کے کینسر کا عارضہ لاحق تھا۔
انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۱ سال تھی۔ پسماندگان
میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔

کیف صاحب قادر الکلام شاعر تھے اور
شاعری کی سبھی اصناف میں پوری دستگاہ رکھتے
تھے۔ انھیں عام طور پر لوگوں نے ان کی غزلوں
سے پہچانا جو لہجے کی تازگی اور توانائی کی بڑی
اچھی مثال پیش کرتی تھیں اور جنھیں کیف
صاحب اپنے قلندرانہ انداز اور سحرآفریں ترنم
کے ساتھ پڑھتے تو مشاعرے کی فضا پر چھا
جاتے۔ لیکن کیف صاحب ایک اچھے نظم گو
بھی تھے۔ انھوں نے رباعیاں بھی لکھی ہیں اور
قطعے بھی اور ان میں بھی اپنا خاص رنگ و آہنگ
قائم رکھا ہے۔ ان کی موضوعاتی اور فرمائشی
چیزیں بھی شعری محاسن سے خالی نہیں ہوتی
تھیں جس کی ایک حالیہ مثال شری راجیو گاندھی
کی زندگی اور ان کے کاموں پر ان کی طویل نظم
ہے جو مثنوی کے فارم میں ہے۔ انھوں نے
بے شمار گیت جن میں فلمی گیت بھی ہیں، سہرے،
سہاگ اور مبارکبادیاں وغیرہ بھی لکھیں اور
یہاں بھی اپنی طبیعت کے جوہر خوب خوب
نمایاں کیے۔ ان کے گیت زیادہ تر مزدوروں،
کسانوں اور سماج کے دوسرے پسماندہ طبقوں
کی زندگی پر ہیں اور ان کی انسانی دردمندی
کا موثر شاعرانہ اظہار ہیں۔

کیف صاحب کی وضع زندگی رندانہ
اور فقیرانہ تھی۔ انھیں دیکھ کر بے ساختہ یہ
مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا تھا:

"آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے"

لیکن اپنی تمامتر آوارگی اور رسوائی کے باوجود
وہ ایک ایسا کارنامہ انجام دے گئے ہیں جو
انشاءاللہ دین دنیا دونوں میں ان کی سرخ روئی
کا ضامن بنے گا۔ انھوں نے کلام پاک کے
۲۸ پاروں کا منظوم ترجمہ اس خوبی سے کیا
ہے کہ باید و شاید۔ اس کام کو ان کی بظاہر
رائیگاں زندگی کا حاصل کہا جائے تو بے جا
نہ ہوگا۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ
ہمارے ہاں شاعرانہ شہرت اور ناموری پانے
کے لیے بہت سے غیر شاعرانہ اور بسا اوقات
غیر شریفانہ توڑ جوڑ کرنے پڑجاتے ہیں۔
کیف صاحب ان باتوں کے اہل نہیں تھے
اس لیے ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا خاطر خواہ
اعتراف ان کی زندگی میں نہیں ہوا لیکن اب
اس گوہر گم شدہ کی بازیافت ضروری ہے۔
کیف صاحب اپنے عہد کے قابلِ لحاظ شاعر
تھے اور تاریخ ادب اردو میں ان کی جگہ
محفوظ ہونی چاہیے۔

پڑوسی ملک پاکستان میں بھی تین اہم
شعرا پچھلے دنوں خالقِ حقیقی سے جاملے۔ عزیز
حامد مدنی کا نام پچھلے چالیس سال سے اردو
ادب کے افق پر ایک تابناک ستارے کی طرح
روشن تھا۔ وہ ۱۵ جون ۱۹۲۲ء کو متحدہ
ہندستان کے شہر رائے پور میں پیدا ہوئے تھے
اور انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ایک کالج
میں لکچرر ہوگئے تھے۔ بعد میں وہ ریڈیو پاکستان
میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور وہیں سے
وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔
ان کے تین شعری مجموعے اور دو نثری کتابیں
شائع ہوئی ہیں۔ انھوں نے کئی قد آور معاصرین

(بقیہ ص۵۵ پر)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اگست ۱۹۹۱ء کے "ایوانِ اردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

مٹ نہ پائی بھوک جب پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں سے
آگئے فٹ پاتھ پر روٹی اگانے گاؤں سے (م۔ اسلم انصاری)

مرسلہ: زین اللہ صدیقی جلال پوری، عقب اسٹیٹ بینک، گاندھی نگر، بستی ۲۷۲۰۰۱

...رہ جھلتے ہیں اور چین پاتی ہے دُنیا
...ملتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دُنیا (حالی)

مرسلہ: محمد عارف انصاری، برہانپور

...زندگی تیرے تقاضے اگر آساں ہوتے
کتنے آباد جزیرے ہیں جو ویراں ہوتے (سید ضمیر جعفری)

مرسلہ: محمد رشید قریشی، پلامو

...س سمت کوچ کرنے سے پہلے یہ سوچ لو
...ستے میں ایک شہر ستمگر بھی آئے گا (نامعلوم)

مرسلہ: سدید مرزا، حیدرآباد

...ر بھر چلنے کا حاصل دست و بازو کی تھکن
...ردکی لذت بہت تیکھی، مداوا کچھ نہیں (ناہی انصاری)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا، صاحب گنج

...ہت اداس ہوا تو مری اداسی نے
...ملے شہر میں کچھ رابطے تلاش کیے (انعام الدین انعام)

مرسلہ: نکہت ناز، صاحب گنج

ہاتھ کی لکیروں سے فیصلہ نہیں ہوتا
عزم کا بھی حصہ ہے زندگی بنانے میں (نامعلوم)

مرسلہ: سید امیر حیدر، صفی پور شریف

مجھ سے بے سود نہ اے گردشِ ایام اُلجھ
میں نے ہر رنگ میں جینے کی قسم کھائی ہے (نامعلوم)

مرسلہ: محمد فیروز رحمٰن، بھاگلپور

اس درجہ مصائب کے جہنم میں جلا ہوں
اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا (منوّر رانا)

مرسلہ: شبنم ناز صدیقی، بھاگلپور

وقت کی دھوپ ہمیں جذب نہ کر پائے گی
ہم وہ قطرے ہیں جو سورج کو نگل جاتے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ: نذیر احمد حشمی، صفی پور شریف۔
حامد مرزا، حیدرآباد، ثروت حسین، احمدآباد
ایم۔ صابر آزاد، صاحب گنج، محمد صدیق، علی گڑھ، محمد طارق شمیم، بھاگلپور

سفر میں مرحلے اکثر بہت مشکل بھی آتے ہیں
قدم بڑھتے رہیں تو فاصلے کم ہوتے جاتے ہیں (محمود سعیدی)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

مختصر یہ کہ اسی طرح جھلستے رہیے
ابر آنے سے رہا دھوپ بھی ڈھلنے سے رہی (محسن زیدی)

مرسلہ: ناصر حسین، برہان پور

عزت نہ پا سکو گے بزرگوں کے نام سے
جانیں گے لوگ تم کو تمھارے ہی کام سے (ڈاکٹر زبیر)

مرسلہ: منصور حسین، برہان پور

رب کی دھرتی بہت بڑی ہے
اسی میں ہم سب کی روزی ہے (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: شائستہ، شیر گھاٹی

کانٹوں بھری راہوں پہ نہ گھبرا کے رکو تم
منزل تو ملے گی انھیں راہوں سے گزر کے (پرویز عارفی)

مرسلہ: وسیم اختر، جونپور

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے (راحت اندوری)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

گھر میں مجبور رہا ایک ہی چہرہ لے کر
سیکڑوں چہروں میں بٹتا رہا سڑکوں پر (اطہر نفیس)

مرسلہ: ابوذر ہاشمی، بھلائی نگر درگ

جس روز مرے ہاتھ میں چھالا نہیں آتا
منہ تک مرے بچوں کے نوالا نہیں آتا (جلیل طالب اندوری)

مرسلہ: رئیس احمد احسان اللہ انصاری، برہانپور

پیٹ کی خاطر انسانوں نے
حیوانوں سے درس لیا ہے (عادل منصوری)

مرسلہ: عظمت ناصری، بھیونڈی

جانور کی طرح جیتا ہوں نہ کچھ کہتا ہوں
زندگی تیرے لیے کتنا ستم سہتا ہوں (ریحان ناصر)

مرسلہ: استحسان افروز، ناگپور

کانٹوں میں پھول ہنستے ہیں تم غم میں خوش رہو
یہ زندگی عذاب نہیں ہے ثواب ہے (غافل دہلوی)

مرسلہ: مسز ونود، دہلی

امرت بھی زہر ہو گیا ہے اہلِ عیش کو
محنت کشوں نے زہر کو امرت بنا لیا (غافل دہلوی)

مرسلہ: مسز پرمود، دہلی

ری دنیا کا یا رب عجب حال ہے
دمی بھی نہیں آدمی کی طرح (افسر حمزہ پوری)

مرسلہ: اقبال حسین، جمشید پور

یہ آزادیِ بھارت کی ہے تصویر یہی
انے دیکھا تھا جو خواب اس کی تعبیر یہی ہے (علی احمد جلیلی)

مرسلہ: نوید مرزا، حیدر آباد

ب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
ں کس طرح سے اُس کو ستاتی ہے مفلسی (نظیر اکبر آبادی)

مرسلہ: محمد تاج، جھریا

تے مرتے بھی ہم مسکراتے رہے
ہ لیا ہم نے تیرا بھرم زندگی (شمیم جے پوری)

مرسلہ: بطیع الرحمٰن، جمشید پور

"جینے کے لیے" (مسرور جہاں کا ناول)

مرسلہ: عابد عتیق (بیڑ)

"پیشہ" (عابد سرتی کا ناول)

مرسلہ: محمد شمیم انصاری (گیا)

"کڑی دھوپ کا سفر" (وحید انجم کا افسانوی مجموعہ)

مرسلہ: سید عظیم احسان (گلبرگہ)

"زندگی کا سفر" (عادل رشید کا ناول)

مرسلہ: محمد خالد عمران (بھاگلپور)

"ہم تم ایک جیسے" (عمر فاروق قاسمی کا ڈراما)

مرسلہ: محمود الحسن انصاری (بھتیا)

"خدا کی بستی" (شوکت صدیقی کا ناول)

مرسلہ: محمد سعید احمد قائد (دہلی)

"جانور سے انسان تک" (اندر جیت لال کا مزاحیوں کا مجموعہ)

مرسلہ: معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

"عزم کے سپاہی" (احسان اللہ عمیر کی نظم)

مرسلہ: غازی اسلام (کٹیہار)

نثری عنوانات

آخرِ شب کے ہمسفر" (قرۃ العین حیدر کا ناول)
مرسلہ: محمد صدیق، معرفت ڈاکٹر
شرف الدین، محلہ مدپورہ، نزد ریلوے
اسٹیشن، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)

طے شدہ سمت کے مسافر" (انجم عثمانی کا افسانہ)
مرسلہ: محمد عمران صدیقی، معرفت محمد مسلم صدیقی،
بدر الحسین لین، حسین پور (ویسٹ)
بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

نت ومشقت" (اقبال کی نظم)
مرسلہ: محمد حسان (مظفر پور)، ارشد
یونس (بیگوسرائے)

وزی کا سوال" (واجدہ تبسم کا افسانہ)
مرسلہ: احسان اللہ عمیر (لہریا سرائے)
محمد داؤد احمد صدیقی (بھاگلپور)۔

بقیہ: اُردو خبر نامہ

کی موجودگی میں ہمعصر اُردو شاعری میں اپنے لیے ایک ممتاز جگہ بنائی جو ان کی شاعرانہ انفرادیت کی دلیل ہے۔

سیف زلفی بھی متحدہ ہندستان کی پیداوار تھے اور تقسیم کے بعد اپنے آبائی شہر بریلی کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے — وہ غزل میں ایک خاص رنگ و آہنگ کے مالک تھے اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔

عالمتاب تشنہ ادبی رسائل کے حوالے سے بھی جانے جاتے تھے اور مشاعروں کے بھی مردِ میداں تھے۔ پاکستان اور متحدہ عرب امارات کے بعض مشاعروں میں راقم الحروف کو ان کی رفاقت میسر آئی۔ بہت خوش اخلاق اور دوستدار انسان تھے۔ کہتے بھی خوب تھے اور پڑھنے کا انداز بھی متاثر کن تھا۔

ہم ان مرحومین کے لیے دعاے مغفرت کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اُردو دُنیا ان کے نام اور کام کو زندہ رکھے گی۔

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اُردو" جولائی ۱۹۹۱ء باصرہ نواز ہوا۔ سبھی مضامین بصیرت افروز ہیں۔ افسانوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ البتہ جناب سلمان کرہانی کا انشائیہ معیاری نہیں ہے۔ پریہ درشی ٹھاکر خیال کے شعری مجموعہ "دھوپ" "تتلی" "پھول" پر جناب گوپی چند نارنگ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔

—— اقبال حسن آزاد، مونگیر

○ جولائی ۹۱ء کے شمارے میں جلیل تنویر کا افسانہ "تسلسل" پڑھا۔ موصوف نے اچھا طنز کیا ہے۔ محترمہ بانو سرتاج کا افسانہ "تین بوڑھے" بھی اچھا ہے۔

—— شمس الدین چودھری، گلبرگہ

○ جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مضامین میں "ہندو پاک میں اُردو کی بدلتی ہوئی صورتِ حال" پر ڈاکٹر تش مرزا کا لکھا ہوا مضمون پسند آیا۔ پاکستان کے بیشتر تخلیق کاروں کے افسانوں، ڈراموں، ناولوں میں پنجابی، پشتو کے محاورات اور الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہند میں اُردو ادب میں ہندی انگریزی الفاظ تو ہوتے ہیں لیکن ضرورت کے پیشِ نظر۔

افسانوں میں بانو سرتاج کا لکھا افسانہ "تین بوڑھے" کافی نفسیاتی اور جذباتی آہنگ کا تھا۔ خشک موضوع ہو کر بھی لطف دے گیا۔

—— ریاض احمد، کُرلا

○ جولائی کے شمارے میں مشمولہ چاروں مضامین سے میں اچھا خاصا متاثر اور محظوظ ہوا ہوں۔ جہاں "ہائیکو" بہت دنوں بعد پڑھ کر خوشی ہوئی وہاں "ڈائرکٹ... ٹرا" بڑھ کر بوریت محسوس ہوئی۔ عزیز الحسن جعفری سے کہیے کہ وہ مزید مضامین صحافت کے عملی پہلوؤں سے متعلق "ایوانِ اُردو" کے لیے تحریر کریں۔

—— محمد ابراہیم صدیقی، الہ آباد

○ "ایوانِ اُردو" کے جولائی ۹۱ء کے شمارے میں شجاع خاور کی غزل نظر سے گزری۔ حسبِ عادت موصوف کے "نوٹ" سے واسطہ پڑا۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ شاعری کا تعلق ادبِ عالیہ سے ہے۔ اس طرح ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنی شاعری کے بارے میں سنجیدہ رہیں اس کے ساتھ کھلواڑ نہ کریں۔ ہم اتنے مجبور نہیں کہ زیرِ تصرف بحروں میں غیر مکتبی، غیر ادبی اور غلط العام لفظوں کے بغیر کام نہ چلا سکیں۔

اس غزل میں تو شجاع خاور حد سے تجاوز کر گئے۔ غیر ادبی کام تو کیا ہی ساتھ ہی قرآن کے پارے کے نام میں اتنی بڑی ترمیم کر ڈالی۔ سَیَقُول (متفاعِل) کو سیقول (فعلان) میں بدل ڈالا۔ معاذ اللہ۔

میں شجاع خاور سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے اس رویے کو ترک کر دیں۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔

—— محمد احمد رمز، دہلی

○ "ایوانِ اُردو" کی وساطت سے یہ مضمون شجاع خاور تک پہنچانا چاہتا ہوں کیوں کہ خاور صاحب کا کلام جولائی ۱۹۹۱ء ایوان ہی کے توسط سے نظر نواز ہوا ہے۔ اُمید کہ اس کی اشاعت فرما کر دیانت کے تقاضوں کو پورا کریں گے

خاور صاحب! اگر آپ مومن ہیں تو آپ کا ایمان قرآن پر ضرور ہونا چاہیے۔ ارشاد ربانی ہے لَا تَبْدِیلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ط اللہ کے کلام میں کوئی تبدیلی نہیں اور آپ زبردستی فعلان کے وزن پر سَیَقُول کو کسنا چاہ رہے ہیں آپ کو یہ بھی پتا نہیں کہ "س" حرفِ استقبال ہے جس نے یقول پر داخل ہو کر فعل کو مستقبل کے معنیٰ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور یقول کی "ی" بھی حرف ہے اور جملہ حروف مبنیات میں سے ہیں:

معرب آں باشد کہ گردد باربار
مبنی آں باشد کہ ماند برقرار

اگر "ی" کو آپ ساکن کرتے ہیں تو پھر یقول کو "س" ہٹا کر کس طرح استعمال کریں گے یہ تو تحلیل صرف کی بحث ہے مگر مومن کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ قرآن ہے ضرورت شعری تو کوئی چیز نہیں جان کی قیمت پر بھی یہ تبدیلی گوارہ نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس شعر کو ضائع کر کے استغفار کر لیں۔

—— غفران احمد، گریڈیہہ

○ اس شمارے کے "حرفِ آغاز" نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس سے آپ کے ناروے اور ڈنمارک کے سفر کا دلچسپ لیکن بہت مختصر حال معلوم ہوا۔ اُردو کے تعلق سے بھی کچھ باتوں کا علم ہوا۔ کاش آپ بھرپور سفر نامہ تحریر کرتے تو اور زیادہ لطف اندوز ہوتا۔* جہاں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان دونوں ملکوں میں اُردو پہنچ

* ارادہ تو ہے —— محمود سعیدی

چکی ہے اور آہستہ آہستہ اپنا رنگ جمارہی ہے
یہ جان کر افسوس ہوا کہ :

"مشاعروں میں زیادہ گہری دلچسپی پاکستانی حضرات کو ہے کوپن ہیگن میں سنگھ صاحب اور چاند شکلا صاحب اور اوسلو میں چاؤلہ صاحب کے علاوہ ایسے ہندوستانی کم نظر آئے جو اُردو سے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہوں۔ ہندستانی برادری میں اُردو زبان و ادب کا جو تھوڑا بہت چرچا ہے وہ انھیں حضرات کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔"

آپ کا یہ لکھنا درست ہے :

"اُردو پاکستان کی سرکاری زبان ہے لیکن اس زبان نے برّصغیر کے جن خطّوں میں جنم لیا اور پروان چڑھی وہ آج بھی ہندستان کا حصہ ہیں اس زبان سے بے اعتنائی اپنی ایک ایسی قیمتی میراث سے بے اعتنائی ہوگی جس کی قدر و منزلت اب عالمی سطح پر تسلیم کی جاچکی ہے ماضی میں اس بے اعتنائی کے جو بھی اسباب رہے ہوں لیکن اب اس کی تلافی ضروری ہے۔"

لیکن آپ کی اس بات پر یقین کرنے کی خواہش کے باوجود کیوں کر یقین کروں ؟ کہ :

"اندرون ہندستان تلافی کا یہ عمل شروع ہوچکا ہے۔"

اس لیے کہ آپ ہی کے شہر کے مشہور ماہنامہ 'آجکل' کے مدیر محترم محبوب الرحمٰن فاروقی نے اسی ماہ کے اداریہ میں یہ افسوسناک اطلاع دی ہے :

"مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہورہا ہے کہ دلّی جیسے شہر میں جہاں تعلیمی نقطۂ نگاہ سے تین مرکزی یونیورسٹیاں اور مرکز کے تحت ایک یونیورسٹی ہے، جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی بہت وسیع پیمانے پر اُردو کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے، جہاں اُردو کے پروفیسران، ادیب، شعرا اور ناقدین کی بہت بڑی تعداد رہتی ہے۔ دلّی جو اُردو کا گہوارہ رہی ہے اور جہاں کی زبان سند کا درجہ رکھتی ہے اور جہاں اہلِ زبان اپنی زباں دانی پر فخر کرتے رہے ہیں آج اسی دلّی میں اُردو رسالے خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد ڈو سو سے زیادہ نہیں۔ بس یہی صورتِ حال علی گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی اور دیگر مقامات کی بھی ہے۔"

یہاں فاروقی صاحب نے تو صرف ایک ہی افسوسناک پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ حقیقت میں کئی ایسے پہلو ہیں جو غمناک بھی ہیں اور شرمناک بھی ہیں کاش اُردو والے اپنا جائزہ لیں اور اپنے حقوق کے بجائے مادری زبان کے حقوق اور اپنے فرائض کو سمجھیں۔

—— عبدالقوی دسنوی، بھوپال

○ تازے شمارے میں "حرفِ آغاز" کے تحت جناب مخمور سعیدی کے تاثرات دیکھے۔ ایسا تو اکثر ہوتا رہا ہے کہ سامنے کی اور اپنی ہی چیز کو ہم نظر انداز کر جایا کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا یقینی طور پر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اُردو زبان اپنے ہی گھر میں بے گھر ہوتی جارہی ہے۔ اِدھر ایک بڑی سازش کے تحت ریڈیو سے بھی اسے باہر کر دینے کی تیاریاں کی جارہی ہیں اور آگے بھی اس کے خلاف کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اُردو والے کیا کررہے ہیں۔ کیا ہم سب کے لیے یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے ؟ یہ بات طے ہے کہ اب بھی اگر ہمیں ہوش نہیں آیا تو کم از کم ہندستان میں تو ہمیں اُردو سے محروم ہوجانا پڑے گا اور آنے والی نسلیں اس شرمناک بے حسی کے لیے کبھی معاف نہیں کریں گی۔

—— حبیب کیفی، جودھپور

○ "ایوانِ اُردو" شمارہ اگست ۹۱ء نظر سے گزرا۔ اس خبر سے خوشی ہوئی کہ آپ اوسلو اور کوپن ہیگن کا سفر کر آئے۔ غیر ممالک کا سفر کبھی صرف ترقی پسند شعرا تک محدود تھا اور وہ بھی ارض ماسکو تک۔ لیکن اب اُردو ادب کا دائرہ انگلینڈ، ناروے، امریکا اور کناڈا تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اُردو جہاں پیدا ہوئی اور پھلی پھولی انھی علاقوں میں بیگانہ ہوتی جارہی ہے۔

میں نے ہمیشہ آپ کو ایک دیانت دار اور منصف مزاج ادیب پایا ہے جب بھی ہمارے درمیان سے کوئی فنکار رخصت ہوتا ہے آپ اس پر بہت ایمانداری کے ساتھ اپنا قلم اُٹھاتے ہیں۔ شعری بھوپالی کے انتقال پر بھی آپ کی متوازن رائے نظر سے گزری شعری بھوپالی کے بعد کیف بھوپالی بھی انتقال کر گئے۔ کیف بھوپالی ایک ذہین اور باکمال شاعر تھے لیکن شراب نے اُن کو ڈس لیا۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن ترقی پسندوں کی طرح اُن میں تنگ نظری نہیں تھی وہ نئے لکھنے والوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خود بھی نیا کہنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے ترقی پسند حلقوں میں اُن کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ بھوپال میں اُن سے کم تر درجے کے شعرا روس کا سفر کر آئے لیکن اُن کو یہ موقع نہیں دیا گیا۔

سرحد پار کے کچھ معتبر اور اہم شاعر بھی رخصت ہوئے لیکن وہاں کی خبریں ہم تک دیر سے پہنچتی ہیں۔ عزیز حامد مدنی، سیف زلفی اور

عالمتاب تشنہ انتقال کر گئے۔ عزیز حامد مدنی کا تعلق مدھیہ پردیش کے شہر رائے پور سے تھا۔ اُن کا شعر:

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خدوخال سے بھی گئے

اُردو حلقوں میں بہت مقبول تھا۔

سیف زلفی کا تعلق بریلی سے تھا اُن کا شعر:

زلفی وہ سرزمیں کہ جہاں ذہنِ فنِ شکیب
وہ کیوں نہ اہلِ فن کے لیے محترم بنے

شکیب جلالی مرحوم سے اُن کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

——— خلیل تنویر، اودے پور

شعری صاحب کے بعد کیف بھوپالی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی ایک غزل (میرے خیال میں ابھی غیر مطبوعہ ہے) ارسالِ خدمت ہے۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے، جن دنوں میری پوسٹنگ دھار میں تھی۔ فلم پاکیزہ ریلیز ہوئی تھی اور کیف صاحب کے گانے مقبول ہو رہے تھے۔ کیف صاحب روٹری کلب کی دعوت پر دھار تشریف لاتے تھے۔ میرے یہاں پندرہ بیس روز ان کا قیام رہا تھا۔ انھیں میں نے اس وقت نزدیک سے دیکھا۔ بلاناغہ فجر اور عصر کی نماز پڑھتے۔ ہر شام اپنی رنگین بناتے اور باقی وقت مطالعے کی نذر کرتے۔ ایک دن وہ ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ میں نے کاغذ پر لکیریں کھینچیں اور ان کا اسکیچ تیار ہوگیا، کیف صاحب کو دکھایا تو بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر فکر میں غلطاں رہے اور ایک غزل اسی کاغذ پر بقلم خود تحریر کی۔ اپنے دستخط (نام) کے ساتھ تاریخ بھی درج کی ۱۲/۱۲/۷۲ ۔ دس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہوگیا ہے۔

——— مختار شمیم، اندور

دہلی کا آخری دیدار

جس دلّی کا یہ کتاب قصہ سناتی ہے وہ صرف ایک شہر ہی نہ تھی، ایک تہذیب کا نشان، ایک تمدن کا گہوارہ، علم وادب کا مرکز اور ایک ایسی گزرگاہ فکر تھی جہاں علم وفن، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، حکومت و سیاست کے سانچے صدیوں تک ڈھلتے تھے۔

مصنف :	سید وزیر حسن دہلوی	صفحات :	۷۴
مرتب :	سید ضمیر حسن دہلوی	قیمت :	۱۷ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۵ ● شمارہ: ۷ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● نومبر ۱۹۹۱ء

فون نمبر
۳۲۶۳۴۴۸
۳۲۷۶۲۱۱

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ـــ گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد
سرورق، عمل: ارشد علی خاں

پروفیسر اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپواکر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

"آپ کی رائے" کے تحت شائع ہونے والے خطوط پر ہم عام طور پر اظہارِ خیال نہیں کرتے لیکن اس بار اس کالم میں شامل ایک خط کے بارے میں ہم کچھ کہنا چاہیں گے۔ یہ خط اُردو کے معروف قلمکار جناب عظیم اختر کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اُردو ہندستان کے مختلف طبقوں کی مشترک زبان کبھی نہیں رہی یہ ایک مخصوص طبقے کی زبان تھی اور ہے جس نے اسے اپنے اجداد کی میراث اور قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان سمجھ کر سینے سے لگایا۔ عظیم اختر صاحب نے معلوم نہیں کیوں یہ لفظ استعمال نہیں کیا لیکن قرآن و حدیث کے حوالے سے ظاہر ہے کہ "مخصوص طبقے" سے ان کی مراد مسلمان ہیں۔

یہ بات کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، پہلے بھی کہی جا چکی ہے لیکن جن لوگوں نے اُردو زبان کی پیدائش کے تاریخی عمل اور اس کے تدریجی ارتقا کے مختلف مرحلوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ اسے سرزمینِ ہند کی ایک مشترکہ زبان ہی مانتے رہے ہیں اور ہمارے نزدیک سچائی بھی یہی ہے۔ جو مسلمان ہندستان آئے وہ عربی، فارسی یا ترکی بولنے والے تھے جن سے مقامی آبادی نا آشنا تھی۔ اُردو یا اس سے ملتی جلتی کوئی زبان مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے جبکہ یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی ایک ایسی زبان کا خمیر تیار ہو رہا تھا جسے مختلف عوامی بولیوں کے آمیزے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی زبان نے آگے چل کر دہلی اور اطرافِ دہلی میں کھڑی بولی کا روپ دھارا اور پھر یہ دو شاخوں میں بٹ گئی ایک شاخ اُردو کہلائی دوسری ہندی۔ جس شاخ کا نام اُردو پڑا اس نے عربی اور فارسی نیز ترکی سے قریبی رسم و راہ پیدا کی اور اس طرح اس کے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سے اسما اور صفات ان زبانوں کے شامل ہو گئے لیکن یہ ایک سماجی یا لسانی عمل تھا، مذہب کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔

یہ مفروضہ بھی صحیح نہیں کہ اُردو قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان ہے۔ اُردو مدتوں تک بول چال کی زبان رہی اور اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ بہر حال جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو صرف قرآن و حدیث کے تراجم اور تفسیریں ہی سامنے نہیں آئیں دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی وجود میں آیا۔ پچھلے دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک دو روزہ کل ہند سیمینار مہرشی شیو برت لال ورمن پر منعقد کیا تھا جنھوں نے سو سے زیادہ کتابیں ہندو دھرم کی ترویج و تبلیغ کے لیے لکھیں اور یہ سب اُردو میں ہیں۔ یہ کام انھوں نے اپنی بیوی کی فرمائش پر ہندو خواتین کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے شروع کیا تھا۔

اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلموں نے محض معاشی ضرورتوں کے تحت اُردو کو اختیار کیا۔ جو زبان صرف معاشی یا کاروباری مقاصد سے سیکھی جاتے اس میں کسی تخلیقی سرگرمی کا تصور محال ہے اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ اُردو زبان میں غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

دراصل کسی زبان کی تشکیل اور اس کا ارتقا ایک سماجی عمل ہے، زبان کسی خاص تہذیب کی ترجمان ہو سکتی ہے کسی مخصوص مذہب کی نہیں اور تہذیب کی صورت گری میں مذہب کے علاوہ اور بھی کئی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔

اُردو کے ایک مشترکہ زبان ہونے کے تصور کو سب سے بڑا صدمہ تقسیمِ وطن سے پہنچا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ چونکہ دو قومی نظریے کے تحت مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کے حصول کے لیے کیا جا رہا تھا اور اس سے اُردو کو بھی وابستہ کر دیا گیا، اس لیے پُرشور سیاسی نعروں کی بدولت وقتی طور پر یہ غلط فہمی عام ہو گئی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس غلط فہمی کو مزید ہوا تب ملی جب اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا گیا ——— لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے دل سے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کی جہاں کچھ اور وجوہ تھیں وہاں ایک وجہ بنگالی مسلمانوں کی اُردو سے بیزاری بھی تھی اور یہ کم اہم وجہ نہیں تھی۔ خود مغربی پاکستان کے وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں سندھی، سرائیکی یا پشتو ہیں اُردو سے زیادہ مانوس نہیں اور کبھی کبھی اُردو کی بالادستی کے خلاف آواز بھی اُٹھاتے رہتے ہیں۔

اس سوال کا جواب کہ اُردو میڈیم اسکول بالخصوص ان علاقوں ہی میں کیوں کھولے جاتے ہیں جہاں مُسلم آبادی زیادہ ہے، ہماری کوتاہ اندیشی کی خصلت ہے۔ اُردو پڑھنے کے خواہشمند ہر فرقے میں موجود ہیں اس کا اندازہ دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے چلائے جانے والے اُردو کوچنگ مراکز کے طلبہ سے مل کر کیا جا سکتا ہے جن میں ہر سال لگ بھگ ۹۰ فیصد تعداد غیر مسلموں کی رہتی ہے۔

——— مخمور سعیدی

عبدالرحمٰن غفاروف/کاشی ناتھ پنڈت

تاجیکستان میں غالب شناسی*

مرزا اسد اللہ خاں غالب (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ تا ۱۵ فروری ۱۸۶۹) نہ صرف اردو بلکہ ہندستان کے فارسی اَدب میں بھی ایک نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں فارسی، تاجیکی اور دری ادب کی تاریخ کم و بیش ایک ہزار سال پرانی ہے۔ چنانچہ دسویں صدی کے آخر اور گیارہویں صدی کے شروع میں سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی کی ہندستان پر لشکرکشی اور اس کے بعد غزنویوں، لودھیوں اور خاص کر تیموریوں کی ہندستان پر حکمرانی کے نتیجے میں فارسی زبان اور اَدب نے ہندستان میں رفتہ رفتہ رواج پالیا۔ اور اسے خاطر خواہ اقتدار حاصل ہوا۔ ان مسلمان حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں فارسی ہندستان کی سرکاری زبان بن گئی۔ ہندستان میں اہم ادبی مرکزوں نے فارسی سخنوروں کو اپنی طرف راغب کیا اور اُن کے دلوں میں ہندستان پہنچنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ منگولوں کے ظلم اور غلبے کے نتیجے میں ترکستانی معاشرے پر ستم اور آشوب نے جو تاریک سائے ڈالے تھے ان سے نا اُمید ہو کر ماوراالنہر اور خراسان کے بعض سخنور اس المیے سے جانبر ہونے کی تلاش میں جلاوطنی تک کی صعوبت کو برداشت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ان میں سے ایک گروہ نے ہندستان کی راہ لی ـــــــ انھی اہلِ علم و فضل تارکینِ وطن کے ذریعے رفتہ رفتہ فارسی زبان و ادب نے ہندستان میں مقبولیت پائی اَدبی دنیا میں کئی خوش نوا اور شیریں کلام لوگ اُبھرے جنھوں نے فن اور ادب کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا اور بقول حافظ شیرازی طوطیانِ ہند بن گئے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندستان کے فارسی سخندانوں کے روابط اور دوستانہ تعلقات ہندستان سے باہر وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان میں فارسی تاجیک سخنوروں کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔ ان تعلقات کے نتیجے میں ہندستان میں فارسی ادب کی پیش رفت میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں ہندستان نے کئی زبردست شاعر اور سخنور دنیائے ادب کو دیے جن میں خاص طور پر مسعود سعد سلمان، امیر خسرو دہلوی، حسن دہلوی، فیضی دکنی، اور عبدالقادر بیدل جیسی قد آور ہستیوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان سربرآوردہ شاعروں کے کلام، فن اور فکر سے ہر تاجیک آشنا ہے۔ اور ان کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان نامور شخصیتوں میں مرزا اسد اللہ خاں غالب ایک ایسا درخشاں ستارہ ہے جو سب کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس عظیم ہندی مفکر اور صاحب سخن نے فارسی زبان میں گراں بہا تصانیف چھوڑی ہیں جن کی بنا پر وہ فارسی داں طبقے میں اور خاص کر تاجیکوں کی ادبی تاریخ میں اپنے لیے ایک خاص مقام بنا چکا ہے بلکہ اب اس کو کلاسیکی فارسی/ تاجیک ادب کا ایک اہم ستون مانا جاتا ہے۔

اگرچہ اسد اللہ خاں غالب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنے فارسی اشعار کو اردو اشعار پر ترجیح دی ہے:

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بی رنگ من است
فارسی بین تا ببینی اندر اقلیم خیال
مانی وارژنگم وان نسخۂ ارژنگِ من است

غالب کی اکثر تصانیف فارسی میں ہی ہیں اور دنیا بھر کے فارسی داں اصحاب کے لیے بہت عزیز اور قابلِ قدر ثقافتی ورثہ ہے۔ نہ صرف ہندستان اور پاکستان میں بلکہ تاجیکستان اور وسطی ایشیا کے دیگر کئی شہروں اور مرکزوں میں جہاں کی زبان فارسی ہے، غالب کی تخلیقات کو پڑھا جاتا ہے تاجیکستان میں مرزا غالب کی زندگی اور فن سے متعلق تحقیقی کاوشیں حالیہ برسوں میں شروع ہو چکی ہیں اور اس قلیل مدت میں بھی اس عمل میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ تاجیکستان کی مطبوعات اور ادبی اور علمی مجلّوں میں غالب پر متعدد مضامین کے علاوہ سال ۱۹۶۵ء میں "حیات و ایجاداتِ میرزا اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان کے تحت راقمِ سطور نے ایک کتابچہ سپردِ قلم کیا۔[۲]

یہ رسالہ مقدمے، خاتمے اور ملاحظات یعنی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے باب میں غالب کے شعری مقام اور فارسی زبان و اَدب کے تئیں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

* اصل مقالہ تاجیکی زبان میں ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ پروفیسر کاشی ناتھ پنڈت نے مصنف کے التماس پر کیا ہے۔

FOTEDAR HOUSE, JAWAHAR NAGAR,
TALAB TILLO, JAMMU TAWI (J.&K)

غالب کی زندگی اور ان کی شعری تخلیقات پر
ہندستان میں بے شمار مقالات اور کتابیں لکھی جا
چکی ہیں۔ سال ۱۹۶۵ء تک غالب پر اُردو
فارسی اور انگریزی زبانوں میں جو کچھ چھپ چکا
ہے ان تمام معلومات کو اس کتابچے کے مقدمے
میں سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک شاعر
یا ادیب جس قدر عظیم اور صاحبِ کمال ہوتا ہے
اسی قدر اس کے ناقدوں کی رائے میں تنوّع اور
گونا گونی ہوتی ہے۔ اس لیے راقمِ سطور کے لیے یہ
ضروری ہو گیا کہ اپنے کتابچے کی تدوین اور ترتیب
کے لیے بہت سے اسناد اور شواہد کو زیرِ نظر لائے
اِسی لیے دہلی، علی گڑھ، رامپور، پٹنہ، آگرہ، لکھنؤ
اور ہندستان کے کئی اور شہروں میں جاکر وہاں
کے کتب خانوں سے مطلوبہ مواد کو اکٹھا کرنا پڑا۔

رسالے کے پہلے باب کا عنوان "زمانِ غالب"
ہے اس میں غالب کے زمانے کے سیاسی، اقتصادی
سماجی اور ادبی پس منظر کو تاریخی اور ادبی منابع
سے استشہاد کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ اس میں
قارئین کی توجّہ کو سامراجی حکمرانی کے خلاف قومی
تحریک کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ پر مرکوز کیا
گیا ہے جو ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں رونما ہوئی۔
یہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں کہ اگرچہ میرزا غالب براہ
راست اس شورش سے وابستہ نہ تھے لیکن وہ
اجنبیوں کی جانب سے اس قومی تحریک کی ظالمانہ
طریقوں سے سرکوبی کے واقعات کے عینی شاہد
تھے۔ اس کے علاوہ کلامِ غالب میں اس قومی
تحریک کا انعکاس واضح طور پر دیکھا جا سکتا
ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور دیگر شہروں میں غالب پر
چھپے تحقیقی مضامین میں اس موضوع پر تفصیل
سے بحث ہو چکی ہے۔

میرزا اسداللہ خاں غالب کے حالاتِ
زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض
سے راقم الحروف نے بیشمار مواد کا مطالعہ کیا۔ رسالے
کا دوسرا باب جو غالب کی تصانیف اور تخلیقات
کے بیان پر مشتمل ہے وہ ضخامت میں باقی ابواب
سے زیادہ ہے۔ اس میں غالب کی تمام تخلیقات
کا چاہے وہ نثر میں ہیں یا نظم میں مختصر طور پر
احاطہ کیا گیا ہے۔ ملحقات کے حصّے میں مؤلف
نے کئی ایسی شخصیتوں کی زندگی اور تخلیقات پر
اپنی معلومات کو اختصار کے ساتھ درج کیا ہے
جو غالب کے ہمعصر تھے اور جنھوں نے ہندستان
میں فارسی زبان اور ادب کی نشو ونما اور ترقی میں
نمایاں کام انجام دیا۔ ان میں شیخ ابراہیم ذوق، نیّر رخشاں،
شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش،
صدرالدین خاں آزردہ، رجب علی بیگ سرور،
سر سید احمد خاں اور مولانا فضل حق خیر آبادی
جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

اسی رسالے کی اشاعت کے بعد تاجیکستان
میں اسداللہ خاں غالب پر ایک اور کتاب شائع
ہوئی جس کا عنوان "مکتوبہای اُردو میرزا غالب"
ہے اس کو شرف بانو پولادوا نے تالیف کیا۔
یہ خاتون غالب کے اُردو خطوط کی خصوصیتوں
میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ کئی اور متعلقہ مسائل
کو زیرِ بحث لائی ہیں۔ مثلاً فاضل مصنفہ نے
ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کے ابتدائی
دور اور بنگال میں راجہ رام موہن رائے کی برہمو
سماجی تحریک کے عقاید اور کارکردگی سے متعلق
مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ سال ۱۸۵۷ء سے
لے کر ۱۸۵۹ء تک رونما ہوئی بغاوت کے
نتیجے میں علی گڑھ کی اسلامی سماجی تحریک اور اس
کے قاید سر سید احمد خاں کی سرگرمیاں اور آخر کار
جمعیت اسلامی کے روشن خیال جوانوں کا وجود
میں آنا جیسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے دربار
سے باہر ادب کے فروغ اور اس سے متعلق کئی
دیگر مسائل کے بارے میں بڑی مفید اطلاعات
بہم پہنچائی گئی ہیں۔[3]

ہندی دانشمندوں کی درخواست پر سال
۱۹۶۹ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں غالب
کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے یونیسکو کی
ستائیسویں بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی۔
اس مناسبت سے سوویت یونین میں بھی
اس بین الاقوامی جشن کو مشہور تاجیک دانشور
بابا جان غفاروف کے اہتمام میں پوری آب و
تاب سے منایا گیا۔ سال ۱۹۶۹ء کے آخر میں
جشن میرزا غالب کے سلسلے میں تاجیکستان
کے "عرفان" نام کے نشریاتی ادارے نے
ایک مجموعہ "منتخب آثار فارسی غالب" کے
عنوان کے تحت شائع کیا۔ اس مجموعے کی ترتیب و
تدوین کے علاوہ راقم الحروف نے اس کا دیباچہ
بھی لکھا اور توضیحات کا بھی اضافہ کیا۔ یہ مجموعہ
دو حصوں میں منقسم ہے یعنی نظم اور نثر غالب حصّۂ
نظم میں ۱۵۱ غزلیں ۶۲ رباعیاں ۸ قصیدے
مثنویات، ترکیب بند اور مقطعات درج ہوئے
ہیں۔ فارسی نثر سے متعلق غالب کی تصانیف میں
پنج آہنگ، مہرِ نیمروز، دستنبو اور درفش
کاویانی سے عبارات نقل کی گئی ہیں۔

تاجیک محقق غالب کے کلام کو بڑی قدر و
قیمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ علیشایف
نے "ارمغان غالب" عنوان کے تحت ایک
مقالے میں لکھا ہے "اس بات کو ذہن نشین کرنا
چاہیے کہ غالب کے اشعار سبک ہندی کے
اسلوب اور سلیقے میں کہے گئے ہیں۔ اس لیے
ان کی دشوار گوئی اور نازک بیانی کی طرف قارئین

وخاص توجہ دینی ہوگی اور انھیں پوری معلومات حاصل ہونی چاہییں۔[۷] "مجموعہ آثار فارسی غالب" ایک قابلِ قدر تحفہ ہے جسے ہندو پاک کے ذوالّلسانین شاعر کے صد سالہ جشن کی مناسبت سے تاجیک ناشروں نے پیش کیا ہے۔[۸]

۱۹۶۸ء میں شرف بانو پولادوا نے 'میرزا غالب" عنوان کے تحت ایک کتاب شائع کی جو ہندستان کے عظیم سخن سرا کی زندگی اور اس کی سوانح پر پوری معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے تاجیک لوگوں نے میرزا غالب کی تالیفات، تخلیقات اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح جان لیا۔[۵] اسی سال اسی دانشمند خاتون نے میرزا غالب کی رُباعیات شائع کیں۔ ان کے مرتبہ مجموعے میں کُل ملا کر ایک سو ایک رباعیات شامل ہیں۔[۶] تاجیک دانشمندوں نے میرزا غالب کی زندگی کے حالات کو متعدد مقالات کے ذریعے پیش کیا۔ مثلاً "شاعر مشہور ہند"[۷] "مکتوبہائے اُردوی میرزا غالب"[۸]... راقم الحروف کے قلم سے بھی اس سلسلے میں کچھ مقالات قارئین کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ تاجیکستان میں غالب کے اُردو خطوط کی تدوین کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ محققوں نے غالب کی اُردو نثر کی انقلابی نوعیت اور مکتوب نویسی میں ایک نئے پن کو اچھی طرح جان لیا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ غالب کی زندگی اور ان کی تصنیفات پر متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہونے کے باوجود، ان میں سے کوئی بھی بقول مولوی عبدالحق شاعر کی زندگی اور اس کی سیرت کی صحیح معنی میں ایسی عکاسی نہیں کرتا جس کی تصویر اس کے خطوط میں سامنے آتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ غالب کے خطوط ان کی زندگی ان کے سماجی عقائد اور ان کی ادبی افتادِ طبع کو بخوبی درک کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح غالب کے خطوط کا مطالعہ اور ان کی ارزیابی کرنی چاہیے تھی۔ اس طرح کی آج تک تاجیکستان میں نہیں ہو پائی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ بانو پولادوا نے غالب کے چند اردو خطوط کا انتخاب کرکے ان کا تاجیکی زبان میں ترجمہ کیا اور ۱۹۸۲ء میں دوشنبہ میں اُسے "عود ہندی" کے عنوان سے نشریات "عرفان" نے چھاپ دیا۔[۹]

"عود ہندی" نام کا یہ رسالہ نہ صرف غالب کی تخلیقات، بلکہ اس کی شخصیت، اس کی سیرت اور سب سے بڑھ کر اس کی عالم اور آدم کے ساتھ مناسبت جیسے موضوعات پر بہت مفید معلومات پیش کرتا ہے۔

غالب نے ان خطوط میں زندگی کے مسائل فلسفیانہ افکار، عالم ہست و بود میں انسان کا مقام جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زبان اور ادب سے متعلق جو بعض کجرویاں نمودار ہو چکی تھیں انھیں غالب نے اپنے خطوط میں بڑی جرأت مندی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اپنے بعض خطوط میں غالب نے شعر و ادب کے باریک نکتوں کو بھی اُبھارا ہے۔ مثلاً شعر کا وزن اور قافیہ نثر مقفٰی یا نثر عاری وغیرہ تکنیکی معاملات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔[۱۰]

اس طرح ہندستان کے اس مشہور شاعر کی منظوم و منثور تصنیفات کا مطالعہ اور اس کی تحقیق و تدقیق کا سلسلہ تاجیکستان میں جاری ہے۔

آخر میں ہمیں یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ہم تاجیک لوگ ہندستان کے آسمان ادب کے اس درخشندہ ستارے کے نظم اور نثر کی تخلیقات کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اُس نے اپنے تاجیک قارئین کے دل میں احترام کا مقام حاصل کیا ہے اور کسی بھی حالت میں وہ ہماری لوحِ خاطر سے مٹ نہیں سکتا۔

مآخذ و منابع

۱۔ کلیات نظم فارسی غالب لکھنؤ۔ ۱۹۲۵ء ص ۱۴۱
۲۔ عبداللہ جان غفاروف۔ حیات و ایجادات میرزا اسداللہ خاں غالب' دوشنبہ۔ ۱۹۶۵ء (تاجیکی زبان میں۔)
۳۔ ش۔ پولادوا۔ مکتوبہاے اردوی میرزا غالب دوشنبہ ۱۹۶۶ (بزبان تاجیکی)
۴۔ جابل داد علیشایف۔ ارمغان غالب مجلہ صدای شرق ۱۹۶۸ اشمارہ ص ۱۵۷۔ ۱۵۸۔
۵۔ ش۔ پولادوا۔ میرزا غالب۔ دوشنبہ۔ نشر "جمعیت دانش": ۱۹۶۸ء بزبان تاجیکی)
۶۔ ش پولادوا۔ میرزا غالب رباعیات' دوشنبہ ۱۹۶۸ء بزبان تاجیکی۔
۷۔ ش۔ پولادوا' شاعر مشہور ہند۔ مجلہ شرق سُرخ ۱۹۶۱ء شمارہ ۷، ص ۱۴۹۔ ۱۴۱۔
۸۔ ش۔ پولادوا۔ مکتوبہائے اردوی' میرزا غالب۔ مجموعہ مقالات ہند و پاکستان۔ ۱۹۸۷ء ص۔ ۱۴۴۔ ۱۶۰
۹۔ میرزا غالب۔ عود ہندی۔ دوشنبہ۔ ۱۹۷۲۔ پولادوا۔ (بزبان تاجیکی)
۱۰۔ اکرامی دل افروز۔ مکتوبہائے غالب' میرزا غالب۔ عود ہندی۔ دوشنبہ۔ ۱۹۸۲ء مجلہ صدای شرق۔ ۱۹۸۲ء۔ شمارہ ۱۲' ص۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶ (بزبان تاجیکی)

نظمیں

دھوڑی کے جوتے

چُرمر، چُرمر، چُرمر، چُرمر
دھوڑی کے نئے جوتے پہنے
کس کا بچپن آج خوشی سے ناچ رہا ہے
یادوں کی پروائی آج یہ کیسی خوشبو لے آئی ہے

ننگے پاؤں کی پہلی عید تھی،
جب دھوڑی کے تیل پلائے نئے جوتوں نے
تلووں کو کانٹوں سے بچایا
کنکر، پتھر، کیچڑ، تپتی ریت سے کی پیروں کی حفاظت
بے خوفی سے چلنے کا انداز سکھایا

ساٹھ برس سے کچھ اوپر کی بات،
مگر جیسے کل کا قصّہ ہے
باپ کی شفقت،
ماں کی ممتا،
جانے کیا کیا یاد آتا ہے
چرمر، چرمر، چرمر، چرمر
اس آواز میں کیا جادو ہے
دھوڑی کے جوتوں میں جیسے،
گئے زمانوں کی خوشبو ہے

رفعت سروش
۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

تشخّص

میں صبح تازگی اوڑھے ہوئے گھر سے نکلتا
شام اپنے جسم کو لادے ہوئے
جب گھر میں آتا تھا
مرا بیٹا، مرقّع میری خوشیوں کا
بہت معصوم لہجے میں
مری آواز سنتے ہی
خوشی سے چیختا، کہتا
کہ ابّا آگئے میرے، مرے ابّا، مرے ابّا
اُچھلتا بے تحاشا دوڑ کر
وہ مجھ کو چھو لینے کی خواہش میں لپکتا
میری ٹانگوں سے لپٹ کر
سر اُٹھاتا
اور پھر
ہاتھوں کو پھیلا کر
بڑی بیتابیوں کے ساتھ میری گود میں آتا
مجھے اک لمس دے کر
جسم کی ساری تھکن کو چوس لیتا تھا

مگر اب وہ
خدا رکھّے
مرے قد کے برابر
میرے ارمانوں کا پیکر
میری ڈھارس ہے
میں کب گھر سے نکلتا ہوں
کب اپنے گھر میں آتا ہوں
اُسے معلوم ہوتا ہے
مگر وہ بھی تھکے ماندے بدن سے چور ہوتا ہے
میں اُس کو دیکھتا ہوں جب
وہی معصوم سی صورت مری آنکھوں میں پھرتی ہے
محبّت سے بھرا طوفان میرے دل میں اُٹھتا ہے
میں اُس کو پیار کرنے کی تمنّا میں
قدم جیسے بڑھاتا ہوں
کوئی حد
کوئی سرحد
درمیاں محسوس ہوتی ہے

حیات لکھنوی
۵، امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

برین پیٹن/ انور خاں

یونہی تو نہیں جینا

دور جنگل میں ایک پرانے گھنے درخت کے نیچے چوہوں نے اپنے بل بنا رکھے تھے۔ دن میں سورج کی کرنیں پتّوں سے جھانکتیں تو درخت کے نیچے تھوڑا سا اجالا ہوتا۔ اسی مدھم روشنی میں چوہے درختوں کے پتّوں اور بیجوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے نکیلے دانتوں سے کترتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جمع کرتے رہتے۔ شام ہوتے ہوتے درخت کے نیچے ایسا اندھیرا چھا جاتا گویا رات ہوگئی ہو اور چوہے بھی اپنی مصروفیت ختم کرکے بلوں میں گھس رہتے۔

انہی چوہوں میں ایک چھوٹا سا چوہا تھا۔ شام میں جب ہر طرف سنّاٹا چھا جاتا اور ہوا سائیں سائیں کرنے لگتی تو اسے کانوں میں ہلکا سا شور سنائی دیتا۔ ایسی آواز جسے ہم گونج کہتے ہیں مگر اس چھوٹے سے چوہے کے لیے وہ بس ایک ہلکا سا شور تھا جس میں عجیب سی دلکشی تھی۔ جیسے کوئی اُسے اپنی طرف بُلا رہا ہو۔ چوہے نے ایک دن اپنے ساتھیوں سے اس کا تذکرہ کیا۔ وہ سب اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔

"ہمیں تو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔" انھوں نے کہا۔ "تمھارے کان بج رہے ہوں گے۔"

چوہا بے چارہ پھر بیجوں کی ڈھیریوں کو اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے میں مصروف ہوگیا۔ لیکن گونج تھی کہ رہ رہ کر اُسے سنائی دیتی۔ رات میں وہ سونے کے لیے لیٹتا تو گونج اس قدر صاف سنائی دیتی کہ بے چارے کی نیند اُڑ جاتی۔

کئی دن گزر گئے۔ سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان ہوگیا تو اس نے طے کیا کہ وہ اس درخت کے سائے سے نکلے گا اور معلوم کرے گا کہ آواز کاہے کی ہے۔ لیکن چونکہ وہ کبھی پیپل کے سائے سے باہر نہیں گیا تھا اس لیے جب بھی وہ باہر نکلنے کی سوچتا اس کا دل بیٹھ جاتا اور وہ بل میں گھس جاتا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ آخر ایک دن ہمّت جٹا کر وہ ساتھیوں کی نظر بچا کر باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی تیز دھوپ آنکھوں میں چُبھی تو بوکھلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا لیکن اُسی وقت اُسے وہ گونج پھر سنائی دی۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ اس آواز میں بلا کا سحر تھا، جیسے ماں بچے کو لوری سنا رہی ہو۔ اُس کی آنکھیں دھوپ سے کچھ مانوس ہوئیں تو باہر روشنی اور ہرا بھرا کھُلا ماحول بھی اسے اچھا لگا اور وہ آگے بڑھ گیا۔

راہ میں اُسے ایک جانور ملا جو اس سے جسامت میں خاصا بڑا تھا۔ یہ تھا رکون (RACOON) گول مٹول سا۔

"کیوں بھائی،" اس نے پوچھا، "یہ تم باہر کی دنیا میں کیسے چلے آئے؟"

چوہے نے اُسے گونج کے بارے میں بتایا جو اُسے ہمیشہ سنائی دیتی تھی۔

"یہ تو دریا کی آواز ہے،" رکون نے اُسے بتایا "میں روز اپنی غذا وہیں سے ڈھو کر لاتا ہوں۔"

چوہے کو خوشی محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گونج محض واہمہ نہیں تھی، اس کا سچ مچ وجود تھا۔ اگر وہ درخت کے سائے ہی میں رہتا تو یہ بات اسے کبھی معلوم نہ ہوتی اور وہ ہمیشہ پریشان رہتا۔ لیکن یہ دریا کیا ہوتا ہے۔ شیر کے متعلق تو اس نے سنا تھا کہ اس کی آواز بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ چڑیوں کو چہچہاتے بھی اس نے سنا تھا مگر یہ دریا۔ اس نے سوچا وہ دریا کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور اپنے ساتھ لائے گا اور دوستوں کو بتائے گا کہ دیکھو تم میرا مذاق اڑاتے تھے نا۔ یہ ہے وہ دریا جس کی گونج مجھے سنائی دیتی تھی۔

راستے میں اُسے کاغذ کی تھیلی ملی تھی وہ اس نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔ اس نے رکون سے کہا:

"کیوں بھائی اگر میں دریا کا ایک آدھ ٹکڑا اس میں رکھ لوں تو اسے اعتراض تو نہ ہوگا؟"

رکون کو ہنسی آگئی۔

"یار! تم واقعی بہت بھولے ہو،" اُس نے کہا، "اتنا بڑا دریا تمھاری تھیلی میں کیسے سمائے گا۔ وہ تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ وہ تو سبھی کا ہوتا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے، کچھ چوہوں کا، کچھ رکون کا، کچھ اور جانوروں کا؟" چوہے نے پوچھا۔

"وہ ٹکڑوں میں تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ پورا اِک دریا ہوتا ہے۔"

چوہا اور پریشان ہوگیا اور اس کا تجسس بڑھ گیا۔

"آپ مجھے وہاں لے جائیں گے؟" اُس نے

۲۲/۴۸، شیخ بشر قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی ۸

رکون سے درخواست کی۔

"کیوں نہیں" رکون نے جواب دیا۔

رکون اسے دریا کنارے لے آیا۔ چوہا دریا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی تو عقل ہی کام نہ کرتی تھی کہ کوئی چیز اتنی بڑی بھی ہوسکتی ہے۔ پانی کے چھینٹے کبھی کبھی اس پر پڑتے تھے جب بارش کا پانی پتوں سے چھن کر نیچے آتا تھا۔ شبنم سے بھی وہ واقف تھا۔ مگر یہ دریا ہزار ہا لکھو کھا بارش کے قطرے بھی اس کے سامنے ہیچ تھے۔ جہاں تک اس کی نظر جاتی اُسے دریا کا پانی چمکتا، لہریں لیتا نظر آتا۔ ڈرتے ڈرتے وہ دریا کے قریب پہنچا ساحل کنارے پانی بالکل شانت تھا اُس نے جُھک کر دیکھا۔ پانی میں اُسے اپنا عکس نظر آیا۔ اس ٹھنڈے پانی میں اس نے اپنے پنجے بھگوئے خوشی کا ایک فوارہ سا اس کے اندر سے اُبل پڑا اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی دریا کا شیریں نغمہ اس کے کانوں میں صاف صاف سنائی دیا۔ اس کا چھوٹا سا سر چکرانے لگا۔

وہ دیر تک دریا کنارے بیٹھا رہا۔ رکون بھی اسے فراموش ہوچکا تھا۔ جو اپنی غذا ڈھونے میں مشغول تھا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اس کے پاس آیا اور بولا۔

"آؤ، تمھیں اپنے دوست مینڈک سے ملواؤں، وہ یہیں ساحل پر رہتا ہے۔"

وہ رکون کے ساتھ مینڈک کے پاس گیا۔ اس نے دیکھا ایک ہرا ہرا سا جانور آدھا جسم پانی میں، آدھا پتھر پر رکھے ٹکر ٹکر اُسے گھور رہا ہے۔

"آداب عرض ہے" اس نے چوہے سے کہا۔

"آداب عرض" چوہے نے جواب دیا۔

مینڈک بڑا خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت تھا۔ اس نے چوہے کو بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیسے زمین اور پانی دونوں جگہ رہ سکتا ہے۔ بڑے بڑے طوفانوں کے متعلق بتایا۔ کیسے بجلی ایک سیکنڈ کے لیے چمکتی ہے اور ہر چیز کو روشن کرکے پھر گھپ اندھیرے میں کھو جاتی ہے۔ خزاں کے خوابیدہ موسم میں کیسے سندر سپنے آتے ہیں اور جب آنکھ کھلتی ہے تو بہار کا موسم ہوتا ہے اور ہر شے گنگناتی، چہچہاتی، کلکاریاں مارتی نظر آتی ہے۔

مینڈک نے اس کی آمد کی وجہ پوچھی۔

اُس نے مینڈک کو دریا کی گونج کے بارے میں بتایا۔

"یہ گونج واقعی پیاری ہے" مینڈک نے کہا "تمھیں ایک دوا بتاؤں؟"

چوہے کی بلا جانے کہ دوا کیا ہوتی ہے۔ مگر اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا اچھا ہی ہوا تھا۔ یہ بھی یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی۔ اُس نے سوچا۔

"ضرور" اُس نے کہا ____

"ٹھیک ہے" مینڈک نے اُس سے کہا "اب ایسا کرو کہ اپنے پیروں کو سمیٹ لو، سمیٹ لیا، ہاں! اب جس قدر جھک سکتے ہو جھک جاؤ۔ جھک گئے ____ اب اُچھلو ___ اس طرح"

مینڈک نے اسے اُچھل کر دکھایا۔

چوہا تو اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلے تو اُس کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ پھر اس نے بھی کوشش کی، وہ ایک بار وہ اُچھلا۔ اُسے بڑا مزا آیا۔ وہ اور زور سے اُچھلا۔

"اور زور سے اُچھلو" مینڈک نے اُس سے کہا۔

وہ پوری طاقت سے اُچھلا۔ اُس کے کان ایک درخت کی نچلی شاخ سے مس ہوئے اور اسے گدگدی سی ہوئی۔ دور اسے پہاڑوں کا ایک لمبا سلسلہ نظر آیا۔

بدقسمتی سے اس بار وہ پانی میں گرا۔ اس کا جسم بھیگ گیا۔ اچھا ہوا کہ پانی زیادہ گہرا نہ تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ ساحل پر آگیا۔ مینڈک کو وہ پسند کرنے لگا تھا۔ لیکن اس کے مذاق پر اُسے بہت غصہ آیا۔

"تم محفوظ ہو" مینڈک نے گمبھیر لہجے میں کہا "ہو یا نہیں"

"ہاں محفوظ تو ہوں" چوہے نے اعتراف کیا۔

"تمھیں چوٹ بھی نہیں آئی"

"ہاں چوٹ تو نہیں آئی" چوہے نے تسلیم کیا۔

"پھر تمھیں کس بات کی شکایت ہے" مینڈک نے کہا "کیا تمھیں وہ چیز نظر نہیں آئی جو اس دریا سے بھی کہیں بڑی ہے"

اُسے پہاڑوں کا طویل سلسلہ یاد آیا جو اس نے اُچھلتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں تمھاری دوا مل گئی" مینڈک نے کہا۔

"اور ایک نیا نام بھی ___ آج سے تمھارا نام اُچھلنے والا چوہا ہوگا"

چوہے کو یہ نیا نام پسند آیا۔

اُسے اب اپنا گھر شدت سے یاد آرہا تھا اُس نے واپسی کی اجازت چاہی۔

"جاؤ، خوشی سے جاؤ" مینڈک نے کہا۔ "مگر اس گونج کو یاد رکھنا۔ اس طرح تم دوبارہ واپس آسکو گے"

چوہے کا خیال تھا کہ اس کے دوست اب اس کی بات پر ضرور یقین کریں گے۔ کیوں کہ وہ

اپنی آنکھوں سے دریا کو دیکھ کر آرہا ہے۔ جب وہ پیپل کے پیڑ کے سائے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھی بدستور سوکھے پتّوں اور بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں منہمک ہیں۔

وہ دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ اُس کا چہرہ جوش اور خوشی سے تمتا رہا تھا۔ اس نے بڑی اُمنگ سے اُنھیں باہر کی دنیا کی باتیں اور وہ واقعات جو اُسے پیش آئے تھے، سُنائے۔

اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ باہر کی دنیا کے نام سے اُس کے ساتھیوں کے چہرے خوف سے سُت گئے۔

"یہ تو پاگل ہے" ایک چوہے نے کہا۔ "کسی بڑے جانور کے مُنہ میں چلا گیا ہوگا۔ خوش قسمتی سے بچ کر واپس آگیا ہے۔"

چوہے کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی خوشی اور کارناموں میں انھیں بھی شریک کرے مگر وہ تو اس سے ایسے بچنے لگے گویا اُسے چھوت کی بیماری ہو۔

اب یہاں رہنے کا فائدہ ہی کیا۔ چوہے نے سوچا۔ وہ خود کو پاگل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اُسے غصّہ تھا کہ پہلے بھی یہ لوگ اسی طرح اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ جب کہ وہ بالکل صحیح الدماغ تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔" اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "میں پہاڑیوں کا وہ مقدس سلسلہ دیکھوں گا۔ سوکھے پتّے اور فالتو بیجوں کو ایک بل سے دوسرے بل میں منتقل کرنے سے یقیناً وہ بہتر کام ہوگا۔"

"تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" اس کے دوستوں نے کہا۔ "تم ضرور دھبّوں کا نوالہ بنوگے۔"

چوہے زیادہ دور نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دور کی چیزیں انھیں دھندلی، دھبّوں کی صورت میں نظر آتیں۔ خاص کر عقاب جو بہت اونچائی سے بڑی تیزی سے لپکتے تھے اور پلک جھپکنے میں اُچک کر ہوا ہو جاتے۔ ان دھبّوں کا تصور ہی ان کے لیے لرزہ خیز تھا۔ چوہے نے مارے خوف کے جھرجھری لی، بدن میں کانٹے سے دوڑ گئے لیکن اب اُسے یہ بے کار سی چیزوں کو اِدھر اُدھر کرنے کا کھیل بالکل بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے وہ پہاڑوں کا سلسلہ یاد آیا اور اس نے طے کر لیا کہ ایک بار وہ اس درخت کے سائے سے نکلے گا۔ باہر دھوپ تھی، روشنی تھی، درخت کے نیم تاریک سائے کسی عفریت کی طرح چوہوں پر چھائے ہوئے تھے اور وہ اس آسیبی درخت کے سائے سے نکلنے کا خواہش مند تھا۔

درخت کا سایہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں آکر وہ رُک گیا۔ اس نے باہر جھانکا۔ رکون اسے نظر نہیں آیا۔ لیکن دریا کی گونج اُسے برابر سنائی دے رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ دریا کی طرف چل پڑا۔ گھاس کے اندر چھپتا چھپاتا وہ دریا تک آیا اور کنارے کنارے پہاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

اس سمے دنیا اُسے خواب جیسی معلوم ہوئی خوش رنگ پھول، ان کی بھینی بھینی مہک، دریا کی طرف سے آتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ خاموش حیران سا وہ دیر تک بھٹکتا رہا۔ راہ میں اُسے بڑے بڑے بیج نظر آئے جن کا گودا بڑا نرم تھا۔ کہیں صاف ستھرے پانی سے بھرے چھوٹے چھوٹے گڑھے۔ ایسا میٹھا پانی اور اتنی اچھی خوراک بھلا اُن پیپل تلے بسنے والے چوہوں کو کب نصیب ہوتی ہوتی۔ یونہی بھٹکتے بھٹکتے اسے شام ہوئی اور پھر رات نے اپنی آمد کا اشارہ دیا۔ اس نے گھاس پھونس کا نرم سا بستر بنایا جو ہر طرف سے بند تھا صرف ایک سوراخ اس نے رکھا تاکہ دھبّوں پر نظر رکھ سکے۔ اور وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

کئی دن تک وہ چلتا رہا۔ اُسے چھوٹے چھوٹے پرندے ملے، شہد کی مکھیاں اور خوبصورت تتلیاں۔ سب ہی دن کی اُجلی روشنی میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اُس کی کئی ایک سے علیک سلیک ہوئی۔ سب نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ یہ آج کی دنیا اس کی سایہ دار نیم تاریک دنیا سے کتنی مختلف تھی اور کتنی خوبصورت۔ وہاں تو ہر دن ایک سا تھا۔ ہر لمحہ ایک جیسا۔ کسی لمحے کو دوسرے لمحے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں نت نئے رنگ تھے۔ خوشبو تھی اور ہر شے متحرک نظر آتی تھی۔ ہر دن، ہر لمحے، وہ ایک نئے تجربے سے دوچار ہو رہا تھا۔ ہر روز نئے ساتھیوں سے ملاقات ہوتی، کبھی وہ آدھا دن ان کے ساتھ ہی گزار دیتا۔ ان کی کہانیاں سُنتا۔ حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات کا پتہ چلتا۔ کبھی وہ جلد ہی کھا پی لیتا اور اکیلا ہی بھٹکتا رہتا۔ ایک رات طوفان آیا۔ اُسے مینڈک کی بات یاد آئی۔ کیسے آسمان لحظہ بھر کے لیے جگمگاتا اور پھر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ اُسے بے حد ڈر لگا۔ لیکن ساتھ ہی ایک نئے تجربے سے دوچار ہونے کی خوشی بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی تو پَل ایسے نظر آتے گویا سینکڑوں چھوٹے چھوٹے سورج جگمگا اٹھے ہوں۔ گھاس کا ہر تنکا کسی تیز آبدار خنجر کی طرح چمکنے لگتا۔ کبھی وہ اپنے سوراخ سے باہر بھی نکلا مگر پھر اندھیرا چھا گیا اور ہر چیز

غائب ہوگئی۔

ایک دن اس نے خود کو عظیم صحرا کے نزدیک پایا جس کو عبور کرکے وہ پہاڑوں تک پہنچ سکتا تھا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک بوڑھے دانش مند چوہے سے ہوئی۔ اس نے بوڑھے چوہے کو اپنی پوری کہانی سنائی کہ وہ کیسے بیپل کے پیٹر سے نکلا۔ رکون سے ملاقات، دریا تک پہنچنا، مینڈک سے دوستی، پہاڑوں کی دریافت دوبارہ اپنے ساتھیوں سے ملاقات اور ایک بار پھر پہاڑوں کو دیکھنے کے لیے نکلنا اور دوسرے واقعات۔

"تم جس دریا کی بات کر رہے ہو اُسے میں نے دیکھا ہے۔" دانشمند چوہے نے اس سے کہا "لیکن پہاڑوں کا کوئی وجود نہیں۔ کسی نے تمھیں غلط اطلاع دی ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ آج تک کوئی چوہا ہمارے علاوہ یہاں تک نہیں پہنچا۔ یہاں تمھیں اور دلچسپ تجربے ہوں گے اور تمھاری عقل میں بھی اضافہ ہوگا۔ زندگی چین سے گزرے گی۔"

"مجھے اب بس ایک ہی خواہش ہے۔" اچھلنے والے چوہے نے کہا۔ "پہاڑوں کی زیارت بس۔"

دانشمند چوہا فکرمند ہو کر بولا۔

"دیجھے تمھیں اٹھالے جائیں گے۔ صحرا میں تو کہیں چھپنے کی بھی جگہ نہیں۔ وہ تمھیں بآسانی دیکھ لیں گے۔"

اچھلنے والا چوہا میدان کی طرف تیزی سے دوڑا اور کنارے پر ہی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دیجھے غذا کی تلاش میں فضا میں گھوم رہے تھے۔ آخر وہ کس طرح اس صحرا کو عبور کر پائے گا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کچھ چبانے اور کراہنے کی آوازیں سنائی

دیں۔ اس نے جھاڑیوں سے جھانکا۔ ایک بھینس بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔

"خالہ کیا بات ہے؟" چوہے نے پوچھا "کیوں رو رہی ہو، کچھ تکلیف ہے کیا؟"

"بیٹے مجھے نظر نہیں آتا اور موت میرے تعاقب میں ہے۔"

اتنا بڑا جانور اور اس طرح مر جائے۔ چوہے نے دُکھ سے سوچا۔

"خالہ، میں تو بہت چھوٹا سا چوہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "پھر بھی آپ چاہیں تو میری ایک آنکھ لے لیں۔ اگرچہ وہ بہت چھوٹی ہے اور زیادہ دُور نہیں دیکھ سکتی۔"

جیسے ہی چوہے نے یہ بات کہی اُس کی ایک آنکھ بھینس کی آنکھ میں جا کر فٹ ہوگئی۔

بھینس اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم ضرور اُچھلنے والے چوہے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں نے تمھیں پہچان لیا۔ تم اس صحرا کو پار کرکے پہاڑوں تک پہنچنا چاہتے ہو نا۔ میں تمھاری مدد کروں گی۔ تم میرے تھنوں سے چپک جاؤ، اس طرح عقاب تمھیں دیکھ نہیں پائیں گے۔"

وہ بھینس کے تھنوں سے چپک گیا۔ بھینس آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُسے دوسرے سرے تک لے گئی اور پہاڑوں کے قریب جا کر رُک گئی۔

"اب اس کے آگے تمھیں خود جانا ہوگا۔" بھینس نے کہا۔ "میں پہاڑوں پر چڑھ نہیں سکتی۔"

چوہے نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہیں گھاس میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ بھینس واپس چلی گئی اور چوہا پھر اکیلا رہ گیا۔

گھاس چھدری چھدری تھی۔ چھوٹے چھوٹے پتھر تک صاف نظر آرہے تھے۔ بھلا اُسے وہ کیا چھپا

پاتی۔ اُسے جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔

پہاڑوں کا خاموش، باوقار وجود چوہے کو بہت بھایا۔ اس نے غور سے دیکھا، کتنے ہی راستے تھے آخر کس راستے سے چڑھے اور اکیلا تو وہ چڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ اُسے ایک لومڑی نظر آئی۔

لومڑی ایک ہی دائرے میں گھومے جا رہی تھی۔ ایک بار وہ ذرا دم لینے کو رُکی تو چوہے نے اُسے سلام جھاڑ دیا۔

"سلام لومڑی صاحبہ"

"لومڑی صاحبہ؟" لومڑی نے دہرایا۔ "کیا میں لومڑی ہوں؟" وہ پھر گول گول گھومنے لگی۔

"میں بھول چکی ہوں کہ میں کون ہوں؟" اس نے کہا۔ "کیا ہوں، کیا کر رہی ہوں۔ میرا جینا اب بے کار معلوم ہوتا ہے۔"

لومڑی کی پریشانی نے چوہے کو بھی اُداس کر دیا۔

"کیا میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں؟"

"بالکل نہیں۔" لومڑی نے جواب دیا۔ "ہر لمحے میں پاگل سے پاگل تر ہوتی جا رہی ہوں—— میں بھوک سے مر جاؤں گی۔ میں کھانا بھول جاتی ہوں اور بھول جاتی ہوں کہ کیا کھایا ہے۔ کل میں نے اڑنے کی کوشش کی تھی اور آئندہ کل شاید میں تیرنے کی کوشش کروں گی اور ڈوب جاؤں گی۔ ہچکیاں اور بجلیاں میری سہیلیاں ہیں لیکن چوہوں کا کوئی وجود نہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ چوہوں کا کوئی وجود نہیں۔" چوہے نے کہا۔

"صرف چوہے کی آنکھ ہی مجھے اچھا کر سکتی ہے اس پیمان کا وجود نہیں۔ اس کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور میری عقل ضائع ہو چکی ہے۔"

چوہا پہاڑ کے اوپر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا لمبا سفر طے کرکے آیا تھا۔ چاہے جو بھی قیمت دینی پڑے۔

"بی لومڑی، چوہوں کا وجود یقیناً ہے۔"

چوہے نے کہا۔ "اور یہ میں یعنی اچھلنے والا چوہا۔ آپ سے کہہ رہا ہوں۔ اس پہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ آپ چاہیں تو میری ایک آنکھ لے سکتی ہیں۔"

چوہے نے جیسے ہی یہ بات کہی۔ اُس کی آنکھ باہر نکل آئی۔ اور لومڑی کی آنکھ میں جاکر فِٹ ہوگئی۔ لومڑی کی عقل اسی وقت ٹھکانے آگئی۔ اس نے چوہے کو پہچان لیا۔

"اُچھلنے والے چوہے" اس نے کہا "میں نے تمھیں پہچان لیا۔ میں تمھیں ضرور اوپر پہاڑ پر پہنچاؤں گی۔"

اس نے چوہے کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ اوپر چڑھنے لگے۔

جیسے جیسے وہ اوپر چڑھتے گئے ہوا سرد اور ہلکی ہوتی چلی گئی۔ آوازیں کم کم ہوتے ہوتے بالکل خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ سناٹا گہرا ہوتا چلا گیا سرد ہوا چوہے کے چہرے سے ٹکراتی اور برف کا ذائقہ اُسے ہونٹوں پر محسوس ہوتا۔ کوئی آواز کبھی ابھار آتی تو اتنی صاف اور تیز کہ دل میں اُترتی چلی جاتی۔

پتہ نہیں وہ کب تک اسی طرح اوپر چڑھتے رہے۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ چوہے کو ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ سفر کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ بالآخر ایک جگہ لومڑی رُکی اور اس سے بولی۔

"اب ہم اوپر پہنچ گئے ہیں۔ میں تمھیں جھیل کے پاس لے جاکر چھوڑ دیتی ہوں۔"

جب وہ جھیل کے پاس پہنچے تو چوہے نے اُس سے کہا۔

"مجھے بتاؤ یہ جگہ کیسی ہے؟"

لومڑی نے اُسے بتایا۔

"ہم لوگ بہت اونچائی پر ہیں۔ یہاں سے بادل بھی کہیں نیچے نظر آتے ہیں۔ کہیں چوٹیاں کُہر کو چیر کر باہر نکل آتی ہیں۔ ہر طرف اطمینان ہے اور انتہا خاموشی۔ میں تمام عمر بھی بیان کروں تو اس منظر اور کیفیت کو بیان نہیں کرپاؤں گی۔"

چوہا لومڑی کی پیٹھ سے کودا۔ جھیل کے کنارے آکر اس نے پنجے پانی میں ڈبوئے۔ اُس وقت اسے خیال آیا کہ دریائے عظیم یہیں سے شروع ہوتا ہوگا۔ اس نے اس کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ رگوں میں طاقت و ہمت کا خزانہ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ ساری تکان دُور ہوگئی۔

لومڑی نے اس سے کہا کہ اب میں واپس جاتی ہوں۔ اگرچہ تمھیں چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ یہاں نہ کوئی سایہ ہے نہ کوئی تمھاری مدد کو آسکتا ہے۔ چوہے نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے دل میں نہ خوف تھا نہ غم۔ اطمینانِ کامل نے اس کے پورے وجود کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لومڑی واپس چلی گئی۔ چوہا وہیں جھیل کے کنارے بیٹھا ہواؤں کے بے آواز سنگیت کو سنتا رہا۔ اُس نے گھاس کو سونگھا۔ اُسے چکھا، ہر چیز اچھی تھی۔ اس کے ذہن میں خیالات آنے لگے ایسے خیال جو اس سے قبل کبھی نہیں آئے تھے۔ اُس نے سوچا کوئی بات نہیں جو میں نہیں دیکھ سکتا۔ پیپل کے نیم تاریک سائے کے نیچے چھوٹے سے گھر میں واپس جانے کی اب اُسے کوئی خواہش نہ تھی۔

اچانک اُسے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ عقاب کی تیز چنگھاڑ ـــــ خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ پروں کی ہر لمحہ قریب ہوتی ہوئی پھڑپھڑاہٹ اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ عقاب کے مضبوط پنجوں نے اس کے ننھے جسم کو اپنے قابو میں لیا تو اسے بہت ڈر لگا۔

وہ پہاڑ سے اُٹھتا چلا گیا اور تب ہی ایک عجیب بات ہوئی اس کا خوف ہوا ہوگیا اور اس کی بصارت لوٹ آئی۔ اُسے رنگ نظر آئے اور ہیولے ـــــ تیز روشنیوں کے سائے دکھائی دیے۔

وہ ہنسا جیسے اُسے پَر نکل گئے ہوں۔ وہ اُڑ سکتا تھا۔ یہ احساس کتنا خوبصورت تھا۔ ہوا کے تھپیڑے! عقاب کی طرح جیسے اس کی بھی ایک چونچ تھی اور تیز آنکھیں جو زمین کی باریک سے باریک چیز کو دیکھ سکتی تھیں۔

ہر چیز صاف اور واضح تھی۔ اُس کے تصور سے کہیں زیادہ صاف اور واضح ـــــ

اسے وہ درخت نظر آیا جس کے سائے میں وہ رہتا تھا۔ ایک چوہا اس وقت بھی بیجوں کو اِدھر اُدھر کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے نزدیک رکون ـــــ لومڑی ابھی پہاڑ کے نیچے پہنچی تھی ـــــ صحرا کے کنارے بھینس ڈکرا رہی تھی۔ دریائے عظیم کے نزدیک اُس نے اپنے دوست مینڈک کو بھی دیکھا چوہے کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا ـــــ وہ ہنس پڑا۔ خوشی اس کے روئیں روئیں میں رقصاں تھی۔ اس نے اپنے دوست مینڈک کو آواز دی لیکن اسے اپنی آواز بدلی ہوئی لگی۔

"کہو بھائی عقاب" مینڈک کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔

وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا۔

○

یا تو چپ ہی رہنے دے
یا جو چاہوں کہنے دے
یہ سارے دکھ میرے ہیں
تو مجھ کو ہی سہنے دے
اپنا دکھ تو بھول گئے
غیروں کے غم سہنے دے
روکا تو رُک جائے گی
جیون ندیا بہنے دے
آنے والی نسلوں کے
حصے میں کچھ رہنے دے

○

اِک تیرے ہی آنے تک
زندہ ہوں مر جانے تک
اس کے آتے ہی مہکیں گے
گلشن کیا ویرانے تک
کیا رستہ کٹ جائے گا
سورج کے ڈھل جانے تک
اُس کو ڈھونڈھ کے لائیں گے
پہنچیں گے تہہ خانے تک
اُس کی یاد میں روتے ہیں
آنکھیں کیا پیمانے تک

شاہد عزیز

۱۷۹، قلعہ ٹولی، اودے پور ۳۱۳۰۰۱

اسعد بدایونی

ہوائے صبح سے کہنا، چراغِ شام سے کہنا
ملالِ رفتگاں روشن ہے کس کس نام سے کہنا

جو آنسو بھاپ بن کر اُڑ گئے اُن کی حکایت کو
کسی دیوار یا در سے نہ کہنا بام سے کہنا

وہ سارے سچ جو ہم نے تم کو بخشے ہیں وراثت میں
جو تم خود سے نہ کہہ پاؤ ہمارے نام سے کہنا

پرندوں نے شگوفوں کی طرح کھولی تھیں منقاریں
مگر شبنم نہ اُتری آسماں کے بام سے کہنا

ادھوری داستانیں ہر طرف دنیا میں بکھری ہیں
کسے آغاز سے سننا کسے انجام سے کہنا

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

محمد ذاکر

نظیر اکبر آبادی کی نظم

آدمی نامہ

اُردو میں بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں۔ اہم ظموں کا شمار بھی آسان نہیں۔ اہم نظموں سے ماری مراد ایسی نظموں سے ہے جو فکر یا فن یا ہر و کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہیں چاہے ان ی تقلید کی گئی ہو یا نہیں۔ نظیر کی نظم "آدمی نامہ" یسی ہی ایک نظم ہے۔

نظیر ۱۸ ویں صدی کے وسط و اواخر اور یسویں صدی کے اوائل کے شاعر تھے۔ دلّی میں یدا ہوئے، فلاکت کا سماں دیکھا اور غالباً بدالی کے دلی پر حملوں کے بعد اپنے لواحقین کے اتھ اکبر آباد یعنی آگرے جا کر مقیم ہو گئے۔ وہیں نکی شادی ہوئی اور وہیں انھوں نے معلّم پیشگی ں عمر بسر کی۔ ملازمت یا امرا کی مصاحبت کو ھوں نے پسند نہیں کیا۔ خواص سے زیادہ ھوں نے عوام سے سروکار رکھا اور ان کی ندگی کو پیش کرنے میں ایک نوع کی بے نیازانہ ں لگی سے کام لیا۔ ہندستان اور ہندستانیت ن کی شاعری کا جوہرِ اعظم ہے۔ یہاں کے موسم، ج و شام کی کیفیت، یہاں کے پھل پھول، چرند ند، یہاں کے عوام کے صبح و شام، ان کے اغل، ان کے تہوار اور تقریبات کی کیفیت حرک تصویروں کی طرح ان کے ہاں پیش ہوئی ں۔ لیکن "آدمی نامہ" نظیر کی ایسی نظم ہے جو ندستان اور ہندستانیت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ پورے آدمی کا، پورے انسانی سماج احاطہ کرتی ہے، وہ بھی محض ایک محدود تاریخی دور ہی کے آدمی یا سماج کا نہیں بلکہ اس کی معنویت آفاقیت کا رنگ دکھاتی ہے۔

"آدمی نامہ" میں نظیر آدمی کو ہر محدود نظر اور نظریے سے بظاہر بے پروا ہو کر دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ آدمی ویسے بھی اس کے ہاں سپاٹ، گُھٹی گُھٹی، گُھس اور یک رنگ اکائی نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ عقلِ محض یا محدود نظریے پر مبنی فکر و فلسفے کی یک رُخی یا اُس کی منجمد حدود میں رہتے ہوئے آدمی کی گوناگوں فطرت کو سمیٹا بھی نہیں جا سکتا۔

"آدمی نامہ" میں ہمارے سامنے آدمی اپنی مختلف سماجی حیثیتوں اور انفرادی اخلاقی خصائص کے ساتھ اپنے روزمرّہ کے معمولات و مشاغل میں مصروف پیش کیا گیا ہے۔ آدمی اپنے ان معمولات یا سرگرمیوں میں عُلوی جذبات سے متاثر ہو یا سِفلی جذبات سے، ان اعمال کی بنیاد پر وہ کس حد تک احسنِ تقویم پر خلق کی ہوئی مخلوق ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور کس حد تک اسفل السافلین ہونے کا، اس تقسیم و تخصیص میں بظاہر نظیر نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ فیصلہ آپ پر ہے اگر آپ چاہیں لیکن نظیر کی نظر کی صداقت سے انکار کی جرأت کسی کو نہ ہوگی۔

اس نظم پر مزید کچھ کہنے سے پہلے اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں مگر یہ یاد رہے کہ نظیر جبر و قدر کا کوئی فلسفہ نہیں پیش کر رہا بلکہ بغیر تعصب یا ذہنی تحفظ کے آدمی کی کل حیثیتی تصویر ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بینوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعوا خدائی کا
شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دُور
کُل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی، رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن و نماز یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

چلّائے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اگر یہ مان لیا جائے کہ حیات ایک نہ سمجھ میں آنے والی منزل سے ایک اور نہ سمجھ میں آنے والی منزل یا خلاء سے خلا کی طرف ایک سفر ہے، ازل سے ابد کی طرف ایک مسلسل حرکت ہے، مادے اور غیر مادے کے درمیان ایک عجیب وغریب رشتہ ہے اور یہ سب کچھ جو ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں ان کے پیچھے کوئی منظم یا غیر منظم اسکیم یا منصوبہ ہے اور ان میں حادثے وقوع میں آتے رہتے ہیں اور مختصراً اس عالم آب وگل میں آدم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے چاہے وہ کتنی بھی موہوم سہی، تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر اسی آدمی کی سماجی وانفرادی حیثیت بلکہ کہنا چاہیے ہمہ رُخی تصویر پیش کرتا ہے۔ بادی النظر میں دنیا میں آدمی کو اس طرح دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ بس دنیا کو ایک تماشا گاہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اور نظیر جذبات سے مبرّا ہو کر ایسے مقام سے گفتگو کر رہا ہے جہاں مقصدیت بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ بظاہر اس منزل پر نہ آدمی کی ادّعائی بزرگی پر غصہ آتا ہے اور نہ اس کی خواری پر ترس آتا ہے بظاہر ایک نامعلوم جبر کا عمل دخل یا کھیل معلوم ہونے لگتی ہے یہ انسان کی دُنیا' یا کسی احمق کی سنائی داستاں۔ غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ " آدمی نامہ " دراصل بڑے سماجی کینوس پر 'خوے آدم دارم' آدم زادہ ام' کی یک گونہ تفسیر ہے ایک جانکاہ سوال کے ایسے روپ میں جس پر نظیر نے انتہائی فنی مہارت سے پردہ ڈال رکھا ہے۔

" آدمی نامہ " ایک ایسی نظم ہے جس پر غور کرنے سے نظیر کے فکر وفن کی انفرادیت نمایاں طور پر ظاہر ہو سکتی ہے۔ مخمس بیانیہ کے بہاؤ کے لیے کتنی کارآمد ہے اور اس میں ٹیپ کا مصرع کسی خاص نکتہ کو ذہن نشین کرنے میں کتنا ممد و مددگار ہوتا ہے اس کی وضاحت " آدمی نامہ " سے بخوبی کی جا سکتی ہے۔ اس میں مشاہدہ یا بیان اور تاثر وفکر کی رَو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس طرح کے اس امتزاج سے سامع یا قاری کو لطف بھی آئے اور ساتھ ساتھ شاعر کا اصل مقصد، یعنی انسانی سماج کا تضاد، اس کے ذہن میں پیوست ہوتا جائے۔ پھر پانچ پانچ مصرعوں کی بندش سے اگر نظم یا بیانیہ طویل بھی ہو جائے تو سامع یا قاری کو منزل منزل چلنے کی وجہ سے گراں نہ گزرے۔

" آدمی نامہ " بظاہر محض عینی مشاہدات یا تاریخی واقعیت پر مبنی غیر جانبدارانہ معصوم و ناوابستہ معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں سماج کے سارے طبقے، اشرافیہ اور اجلافیہ اپنے اچھے بُرے کارآمد اور ناکارہ خصائص اور سرگرمیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان میں کچھ سرگرمیاں مستحسن سمجھی جاتی ہیں، کچھ ایسی ہیں جو قابلِ معافی ہیں کچھ کی اچھائی برائی کے بارے میں یک لخت کچھ نہیں کہا جا سکتا؛ کچھ ایسی ہیں جو حقیقتاً سماجی برائیاں ہیں ناقابلِ معافی۔ لیکن نظیر ان میں سے کسی پر حکم نہیں لگاتا۔ نظم کو وہ یک رُخی نہیں بناتا۔ قدروں کو کوئی اضافی مانے یا نہ مانے لیکن عمل کی اس دُنیا میں آدمی ہی کو تمام اقدار کا نسب نمایا DENOMINATOR ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آدم آفریدۂ خدا ہے مگر معاشرہ سازی آدم کا کارنامہ ہے نظیر پورے معاشرے کو ہدف بنا کر اس کا کچا چٹھا کھولتا ہے معاشرے کا ایک فوٹو کیا ہے اور ایک کیا؛ یہ دکھانے کا مقصد کیا یہ نہیں ہے کہ آدمی آدمی ہی سے کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے؛ سماج کے تضادات کو ایک ایک کر کے گنوانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؛ نظیر کی پیش کش بے شک پُر فریب ہے جیسے وہ بس کانوں سنی یا آنکھوں دیکھی واقعیت ہی بیان کر رہا ہو۔ غور کریں تو یہ سب تضاد ہمیں اقداری فیصلوں پر مجبور کرتے ہیں باوجود اس احساس کے کہ ہمارے ایسے سارے فیصلے حتمی نہیں ہو سکتے محض اضافی ہی رہتے ہیں۔

" آدمی نامہ " میں نظیر جابکدست مصوّر ہی نہیں بلکہ پُرفن اور چالاک بلکہ ستم ظریف محتسب معلوم ہوتا ہے فنونِ لطیفہ جنہیں شاعری بہرحال شامل ہے ان میں اور سماجی احتساب میں کیا اور کیسا رشتہ ہے؟ سماج سازی یا سماج کے اُفقی یا عمودی ارتقا میں یا تھیسس، اینٹی تھیسس اور سِن تھیسس کی منزلوں سے سماج کے گزرنے اور اُسے گزارنے میں فنونِ لطیفہ یا فنکاروں کا کیا حصّہ ہے؟ ان امور پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ " آدمی نامہ " میں نظیر کا عندیہ یہی ہے کہ وہ بتا دے کہ یہ ہے زندگی، یہ ہے تمہاری دنیا، مذہب کی، اخلاق کی، تمہاری معیشت کی، تمہاری فکر کی، تمہارے علم ودانش کی، بزرگی وتقدس کی، رندی وسرمستی کی، بلندی اور پستی کی ــــــ وہ ایک ایک تصویر اُبھارتا ہے جیسے سوال کرتا جاتا ہے، کیوں ہے نا یہی تمہاری دنیا؟ ہے نا اس کا یہ رنگ

اور یہ رنگ ــــــ اور یہ رنگ؛ یہی
ہیں نا تمھارے اپنے زعم میں معزز و مفتخر یا
مضحک اور گھناونے کردار، ماضی کے اور
حال کے بھی؛ کوئی مُلّا، کوئی حکیم، کوئی ویدؔ
کوئی نمازی کوئی قاضی، کوئی آقا کوئی غلام،
کوئی شاہ کوئی گدا، کوئی عیاش، کوئی قلاش،
اور یہ سب کردار اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے
کام میں سرگرم ہیں جیسے یہی مخصوص سرگرمی ان کی
فطرت ہو؛ اور یہ سب ایک ہی بستی میں بستے
ہیں، ایک دوسرے سے ٹکر کھاتے ہیں؛
ایک دوسرے سے اتنے قریب کہ جسم سے جسم
ملی اور ایک دوسرے کے سانس کی گرمی محسوس
کرتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں اور مشاغل
مختلف النوع، درجے متفاوت، پیشے جُدا،
خصلت جُدا ہستی کا سارا ہنگامہ ہی مشتمل ان
لوگوں سرگرمیوں پر ہے۔ لیکن کیا ان سرگرمیوں
میں کچھ ایسی نہیں ہیں جو سماجی اقدار کی بنا پر ان
ہی نا قابلِ معافی ہیں؛ انسانیت کے لیے
آدمیت کے لیے باعث شرم ہیں؟ کیا جو کچھ
ہے اور جس طرح ہے مناسب اور درست ہے؟
پوری نظم اس طرح ایک سوال بن کر ہمارے
سامنے کھڑی ہو جاتی ہے کہ یہ کیا سماج ہے جس
کا ہم سامع یا قاری رہ رہے ہیں، رہے جاتے
ہیں؛ اس سے انکار کی کیسے جرأت کہ یہ سب
کردار آدمی ہیں جنھیں اعضائے یک دگر کہا
جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے اتنے
بے خبر کیوں؟ اور اگر بے خبر نہیں تو اتنے بے
دل کیوں؟ اتنے بے آدمیت کیوں؟

اس طرح جس سماج کا مرقع ہمارے
سامنے آتا ہے نظیر اسی کو ہدف بناتا معلوم
ہوتا ہے۔ وہی سماج جو جاگیرداری کی انتہائی
منزل کو پہنچ کر بکھر بکھر کر باقی رہے جاتا ہو۔
یہ جاگیردارانہ شہری سماج ہے۔ نظیر خود بھی
اسی کا جزو ہے لیکن نظم "آدمی نامہ" میں محسوس
ہوتا ہے کہ جیسے وہ صورت حال پر بڑی فنکاری
سے ناقدانہ نگاہ ڈال رہا ہو، واقعیت کا مرقع
کھینچ کر جیسے وہ اس طرف متوجہ کر رہا ہو۔

یہ اُس کی شعوری کاوش شاید نہ ہو
کیونکہ اُس دور میں اُردو شعر و ادب بلکہ شاید
اردو معاشرے میں حالات یا واقعیت کے
ایسے تجزیے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن
عظیم فنکار ہمیشہ اپنے عہد سے آگے ہوتا ہے۔
وہ عہد ساز ہوتا ہے۔ اس نظم کی تہہ میں نظیر
کی صورتحال سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی ہے
لیکن وہ مایوسی و نامرادی کی فضا پیدا نہیں
ہونے دیتا اور خوب سے خوب تر کا خیال محو
نہیں ہونے دیتا۔ آرٹ کا جو کارنامہ نامرادی
اور قنوطیت کی فضا پیدا کرنے تک محدود ہو
دیرپا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عظیم آرٹ کی پہچان
یہ ہے کہ وہ آفاقیت کا پہلو رکھتا ہو، اپنے
خالق سے زیادہ دیرپا ہو، صرف اُسی کے
زمانے کی واقعیت یا روح کو نہ سمیٹے۔ غور تو
کیجیے جمہوریت اور اشتراکیت کے اس دور
میں، اور سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقی کی بدولت
قدرت پر انسانی فتح و کامرانی کے اس دور میں
کیا سماجی صورت حال واقعی اطمینان بخش
ہے؟ طبقے ہیں کہ مر مر کر نئے نئے روپ سے اُبھر
آتے ہیں۔ آدمی کا کلی حیثیتی کردار آج بھی بہت
زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہیں واضح ہو جاتی
ہے "آدمی نامہ" کی عظمت اور معنویت۔

ابھی کہا گیا تھا کہ نظیر مایوسی و نامرادی
کی کیفیت نہیں پیدا ہونے دیتا۔ وہ تو خندہ
پیشانی سے واقعیت سے آشنا ہو کر اسے
سمجھنے اور اگر ہو سکے تو اس پر سنجیدگی سے
غور کرنے کی سکت و صلاحیت بیدار کرنا
چاہتا ہے۔ اور یہ "آدمی نامہ" کا روشن پہلو ہے
نظم میں واقعیت کے جو جو پہلو ابھرتے ہیں ان
میں سے اپنے خیال یا کیسے اپنی طبقاتی حیثیت
کی وجہ سے غیر مستحسن سرگرمیوں پر ہمارے دل
میں اکراہ کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے اور شاید
نفرت کا بھی لیکن بس ذرا کی ذرا کیوں کہ کُل
صورتِ حال سے آشنا ہوتے ہوتے ایسا
جذبہ پیچھے ہٹ جاتا ہے تاوقتیکہ نظم کے اختتام
پر از سرِ نو جائزہ لینے پر فکر کو جھٹکا سا لگتا ہے،
وہی جھٹکا جو خوب سے خوب تر کی جستجو اور ٹٹول
کا سبب اور محرک بنتا ہے۔

انسانی سماجی نظام کی شکستگی جس طرح
نظیر کے ہاں زیریں لہر کی طرح موجود ہے اس پر
سنجیدگی سے نظر ہی نہیں ڈالی گئی۔ کافر فنکار
تھا نظیر کیونکہ اسی زیریں لہر کو اس نے سطحی
تموّج کے پردے میں چھپا لیا
اور یہ سطحی تموّج زبان و
بیان دونوں پر مشتمل تھا نظم کا بہاؤ اور واقعیت
کو پیش کرنے کی ترتیب اور انداز انفرادی شان
رکھتا ہے۔ ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کا آدمی
ہو یا آج کے جمہوریت و اشتراکیت آشنا
سماج کا وہ یہاں "آدمی نامہ" میں اپنی پوری
کامیابی اور ناکامی، اپنے پورے کرّوفر اپنی عظمت
اور ذلت و ضلالت کے ساتھ بے نقاب ہو جاتا ہے۔
"آدمی نامہ" ایک ایسا پُر تاثیر منظومہ ہے کہ اگر
غور کیا جائے تو ہر آدمی جو ذرا بھی فہم و شعور،
عقل و تمیز رکھتا ہو، دل ٹوٹنے پر مجبور ہو جائے
اور شاید صورتِ حال کے ضبط کا یارا نہ رہے۔

اسس آشوب آگہی کو انگیز کرنے کا، اسے مدبّر کرنے کا ایک وسیلہ خود اس نظم کا پیرایۂ بیان ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

"آدمی نامہ" کا نمایاں طور پر نہاں طنز مزاح کا پیرایہ رکھتا ہے۔ فی الواقع اسس کی یہ خوبی اسے عجوبہ بنا دیتی ہے۔ اس کا طنز گھناؤنا انداز نہیں رکھتا۔ وہ بپھر کر، برہم ہو کر سب و شتم یا گالم گلوج بھی نہیں کرتا، نہ وہ عاقبت کا خوف دلاتا ہے، نہ اخلاقی اقدار کا واسطہ دیکر غیرت دلاتا ہے۔ یہاں طنز و تمسخر کا ایک ہدف، ایک فرد، ایک طبقہ یا ایک نظام نہیں بلکہ آدمی ہے جس میں سامع یا قاری بھی شامل ہے لیکن وہ اسے پڑھ کر مکدر یا برافروختہ نہیں ہوتا، نہ طنز و تمسخر میں نظیر کا ہمنوا بنتا ہے۔ نظیر کا یہ مقصد بھی نہیں۔ نہ مذاق اڑانا اس کا مقصد ہے۔ وہ تو بظاہر معصوم استعجابیت کے ذریعے ہمیں متوجہ و متنبہ کرتا ہے۔ سودا کا قصیدہ در تضحیک روزگار حقیقتاً شہر آشوب تھا، ایک مخصوص سیاسی اقتصادی عسکری صورت حال پر ایک ہجویہ طنز لیکن زمانی اعتبار سے اس کی اپیل محدود ہے۔ اس کے برخلاف نظیر کے "آدمی نامہ" کو آدم آشوب کہنا بجا ہوگا۔ اُردو کے شہر آشوبوں سے زیادہ دیرپا ہے اس کی معنویت "آدمی نامہ" شہر آشوبوں کی طرح ایسا آئینہ نہیں ہے جس میں سامع یا قاری اپنے چہروں کے سوا اور سارے چہرے دیکھ لیتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ایسے طنز کی تحریروں کو دستاویزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ نظیر کا طریق جداگانہ ہے۔ مبارک ہے وہ فنکار جو اپنے آپ کو نہایت غیر محسوس طور پر مطعونوں میں شمار کر کے دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ نظیر "آدمی نامہ" کے ذریعے ہمارے دل میں اُتر کر، ہم جو خود مطعونوں میں، اپنے دشمنوں میں ہیں، ہمیں چونکا دیتا ہے۔ مکاری، چالبازی اور ریاکاری شاید اتنی المناک بات نہیں جتنی یہ بات کہ آدمی کی اپنی کمیوں اور خرابیوں پر شرمندہ ہونے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے۔ نظیر کے دل میں کیا یہ خیال تو نہیں تھا کہ ہم میں شرمندگی کا احساس پیدا کردے؟ ایسی شرمندگی جو انسانیت ہی کا ایک تابناک بلکہ لازمی پہلو ہے؟ اٹھارہویں اور اوائل انیسویں صدی ہی نہیں بلکہ آج کے جمہوریت اور اشتراکیت آشنا انسانی معاشرے کو شاید کسی اور شعری صنف کے ذریعے، کسی اور پیرایۂ بیان کے ذریعے اس آدم آشوبیت کی طرف اس طرح مفصّل طور پر اور ایسی لطف انگیزی کے ساتھ متوجہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

پرویز یداللہ مہدی

زمینی اُڑن طشتریاں

ایک طشتری وہ ہوتی ہے جو پیالی کے ساتھ اُسی طرح نتھی ہوتی ہے جیسے ڈاکخانے کے لفافے کے ساتھ ٹکٹ ـــــ طشتری اگر پیالی کے زیرِ سایہ ہو تو اس کی شوبھا بڑھاتی ہے اور اگر اس کی چھتر چھایا پیالی کے اوپر ہو یعنی طشتری پیالی کے اُوپر ڈھکی ہو تو ڈھکن کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے۔ وقت تنگ ہو اور چائے یا دودھ خاصا گرم، تو ایسے نازک وقت میں طشتری ایک کارگر ثالث کا کردار بڑی کامیابی سے چٹکیوں اور چُسکیوں میں ادا کرتی ہے یعنی گرم مشروب کو لمحوں میں ٹھنڈا کر کے پیاس بھی بُجھاتی ہے اور وقت بھی بچاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ناخواندہ مہمانوں کی اچانک آمد پر مشروبات کے علاوہ ماکولات کو بھی اپنے مختصر و محدود دائرۂ اختیار میں سمیٹ کر چہار کھونٹ، آپ کی مہمان نوازی کے ڈنکے بھی بجوا دیتی ہے۔ اگرچہ طشتری کا اپنا گھیر، قطر کے اعتبار سے خاصا مختصر ہوتا ہے پھر بھی خطرے کے وقت یہ ایک دور مار مزائل کا کام بھی دیتی ہے۔ یعنی ایمرجنسی میں اسے ہوا میں اُچھال کر کچھ دیر کے لیے دشمن کی اچانک یلغار کو کامیابی کے ساتھ روکا جاسکتا ہے۔ تاہم اس جنگی وصفِ خصوصی کے باوجود یہ کہلاتی طشتری ہی ہے، اڑن طشتری کا رتبہ بلند اسے پھر بھی حاصل نہیں ہوتا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ شیر کی کھال اوڑھ لینے سے گیدڑ شیر نہیں ہوجاتا، گیدڑ ہی رہتا ہے!

پہلے طشتری وجود میں آئی یا اڑن طشتری اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ کس کو کس پر سبقت حاصل ہے یہ ثابت کرنا اتنا ہی کٹھن ہے جتنا کہ یہ ثابت کرنا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا ... ؟ اڑن طشتریوں کے تعلق سے اولادِ آدم شروع سے عجیب و غریب مفروضات تصورات، تخیلات، بلکہ توہمات کا شکار رہی ہے۔ ان کے وجود و عدم کے تعلق سے ترقی یافتہ ملکوں کے سائنسدانوں اور علمِ فلکیات کے ماہروں میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے ایک طبقہ اسے محض انسانی ذہن کی قیاس آرائی سے تعبیر کرتا ہے تو دوسرا مختلف دلائل کی رُو سے اسے ایک ٹھوس حقیقت تسلیم کرتا ہے اور ثبوت کے طور پر مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں اڑن طشتریوں کے دیکھے جانے کے مسلّمہ ریکارڈ کو پیش کرتا ہے۔ آخرالذکر طبقے کی برسوں کی ریسرچ اور کھوج کے مطابق اڑن طشتریاں دراصل اُن انجانی اَن دیکھی مخلوقات کی صبا رفتار سواریاں ہیں جو علمِ فلکیات کی رُو سے مریخ و دیگر سیاروں میں پائی جاتی ہیں۔ اور سائنس، ٹکنالوجی اور خلائی ترقی کے معاملے میں اشرف المخلوقات سے کہیں زیادہ اڈوانس ہیں چنانچہ جب ان کا جی چاہتا ہے جب موڈ ہوتا ہے، اپنی طشتریوں کو ایڑ لگا کر تفتیش و تحقیق کی نیت سے کرۂ ارض کا رُخ کرتی ہیں۔ زناٹے کے ساتھ آتی ہیں، زناٹے کے ساتھ یہ جا، وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں، تب ہی تو ان م[illegible] ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، کا گمان ہوتا ہے یہ اپنی آمد و رفت کو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھتی ہ[illegible] نہ آنے سے پہلے اپنی آمد کا پتا دیتی ہیں نہ جانے سے اپنی رخصتی کی خبر ـــــ ان کے اسی سسپنس ک[illegible] وجہ سے دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ان کے تعلق سے آج بھی تحیر، تجسس اور تعجب میں مبتلا ہیں بقول غالب:

> ناکامیِ نگاہ ہے، برقِ نظارہ سوز
> تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

جن ممالک کے باشندوں نے کائنات کے ان عجائبات کا اپنی چشمِ بینا سے دیدار کیا ہے ان کی خوش نصیبی پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے لیکن سچ پوچھیے تو اُڑن طشتریوں کے دیدار سے مشرف ہونے کا سب سے پہلا حق اگر کسی کا بنتا ہے تو وہ، ہم تیسری دنیا کے باشندے ہیں تیسری دنیا کی یہ تازہ ترین اصطلاح دراصل کرۂ ارض کے ان غریب اور پسماندہ ممالک کے لیے استعمال کی جاتی ہے جہاں کے عوام کی سماجی، معاشی ثقافتی، سیاسی ہر طرح اور ہر سطح کی زندگی تیسرے درجے سے کبھی اوپر نہیں اُٹھتی، ہمیشہ تھرڈ گریڈ اور تھرڈ ریٹ کے "چکرویوہ" میں پھنسی رہتی ہے۔ تیسری دنیا کا یہ لقب جو اصل میں ایک مہذب گالی ہے پہلی اور دوسری دنیا کی بڑی طاقتوں کی جانب سے ہمیں تحفے میں ملا ہے، تاہم اپنی غربت، افلاس، پسماندگی اور پچھڑے پن کے باوجود اڑن طشتریوں کے دیدار کے ضمن میں پہلی اور دوسری دنیا کے ترقی یافتہ باشندوں پر اپنی فوقیت کا زبانی دعویٰ محض ناس[illegible]

بی ۲۶، چوتھی منزل، بہرام باندرہ (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۱

بنا پر کر رہے ہیں کہ ہمارے عقیدے کے مطابق رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ بلاؤں اور آفتوں کا نزول بھی آسمان ہی سے ہوتا ہے بلکہ ہم تو ایسی باتوں کا تعلق بھی آسمان سے جوڑ دیتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست زمین سے ہوتا ہے یعنی جو خالصتاً ارضی ہوتی ہیں مثلاً جب کہیں زلزلہ آتا ہے، زمین پھٹتی ہے تو ہم ڈائرکٹ آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ملک میں کہیں باڑھ آتی ہے یا سوکھا پڑتا ہے تب بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں، انتہا یہ کہ جب امریکہ اچانک اپنی امداد بند کر دیتا ہے تو بھی ہم گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں ـــــ آسمان سے اس قدر گہرے مراسم کے باوجود غیب سے ظہور میں آنے والی اڑن طشتریوں کے دیدار سے ہماری مستقل محرومی یقیناً ہماری اپنی کاہلی بلکہ نااہلی کا نتیجہ ہے۔

تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے بارے میں تو خیر ہم نہیں جانتے البتہ اپنے ہاں اُڑن طشتریوں کے راست نزول سے مایوس ہو کر یار لوگ برسوں سے ان کا نعم البدل ڈھونڈنے کی جو کوشش کر رہے تھے وہ بالآخر ایک روز بار آور ہو گئی اور ہم اپنی خود ساختہ اڑن طشتریاں ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے اتفاق سے ان زمینی اڑن طشتریوں میں وہ سارے کے سارے اوصافِ حمیدہ بدرجۂ اتم موجود ہیں جو مریخی اڑن طشتریوں کا خاصا ہیں یعنی یہ بھی اپنی صبا رفتاری، حیرت انگیز کارگزاری کے باعث مثالِ صورتِ خورشید اِدھر ڈوبیں اُدھر نکلیں، اُدھر ڈوبیں، اِدھر نکلیں کی دوڑتی پھرتی تصویریں ہیں۔ یہ نادر روزگار زمینی اڑن طشتریاں عرفِ عام میں آٹو رکشا کہلاتی ہیں۔ ہمیں اگرچہ اپنی چشمِ گنہ گار سے تاحال کوئی اصلی اُڑن طشتری دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن آٹو رکشا کی ساخت ہئیت اور ڈیزائن کو دیکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اڑن طشتریاں یقیناً ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

آٹو رکشاؤں کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں ڈیزائن کرتے، ڈھالتے اور بناتے وقت بلاشبہ اڑن طشتریوں کے ایسے تمام "بلو پرنٹ" متعلقہ انجینیروں اور کاریگروں کے پیشِ نظر رہے ہوں گے جو ترقی یافتہ ملکوں کے اکثر و بیشتر سائنسی میگزینوں اور رسالوں میں اڑن طشتریوں کے باب میں کچھ اصل ہے، کچھ خواب ہے، کچھ طرزِ ادا ہے کی بنیادوں پر تصویروں کی صورت شائع کیے جاتے رہے ہیں سچ پوچھیے تو اڑن طشتریوں کے بلو پرنٹ اگر رہنمائی نہ کرتے تو آٹو رکشا جیسی "تکونی سواری" کا وجود میں آنا ناممکن ہوتا۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ بے ڈھب اور بے ہنگم سواری کی مثال ملنا مشکل ہے۔ پیچھے سے مستطیل، آگے سے تکونی، ڈھانچے کی بناوٹ میں بھی ملاوٹ، یعنی آدھی دھات، آدھا ٹاٹ، اس پر یہ ٹھاٹ باٹ، سارا تکونی وجود چھوٹی بحر کے تین عدد پہیوں پر ٹکا ہوا، اس پر چال:

اسد اللہ خاں قیامت ہے

علم الاعداد کی رُو سے تین، تیرہ، نو اور اٹھارہ کے ہندسے نحس تاریخوں کی طرح منحوس، تصوّر کیے جاتے ہیں اور آٹو رکشا کو تین کے عدد سے ایک نسبت خاص ہے، یعنی سواری بھی تین پہیوں کی اور گنجائش بھی صرف تین سواریوں کو ڈھونے کی۔

ہم اپنے مشاہدے بلکہ تجربے کی بنا پر یہ بات ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ سڑکوں پر دوڑتی لاتعداد "جفت" سواریوں کے بیچ آٹو رکشا وہ واحد "طاق" سواری ہے جو 'پر' بے شک نہیں رکھتی طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے بلکہ قدم قدم پر اپنی طاقتِ پرواز کا عملی مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں تو شہر کی شاہراہوں پر دیگر سواریوں سے لوہا لیتے انہیں اوورٹیک (OVER TAKE) کر کے پیچھے چھوڑتے ہوئے آٹو رکشاؤں کا دور سے جائزہ لیجیے چند ہی لمحوں میں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ دوڑنے اور اُڑنے، کے بیچ جو خطِ فاصل ہے وہ کس طرح کھنچ کر ایک ہی نقطے پر آ جاتا ہے اور پھر یہ نقطۂ اتصال رگوں میں دوڑتے پھرتے خون کو شرطیہ نقطۂ انجماد پر پہنچا کر دم لیتا ہے۔ اگر یہ ہوش رُبا منظر دیکھنے کے باوجود کسی کے ہوش و حواس بدستور قایم و دایم نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ شخص مذکور کا جی یا تو دنیا سے اُچاٹ ہو چکا ہے یا پھر وہ ذاتِ شریف بذاتِ خود آٹو ڈرائیور ہے۔

جس شخص کے ہاتھ میں آٹو رکشا کی نکیل سہاگنوں کا سہاگ، شوہروں کا بھاگ، بہنوں کی راکھی کی لاج، معصوم بچپن کا آسرا، مخدوش بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے، اور جس کی ذرا سی غفلت اور ناعاقبت اندیشی بیویوں کو بیوہ، شوہروں کو رنڈوا، بہنوں کو لاوارث بچوں کو یتیم اور بوڑھوں کو بے سہارا کر سکتی ہے وہ اصطلاحِ عام میں آٹو ڈرائیور کہلاتا ہے، گویا یہ اپنی جان تو ہتھیلی پر رکھتا ہی ہے، دوسروں کی بھی جان وقتی طور پر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔ شاید آٹو ڈرائیور برادری اپنے ڈرائیونگ لائسنس کو دوسروں کی موت کا پروانہ یعنی "LICENCE TO KILL" کا کھلا

اجازت نامہ تصور کر کے خود پر سات خون معاف" سمجھتی ہے۔ ٹیکسیوں و دیگر جفت سواریوں میں آپ بغل والی نشست پر قبضہ جما کر اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھ سکتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر عملی مداخلت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آٹو رکشا میں آپ کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس میں نشستوں کا انتظام کچھ اس ڈھنگ سے کیا گیا ہے کہ صدارتی کرسی بلا شرکتِ غیرے ڈرائیور کے حصے میں اور بجلی کی کرسی یعنی الکٹرک چیئر (ELECTRIC CHAIR) سواریوں کے حصے میں آتی ہے، بالفاظِ دیگر مسافر کو بے زبان مقتدی کی طرح ڈرائیور کی امامت میں بلا چوں چرا ایسے سفر کرنا پڑتا ہے اور اگر بدقسمتی سے مقتدی کا قد ہماری طرح غیر ضروری حد تک اونچا ہو تو آٹو کی نیچی چھت اُسے دورانِ سفر تہہ بہ تہہ ہو کر بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے، اس طرح سر تو زخمی ہونے سے بچ جاتا ہے لیکن گھٹنوں کی خیریت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ہم تو جب بھی آٹو میں سفر کرتے ہیں "رکوع" کی حالت میں کرتے ہیں، شاید اسی مخصوص پوز کی وجہ سے ابھی تک زندہ ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ٹریننگ کے دوران آٹو ڈرائیوروں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھادی جاتی ہے کہ آٹو رکشا کا سب سے اہم اور فعال حصہ اگر کوئی ہے تو وہ اگلا حصہ ہے لہٰذا اوورٹیک کرتے وقت تمام تر توجہ اس حصے پر مرکوز ہونا چاہیے، اگر آٹو کا اگلا حصہ اس مرحلۂ سخت سے بخیر و خوبی مسکے میں سے بال کی طرح نکل گیا تو پچھلا حصہ از خود پتنگ کے پیچھے ڈور کی صورت آگے نکل آتا ہے۔ خدا نخواستہ اگر اس مرحلے کے دوران کوئی ناگہانی حادثہ پیش آجائے تو ڈرائیور کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا بلکہ:

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

کے مصداق صرف پچھلے حصے پر اَغل بغل اور عقب کی گاڑیوں کا قہر ٹوٹتا ہے۔ ویسے بھی آٹو ڈرائیور کو پچھلے حصے سے کوئی خاص مطلب نہیں ہوتا، سوائے ان اوقات کے جب مسافروں کو مقامِ مطلوبہ پر پہنچا کر ان سے کرایہ وصولنا ہوتا ہے۔

آٹو ڈرائیوروں کے انداز، اطوار، کردار، گفتار اور رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے اسی طرح ناکام پائلٹ اگر چاہے تو آسانی سے ایک کامیاب آٹو ڈرائیور بن سکتا ہے۔ یہ بات ہم بے شمار پائیلٹ نما ڈرائیوروں کو شخصی طور پر بھگتنے کے بعد کہہ رہے ہیں۔ اس قبیل کے آٹو ڈرائیوروں کی پہچان بڑی آسان ہے، جس طرح پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں ان حضرات کی ماہرانہ ڈرائیونگ کا اندازہ آٹو اسٹارٹ کرتے ہی ہو جاتا ہے، اس جھٹکے سے اسٹارٹ لیتے ہیں کہ طیارے کے ٹیک آف کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جب اسٹارٹ ہی ایسا ہو تو ظاہر ہے سفر کا اختتام 'لینڈنگ' پر ہی ہوگا۔

آخر میں مقطع والی سخن گسترانہ بات بھی آپ کے گوش گزار کرتے چلیں، ہر آٹو رکشا میں ایک عدد "میٹر" ضرور نصب ہوتا ہے تاکہ مسافت کی مناسبت سے کرائے کی ادائیگی میں سہولت رہے لیکن آٹو ڈرائیوروں کی اکثریت میٹر کو محض شو پیس (SHOW PIECE) تصور کرتی ہے اور میٹر کے بجائے اپنی 'مرضی' سے چلتی ہے، 'مرضی' جس کا دوسرا نام ہے خود غرضی اور خود غرضی کے آگے نہ کسی اور کی مرضی چلتی ہے نہ عرضی، کیونکہ مرضی چاہے ایک معمولی آٹو ڈرائیور کی ہو یا عالی جناب عزت مآب صدر امریکہ کی بے بس اور لاچار عوام الناس کے پاس دونوں کے آگے سر جھکانے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ بقول شاعر:

کس میں دم ہے روک سکے جو رستا تیرا
مرضی تیری، میٹر تیرا، رکشا تیرا

نظمیں

استحصال

ہے مقید
میرے اندر
مدتوں پہلے کا اک زخمی پرندہ
اور اُس کے زرد ماتھے پر اُگا اک سانپ مجھ کو
ڈستا رہتا ہے برابر.....
چاہتا ہوں
اِس پرندے کو کسی صورت اُڑا کر
اپنے جسمِ ناتواں کی خیر مانگوں
لیکن اِس بے پیر موسم کا بُرا ہو
جو مرے آزار کے آتش کدے میں
اپنا لوہا گرم کرنے پر تُلا ہے!

●

اِندر سروپ دت ناداں
B-3/269، پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

پسِ کارواں

کئی دن سے
خونخوار سور کی یلغار ہے
ہر اک بار
وہ میری سمت آ رہا ہے
میں سمتیں بدل کر
نشانے کو اس کے غلط کر رہا ہوں
نہ وہ تھک رہا ہے
نہ میں تھک رہا ہوں
کہیں دور سے
دھیمی دھیمی صدائے جرس آ رہی ہے
پہاڑوں کے اس پار شاید
مرا کارواں چل رہا ہے

مگر میں ابھی تک
نشانے کی زد پر کھڑا ہوں
درندہ صفت وحشی سور سے
بچنے کی تدبیریں رائگاں ہو رہا ہوں
مرا کارواں
دور مجھ سے بہت دور ہوتا چلا جا رہا ہے
ہر اک نقشِ پا بھی
غبارِ خباثت میں کھوتا چلا جا رہا ہے
مجھے اب ملے گی نہ منزل کبھی ——
شروعِ سفر میں عجب حادثہ ہو گیا ہے
عجب حادثہ ——!

●

شاہد کلیم
دودھ کٹورہ، آرہ ۸۰۲۳۰۱

بدالقوی دسنوی

مصاحبہ نگاری

مصاحبہ یا انٹرویو کی اگرچہ آج بڑی اہمیت ر قدر و قیمت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وئی باضابطہ فن نہیں ہے نہ اس کے لیے تک کوئی خاص اصول اور قاعدے وضع کیے ہیں۔ نہ ہی ہمارے یہاں اس کی کوئی باقاعدہ یخ ہے اس لیے اگر یہ جاننے کی کوشش کی گئی اس کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی تو دشواری سامنا کرنا پڑے گا لیکن غور و فکر کی مدد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا اس وقت ئی ہوگی جب دو انسان پہلے پہل ایک سرے سے کچھ جاننے کے لیے ملے ہوں گے ایک سرے کے بارے میں سوال و جواب کیے ہوں گے ایک دوسرے کے جواب سے مطمئن ہوئے ں گے لیکن کبھی کبھی یہ ملاقاتیں باضابطہ بن ہوں گی۔ طے شدہ پروگرام کے تحت ہوتی ں گی۔ کوئی ایک شخص خاص خاص پہلوؤں پر سرے شخص سے سوالات کرتا ہوگا اور جواب اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہوگا۔ اور یہی سوالات و بات تحریری صورت میں جب محفوظ ہوئے ں گے تو اسی دن سے مصاحبہ نگاری کی ابتدا ئی ہوگی اور جیسے جیسے اس کی ضرورت زیادہ وس کی جانے لگی ہوگی ویسے ویسے اس نے پہچان اور اہمیت بنانی شروع کر دی ہوگی۔ نچہ آج اس کی، دنیا کی ہر زبان میں اور ہر زندگی میں ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس ریعے بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں، بہت سی غلط فہمیاں دور کی جاتی ہیں۔ بہت سے شکوک رفع ہوتے ہیں۔ بہت سی بے خبری آگاہی میں بدل جاتی ہے۔ بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جنھیں بے شمار کتابوں کے مطالعے کے باوجود نہیں جانا جا سکتا، بہت سے ایسے اشخاص سے تعارف ہوتا ہے جن پر عام حالات میں دبیز پردے پڑے محسوس ہوتے ہیں۔

انٹرویو کے سلسلے میں انٹرویو لینے والے اور دینے والے دونوں کی بڑی اہمیت ہے، دونوں کو باصلاحیت ہونا چاہیے، چاق و چوبند ہونا چاہیے، بات چیت کا سلیقہ آنا چاہیے۔ دونوں کی دلچسپیاں بھی ملتی جلتی ہونی چاہیے۔ سوال کرنے والے کے دل میں مخاطب کی ایک خاص اہمیت اور قدر ہونی چاہیے، اس کے لیے ہمدردی اور احترام کا جذبہ بھی ہونا چاہیے۔

کسی سے انٹرویو لینے کا مقصد اس شخص کے بارے میں، اس کی دلچسپیوں اور مشاغل کے بارے میں، اس کے پسندیدہ موضوعات سے متعلق، اس کے علم و فن کے سلسلے میں، معلومات حاصل کرنا اور پھر وسیع حلقہ میں پھیلانا ہوتا ہے، اس کے ذہن کو سمجھنا، اس کے خصوصیات سے آگاہ ہونا، اس کی صلاحیتوں سے باخبر ہونا، اس کی خوبیوں کو جاننا اور اس کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی کم علمی کو کم کرنا، اپنی بے خبری کو باخبری میں بدلنا ہوتا ہے۔

لیکن انٹرویو دینے والے کو بڑی آزمائش کا سامنا ہوتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس طرح کے سوالات کے اسے جواب دینے ہوں گے، سوال کرنے والا اس سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے اور کیوں دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اسے اچانک کیے ہوئے ہر انجانے سوال کا برجستہ جواب دینا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ وہ غور و فکر کر کے اپنے جوابات کو سنوار سکتا ہے نہ ہی اپنی زبان کو درست کر سکتا ہے اسی لیے مخاطب میں کبھی کبھی جھنجلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے، کبھی کبھی اس کے لہجے میں تلخی بھی آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کر جاتا ہے جو وہ عام حالات میں نہ کہتا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انٹرویو کے دوران میں مخاطب کے مزاج اور معیار کی پرکھ ہو جاتی ہے اور اس پر سے بہت سے پڑے پردے اٹھتے نظر آتے ہیں۔

انٹرویو لینے والے کو بے تکے سوالات سے نہ صرف پرہیز کرنا چاہیے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ سوالات مخاطب کی استعداد، حالات اور عمر کے مطابق ہوں۔ اس کے رجحانات اور افکار کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے اس کی پسند ناپسند اور اس کے مشاغل اور دلچسپیوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کوئی بات ایسی ویسی یا اس ڈھنگ سے نہیں کرنی چاہیے جس سے مخاطب کے جذبات کو ٹھیس پہنچے یا جو اس کے جذبات کو مشتعل کر دے۔ ایسی صورت میں انٹرویو کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، زبان عام فہم، غیر پیچیدہ، اور نرم ہونی چاہیے، تاکہ جو کچھ اس سے پوچھنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ اس پر واضح ہو جائے

سیفیہ اسٹاف کوارٹرس، عقب سیفیہ سائنس کالج، بھوپال۔۱

اور وہ دلچسپی سے ساتھ جواب دیا جائے۔ ایسے سوالات بھی نہیں کرنے چاہییں جن سے مخاطب کترائے اور بچنے کی کوشش کرے بلکہ سوالات ایسے ہونے چاہییں جن کے جوابات سے مخاطب کو ایک خاص قسم کی تسکین محسوس ہو۔ سوال کرنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطب جواب دینے پر مجبور ہو جائے اور اسے جواب سے اطمینان محسوس ہو۔

عام طور سے انٹرویو کسی اہم، مشہور، باصلاحیت، عالم، فنکار، ہنرمند، ادیب، سیاست داں، صحافی، کھلاڑی وغیرہ سے لیا جاتا ہے تاکہ اس کے متعلق یا اس کے پیشے یا فن سے متعلق معلومات فراہم ہو سکے، اسی لیے انٹرویو لینے والے کا محور منتخب شخصیت یا پیشہ یا فن یا جو موضوع وہ انتخاب کرتا ہے وہی ہونا چاہیے۔ عام طور سے انٹرویو لینے والا کبھی تو اچانک کسی شخص سے انٹرویو لیتا ہے کبھی پہلے سے اسے آگاہ کر دیتا ہے اور سوال و جواب کے درمیان اپنے مقاصد کے مطابق ان تمام باتوں کو قلمبند کرتا جاتا ہے جنھیں وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے مناسب سمجھتا ہے اور پھر انھیں وہ سلیقے سے ترتیب دے کر پیش کرتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی یہ انٹرویو عام لوگوں سے بھی لیے جاتے ہیں اور ان عام لوگوں سے خاص باتیں جو ہماری زندگی کے لیے اہم اور قابلِ غور ہیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ایسے افراد میں کوئی جوتا پالش کرنے والا ہو سکتا ہے، کوئی لوہار یا بڑھئی ہو سکتا ہے، کوئی قلی یا ڈرائیور ہو سکتا ہے کوئی مونگ پھلی بیچنے والا یا مزدور ہو سکتا ہے کسی شخص سے سوالات کر کے اس کے متعلق کچھ ایسی باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں، جن سے زندگی کی بعض ایسی حقیقتیں روشن ہوتی ہیں، جن تک عام حالات میں پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اور پھر ان سے اہم نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انٹرویو دو قسم کے ہوتے ہیں اول جس میں مخاطب سے متعلق مختلف سوالات کیے جاتے ہیں دوئم جس میں اس کے پسندیدہ موضوعات یا فن سے متعلق اس سے باتیں کی جاتی ہیں اور اس کے تجربوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آج کل ٹیلیفون کی وجہ سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ دُور دراز مقامات پر رہنے والوں سے بھی انٹرویو لیا جاتا ہے، اور اسے ریڈیو سے نشر کر دیا جاتا ہے یا شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انٹرویو لینے والے اور انٹرویو دینے والے کے درمیان فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وقت ضائع ہونے کا امکان بھی نہیں رہتا۔ انتظار کی تکلیف بھی برداشت نہیں کرنی پڑتی اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ کسی اہم موضوع سے متعلق بروقت تفصیل فراہم ہو جاتی ہے لیکن اس میں آمنے سامنے رہ کر سوال و جواب کا لطف جاتا رہتا ہے۔ وہ لطف کچھ اور ہوتا ہے۔

اب انٹرویو کے سلسلے میں خطوط کا سہارا بھی لیا جاتا ہے لیکن اس کے لیے کافی وقت چاہیے۔ آمنے سامنے بات چیت کا لطف اس میں بھی نہیں آتا بلکہ اس میں آواز کے اتار چڑھاؤ کو بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس طرح کے انٹرویو کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں جوابات خود مخاطب کے ہاتھ کے لکھے ہوتے ہیں۔ مخاطب خوب سوچ سمجھ کر اطمینان سے لکھتا ہے اس لیے ایک طرح سے اس کی تحریر سند بن جاتی ہے وہ اپنی باتوں سے کبھی انکار نہیں کر سکتا۔

اسی لیے اس خدشے سے بچنے کے لیے انٹرویو دینے والا بعد میں اپنی کسی بات سے مُکر جائے محتاط انٹرویو لینے والے اپنے تحریر کردہ انٹرویو پر مخاطب سے دستخط کرا لیتے ہیں کبھی کبھی ایک شخص کے بجائے کئی افراد کسی خاص پہلو سے متعلق انٹرویو لیتے ہیں۔ پریس کانفرنس کی حیثیت کسی حد تک اسی قسم کے انٹرویو کی ہے۔

انٹرویو کو آہستہ آہستہ بڑی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے ذریعے کسی فرد کے افکار و خیالات سے آگاہ ہونے، اس کی معلومات اور صلاحیتوں سے واقف ہونے اور اسے سمجھنے میں نہ صرف مدد ملتی ہے بلکہ اس کے فن سے اور ان چیزوں سے جن میں وہ مہارت رکھتا ہے واقف ہونے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں مخاطب کے اپنی باتوں سے انکار سے انٹرویو لینے والے کی رسوائی ہوتی ہے اور اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں مخاطب کی باتوں سے غلط نتائج اخذ کرنے کی وجہ سے تردید اور تلخی کی اذیت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ریڈیو نے انٹرویو کو فروغ دینے اور مقبول بنانے میں اہم حصہ لیا ہے اس کے اثرات بھی دور رس ہوتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعے عام طور سے کسی ایک قابلِ ذکر شخص یا فنکار سے کبھی ایک ہی شخص سوال کرتا ہے اور کبھی ایک سے زیادہ لوگ سوال کرنے والوں میں ہوتے ہیں۔ ریڈیو کے انٹرویو میں ایک اہم خوبی یہ نظر آتی ہے کہ عام لوگوں کی حیثیت قارئین کے بجائے سامعین

کی ہوتی ہے۔ وہ لہجے کے آثار چڑھاؤ اور تیور کو بھی محسوس کرتے ہیں اور جوابات بھی خود مخاطب کے منہ سے سنتے ہیں اور بات چیت کے درمیان کبھی کبھی وہ بات چیت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بھی محسوس کرتے ہیں اور ان کے دلوں کے اندر جھانک کر دیکھ بھی لیتے ہیں اور دونوں کی جملہ بازیوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ ریڈیو کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ اُس کے اپنے آداب ہوتے ہیں، اپنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن کے جس حصے میں انٹرویو لیا جاتا ہے وہاں کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے جو دونوں کو پابند کرتا ہے۔ لوگ اس گفتگو میں شریک ہیں سب کو ہر لمحہ محتاط رکھتا ہے۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی اغلیں گزرتے وقت کا احساس دلاتی رہتی ہے لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود انٹرویو کو ریڈیو سے بھرپور تعاون ملا اور لامحدود وسعتوں میں یہ صنف ریڈیو کے سائے میں فروغ پاتی رہی ہے۔ البتہ ٹیلی ویژن نے جب اپنا جلوہ دکھایا اور ہر جگہ اس کی آواز سنائی دینے لگی تو اس کے پردے پر انٹرویو کی بات چیت اور زیادہ پُرلطف اور دلکش محسوس ہونے لگی اور مؤثر ثابت ہوئی۔ اس کی مدد سے اب سامعین اور ناظرین دونوں لطف اندوز اور فیضیاب ہونے لگے دونوں کی گفتگو کے لب و لہجے سے بھی وہ آگاہ ہونے لگے، چہروں کے نقوش اور آنکھوں کی کیفیت سے باخبر رہنے لگے اور سوالات کی اہمیت اور جوابات کی قدر و قیمت کو بھی سمجھنے لگے چنانچہ ٹیلی ویژن کی مدد سے انٹرویو نے وسیع مقبولیت حاصل کی۔ مختلف قسم کے لوگوں کے انٹرویو کا فیض عام ہوا۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مخاطب کا اپنی بات سے پھر جانے کا موقع جاتا رہا۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے آج ہر قسم کی صلاحیت کے افراد اور اپنے اپنے میدان کے ماہرین سے بات چیت سُنائی اور دکھائی جاتی ہے اور ان کے جوابات سے ملک کی کثیر آبادی کو باخبر کیا جاتا ہے۔

اُردو میں انٹرویو کی ابتدا کب ہوئی اور رسائل اور اخبارات میں اس کی اشاعت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا یہ کہنا مشکل ہے، اس کا فیصلہ تو کبھی کوئی محقق ہی کرے گا البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ چالیس پچاس سال سے اس زبان میں اس صنف کا رواج عام ہوا اور اسے پسند کی نگاہ سے دیکھا گیا اور دیکھا جارہا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جارہا ہے۔

مظہر الزماں خان

آخری تماشا

سرکس کا پورا تنبو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور سارے لوگ ہمہ تن گوش تھے کہ ایک آدمی شیر کے مُنہ میں اپنا سر دینے والا تھا۔ اور پورے ڈیرے میں نیلی مدھم روشنی پھیلی ہوتی تھی اور شیر کے مُنہ میں سر دینے والا آدمی، جس کا لباس سیاہ تھا اور جس کی دائیں طرف سینے پر ایک سفید چڑیا پینٹ تھی اور بائیں طرف ایک سُرخ کانٹا تھا اور پیٹ پر گندم کا سبز پودا تھا اور پیٹھ پر ایک فاختا بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر بڑے عجیب انداز میں تماشائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں موت اور زندگی کے سینکڑوں سائے گھوم رہے تھے۔ تاہم وہ مُسکرانے کی مکمل اور بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اور سارے تماشائی دم بخود اس خطرناک کھیل کو دیکھنے کے لیے اپنی اپنی کُرسیوں پر مضطرب تھے۔ اور شیر کے مُنہ میں سر رکھنے والا آدمی اب رِنگ کا آخری چکّر لگا کر لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والے پنجرے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا تھا۔ جس کے اندر بیٹھا ہوا شیر غصّے میں سلاخوں پر پنجے مار رہا تھا اور پنجرے کے اُوپر کھڑا ہوا آدمی لوہے کی سلاخوں والا دروازہ کھولنے کے لیے رِنگ ماسٹر کے اشارے کا منتظر تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان اب صرف ایک وقفۂ سکوت باقی رہ گیا تھا کہ دفعتاً رِنگ ماسٹر نے اشارہ کیا اور پنجرے پر کھڑے ہوئے آدمی نے لوہے کی سلاخوں کا دروازہ اُوپر اُٹھا دیا۔ شیر ایک دھاڑ کے ساتھ پنجرے سے باہر نکل آیا۔ رِنگ ماسٹر نے چابک سے شیر کو اشارہ کیا لیکن شیر مُنہ کھولنے کی بجائے غرّانے لگا تھا کہ دفعتاً رِنگ ماسٹر نے چابک کو پھر لہرایا اور اس بار شیر نے غرّا کر اپنا مُنہ کھول دیا۔ اور اُس آدمی نے حسرت بھری نگاہوں سے آخری بار تماشائیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے دُور کھڑی ہوئی جوان عورت کو الوداع کہا اور پھر اپنا سر شیر کے مُنہ میں رکھ دیا۔ ایک لمحہ زندگی اور ایک لمحہ موت لمحۂ اوّل و لمحۂ آخر۔ اور دم بخود تماشائیوں کے ساتھ شاید پوری کائنات اور پوری انسانیت بھی اس وقت حیران اور چُپ چاپ شیر کے بھیانک جبڑوں کے درمیان تھی کہ اچانک تماشائیوں کی تالیوں کی زبردست گونج میں زندگی موت کے مُنہ سے نکل چکی تھی اور اب وہ پوری طرح مُسکرا کر تماشائیوں کے ساتھ دُور کھڑی ہوئی ہر روز کرب میں مُبتلا ہونے والی اُس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے بادلوں کے دَل کے دَل اُمڈ آئے تھے اُس کی آنکھیں بھی بڑی عجیب تھیں کہ روز سیاہ بادل آتے اور گزر جاتے تھے چنانچہ اب سرکس کا آخری تماشہ ایک طویل وقفے کے لیے ختم ہو چکا تھا اور تمام تماشائی اپنی اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے مقامات پر پہنچ چکے تھے کہ انھیں اب اپنی مخلوق کے خالی کاسوں کو بھرنا تھا اور رزق کے مہذّب وسیلوں کی وضعداری نباہنی تھی اور اُس شخص سے زیادہ مستحق اور کون تھا جو شیر کے مُنہ میں اپنا سر دے کر باوقار رزق حاصل کر رہا تھا البتّہ شیر کے رزق کا ابھی کسی کو پتا نہیں تھا چنانچہ بھگوان اپنی اخلاقی ذمّے داری کے ساتھ سرکس کا تماشا دیکھ کر اب اپنے مقدّس مقام پر پہنچ چکے تھے اور اُن کی مخلوق بھی اب اپنے اپنے، اچھے، اوسطیا غلیظ ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہی تھی کہ اُنھیں بھی بیوی بچّوں کو خوش کرنا تھا کہ خوش کرنا بھگوان اور مخلوق، دونوں کی اخلاقی ذمّے داریاں تھیں اور دونوں صدیوں سے اپنی اپنی ذمّے داریاں بڑے عمدہ طریقے سے انجام دے رہے تھے اور میں اس سرکس کا جوکر جو ابھی کچھ دیر پہلے جگنوؤں کی روشنی میں اپنی آنکھوں پر سیاہ پٹّی باندھ کر اور اپنی معصوم بچّی کو تختے کی دیوار سے لگا کے، خنجروں سے اُس کا فیگر بنا چکا تھا۔ اس وقت ایک اندھیرے کونے میں بیٹھا اپنے قدیم اور بچھڑ جانے والے ساتھی، گھوڑے کی اچانک موت پر آنسو بہا رہا تھا جو کل کے کھیل میں آگ کے کنویں پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے اُسی کنویں میں گر کر جل چکا تھا لیکن اُس کے پیٹ کے اندر کی گھاس نہیں جلی تھی کہ آگ نے گھاس کو چھوا تک نہیں تھا کہ شاید گھاس گھوڑے سے زیادہ اہم تھی اس لیے میری آنکھیں گھاس پر آنسو گرا رہی تھیں میری آنکھیں بھی بڑی عجیب ہیں کہ ہنستے وقت بھی آنسو بہاتی ہیں اور روتے وقت بھی آنسو بہاتی ہیں۔ اور ان دونوں آنسوؤں کا فرق نہ میں سمجھ سکا اور نہ تماشائی سمجھ سکے۔

"چلو چلیں کہ سرکس کا مالک کھانے پر ہم سب کا انتظار کر رہا ہے ——" اچانک میرے ایک ساتھی جوکر نے جو روز تار پر چلتا ہے مجھے آکر کہا سو میں اپنے پیٹ کا خالی کاسہ بھرنے کے

H. No. 256, SPL. C.C.I.B, KACHI GUDA.
HYDERABAD-500027

...اُس کے دسترخوان پر پہنچ گیا تو وہ بولا "کل
...اری سرکس کا اس شہر میں آخری دن ہے کہ
...اید اب سبھی تماشائی ہمارا کھیل دیکھ چکے ہیں
...ی لیے پہلے شو میں کئی سیٹیں خالی تھیں اور خالی
...یں ہمارے خالی پیٹ ہیں جو بجتے ہیں تو
...ارے تمبو میں آواز گونجنے لگتی ہے اور یہ تمبو
...مان ہے اور آسمان ہمارے ہاتھوں پر ٹِکا
...ا ہے۔ لہٰذا ہم اس شہر سے کل کوچ کریں گے۔
...ں شہر نے ہم سے ہمارے دو ساتھی چھین لیے۔
...ا سفید گھوڑا اور دوسرا سُرخ بندر ــــ آؤ
...ہم ان دونوں کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی
...یار کریں کہ برسوں کے ساتھیوں کی یاد میں صرف
...منٹ کی خاموشی مناکر بھول جانا ہی ہماری
...ذہب کا ورثہ ہے۔ ساتھیو! اب جاؤ اور
...ی عورتوں اور بچّوں کے ساتھ جی بہلاؤ کہ کل
...ں یہاں سے کوچ کرنا ہے کہ۔۔۔"

سورج پہاڑوں کے نیچے دب چکا تھا
...ر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا
...ا البتّہ اس کھلے علاقے میں سرکس کی روشنیوں
...پورا ڈیرہ جگمگا رہا تھا کہ لگتا تھا میدان میں
...ستاروں کی بارات اُتر آئی ہے۔ اور تمبو کے
...ر بیٹھے ہوئے تماشائی سرکس کا آخری کھیل
...ھنے کے لیے مضطرب تھے اور جوکر بھالو کی پیٹھ
...بیٹھا ایک گیت گا رہا تھا: "ایک لمحہ زندگی ہے۔
...لمحہ موت ہے۔ کہ ہم سب کے سب۔ بگولوں
...درمیان۔ اِدھر اُدھر۔ اُدھر اِدھر گھوم رہے
...، کہ ایک لمحہ زندگی ہے۔ ایک لمحہ موت ہے۔
...ر دنیا۔ بس سرکس کا ایک وقفہ ہے ــــ"
...اچانک رِنگ ماسٹر نے آکر گرجدار آواز میں
... ــــ "آج کے اس شو میں تمام وزرا اور
...ر کے سارے شریف، مہذّب اور بڑے بڑے
لوگ موجود ہیں۔ اور ابھی چند لمحوں بعد ہماری
سرکس کا سب سے خطرناک کھیل شروع ہونے
والا ہے۔ حالانکہ رات شیر کی مادہ مر چکی ہے اور
شیر بے حد جھلّایا ہوا ہے۔ تاہم یہ تماشا ہوگا اور
ہمارا کردار اپنا عظیم سر شیر کے مُنہ
میں رکھے گا۔"

"ہم ابھی ایک کھیل کو دیکھنے کے لیے
سرکس آئے ہیں ورنہ توپ چلاتے ہوئے طوطے،
تار پر چلتے ہوئے کبوتر اور جھولا جھولتے ہوئے
کوّے تو ہم روز دیکھتے ہیں۔ صرف شیر کے مُنہ
میں سَر دینے والا کھیل ہی نہیں دیکھتے سو وہ
اب دیکھنا چاہتے ہیں۔" تماشائیوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" رِنگ ماسٹر بولا ــــ اور
پھر پنجرے پر کھڑے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ
کیا تو اُس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ شیر
دہاڑتا ہوا باہر نکلا اور مسلسل غرّاتے ہوئے
رِنگ ماسٹر کی طرف دیکھنے لگا لیکن رِنگ ماسٹر
نے ہنٹر لہرا لہرا کر آخر شیر کو مُنہ کھولنے پر مجبور
کر ہی دیا ــــ پورے تمبو میں گہری سُرخ
روشنی پھیلی ہوئی تھی اور شیر کے مُنہ میں سر
دینے والا آخری آدمی۔ بڑی حسرت سے تماشائیوں
کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اور دُور کھڑی
اپنی آنکھوں سے آوس گراتی ہوئی وہ عورت جس
نے اُس کی سانس کے پرندے کو اپنی مٹھی میں دبوچ
رکھا تھا کہ کہیں وہ اُڑ نہ جائے ــــ بھرآئی
آنکھوں سے الوداع کہہ رہی تھی اور شیر کے مُنہ
میں سَر رکھنے والا آدمی آخری بار فضا میں ہاتھ لہرا کر
اپنا عظیم سر جس میں اَن گنت سوالات، خواہشیں،
مسائل موجود تھے مسکرا رہا تھا کہ اس وقت اُس
کے چہرے پر بے حد عظیم مسکراہٹ پھیلی ہوئی
تھی اتنی عظیم کہ ساری انسانی عظمتیں صرف
اُس ایک چہرے پر سمٹ آئی تھیں۔ اور پورے
تمبو میں موت کا سکوت طاری تھا۔ صرف
تماشائیوں کے سانسوں کی آوازیں اُنھیں اپنی
اپنی حد تک محسوس ہو رہی تھیں کہ دفعتاً اُس
آدمی نے اپنا مقدس سر شیر کے جبڑوں میں رکھ
دیا تو سارا تمبو زبردست تالیوں سے گونج
رہا تھا لیکن تالیوں کی اس گونج اور گہری
سُرخ روشنی میں ایک بھیانک چیخ اور شیر کے
دانتوں کی کڑکڑاہٹ سے کائنات کی سرمہ
ہوتی ہوئی ہڈیوں اور عظیم سر کے ٹوٹنے کی
آوازیں دب کر رہ گئی تھیں کہ تماشائی مسلسل
اور زبردست تالیاں بجا رہے تھے!!!

غیر طلبیدہ نگارشات

جن کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ساتھ نہ ہو،
ناقابلِ اشاعت سمجھی جانے پر ضائع کردی جاتی ہیں۔

ــــــــ ادارہ

تلخ تلخ لمحے ہیں سرد سرد تنہائی
کس لیے کھلے غنچے کس لیے بہار آئی

یوں اُلجھ گئے موسم کچھ پتہ نہیں چلتا
کس طرف گیا سورج کس طرف گھٹا چھائی

دیکھیے مآل اُس کا دُھند ہو کہ آندھی ہو
ہم ہیں گرم مُلکوں کے اور حُسن سرمائی

دھوپ اُس پہ اُتری ہے اب کے رنگتیں لے کر
سانولی ہوئی اُس کی زرنگار برنائی

آندھیاں سی چلتی ہیں ذہن کے دریچوں میں
آج کتنی شدّت سے پھر کسی کی یاد آئی

منصفوں سے بھی اِک دن پوچھتے چلیں یارو
تم نے کس طرح کاٹی ہم نے جو سزا پائی

درد چاندنی بن کر کوے شب میں بہتے ہیں
بادلوں سے بھی اوپر بج رہی ہے شہنائی

جمشید مسرور

LINDEBERGASAN 46A, N-1068
OSLO 10 NORWAY

محمد فیروز شاہ

سوادِ ہجر میں رہنا اور اس پر شعر بھی کہنا
کٹھن ہے کس قدر فیروز یہ دہرا الم سہنا

یہ دل ہے سو وسیع الظرف تو ہونا ہی ہے اس کو
کہ دریاؤں کی فطرت ہے کھلے میدان میں بہنا

مجھے تو زندگی کا اِک یہی مفہوم ازبر ہے
پرندوں بادلوں کے ہمسفر ہو کر رواں رہنا

چمک اٹھّے جبینِ زندگی پر روشنی جب بھی
اسے پھر سینت کر رکھّو کہ ہے انمول یہ گہنا

مرے لفظ اور معنی میں بھلا تفریق ہو کیسے
لباسِ مصلحت تو آج تک میں نے نہیں پہنا

K-221, GANGVI STREET,
MIANWALI, PAKISTAN

مرادِ مہوشاں تھے اب نہیں ہیں
کبھی ہم بھی جواں تھے اب نہیں ہیں

کوئی پرسانِ حال اپنا نہیں اب
عزیزِ دوستاں تھے اب نہیں ہیں

سناتے تھے حسیں اِک دوسرے کو
ہم ایسی داستاں تھے اب نہیں ہیں

یہاں سے اب کہاں جائیں خبر کیا!
کبھی پہلے جہاں تھے اب نہیں ہیں

فقط یادوں کا دریا رہ گیا ہے
سفینے جو رواں تھے اب نہیں ہیں

چمن میں بعدِ مدّت آ کے دیکھا
جہاں کچھ آشیاں تھے اب نہیں ہیں

صبؔا یاد آ رہے ہیں جانے والے
ہمارے ہم زباں تھے اب نہیں ہیں

صبؔا اکبرآبادی

PAKISTAN

رام پرکاش راہی

جواہر لال

نہرو نامہ کے آئینے میں

امن کے بین الاقوامی سفیر سورگیہ جواہر لال نہرو کی یاد و یادگار کے سلسلے میں، ملک اور دنیا بھر کے دانشور، صحافی اور دیگر اہلِ قلم، موصوف کی ذاتِ گرامی، شخصیت، کردار اور کارہائے نمایاں کے بارے میں جو کچھ تقریر و تحریر کے احاطے میں لے آئیں وہ سب سر آنکھوں پر لینے کے قابل ہے کیونکہ جواہر لال کا وقار نہ صرف اس کے وطنِ مالوف کی نگاہوں میں بلکہ دنیا بھر کے لیے اس قدر مسلّم ہے کہ اس تعلق سے جس قدر بھی کہا جائے کم ہوگا۔ لیکن موصوف کے تئیں اظہارِ عقیدت اور تحسین و آفرین کی تصویر مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ساغر نظامی مرحوم کی طویل نظم "نہرو نامہ" کے حوالے سے جواہر لال کی پہلودار شخصیت پر روشنی نہ ڈالی جائے۔

"نہرو نامہ" ایک "مہاکاویہ" کی حیثیت سے جولائی ۱۹۶۷ء میں ٹھیک جواہر لال کی وفات کے تین سال بعد منظرِ عام پر آیا۔ اس نظم کی تخلیق میں ساغر صاحب نے جس لگن اور جانفشانی سے کام لیا اس کا اندازہ محترمہ ذکیہ سلطانہ نیّر، ان کی رفیقۂ حیات کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"نہرو نامے کی بساط پر تو ساغر نے جان کی بازی لگا دی . . . وہ اس تخلیق میں ان کا گہرا استغراق، وہ شب و روز کی محنتِ شاقہ، دفتر جانے سے پہلے فکر کرنا، دفتر سے آکر لکھنے کے لیے بیٹھ جانا، سارا گھر پڑا سو رہا ہے اور وہ جاگ رہے ہیں، جیسے راتیں بھی دن ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتی ہوں کہ جس پہلو سے رات کو لکھنے بیٹھے تھے، اسی پہلو سے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی راتوں کے سناٹوں نے ان کے نالۂ نیم شبی سے استفادہ کیا اور نہ جانے کتنی صبحوں کے سرمئی دھندلکوں نے ان کی آہِ سحرگاہی کی موسیقی سے کرنوں کے گیسوؤں کو سنوارا۔

دھندلکے چھٹ جاتے کرنیں ان کی میز پر سر دھنتیں اور پھر بھی وہ میز سے نہ اٹھتے، ناشتہ میز پر، چائے میز پر، کھانے کے نام پر فاقہ اور اگر کھا بھی لیا تو پھر فکر کی پہنائیوں میں ڈوب جانا ایک ایک صفحہ چار چار مرتبہ لکھنا اور پھر از سرِ نو نقل کرنا اور پھر اس پر بھی نظرِ ثانی۔ نظرِ ثانی کے اسرار کوئی ان سے پوچھے۔ یہ نظرِ ثانی تو اس دن تک ہوئی جس دن کتابت کے لیے مسودہ کاتب صاحب کو دیا گیا۔ اور سچ پوچھیے تو نظرِ ثانی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں پوری کارگاہِ فکر کا ہر وقت سفر، ہفتوں پوری پوری رات جاگنا۔ نہ دن کو آرام نہ رات کو چین، نہ کوئی شغل، نہ کوئی تفریح۔ بس خوابوں سے کھیلنا، جذبوں سے لڑنا خیالوں میں بہنا اور احساس کی شدّت کے ان تھپیڑوں کو سہنا جو نظم سے اُبل کر ان کے وجدان و ادراک پر چھا جاتے۔ آخر یہ عجیب و غریب ریاضت رنگ لائی۔"

نہرو نامہ طباعت اور ساخت پرداخت کے جملہ محاسن سے مرصّع قارئین کی نذر ہوا۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کے بارے میں فرمایا: "یہ ایک یادگار خدمت ہے جس کے لیے قوم کو شاعر کا ممنون ہونا چاہیے۔ یہ کارنامہ ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے۔" پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا کہ "اس نظم میں اعلیٰ انسانی صفات یا اقدارِ عظیمہ، جسم و جان میں منتقل ہو کر گزری ہوئی بڑی اور بزرگ روح کی خدمت میں اپنے کرب و الم کا نذرانہ پیش کر رہی ہیں جیسے "تعزیتِ مہر و وفا" کرنے والا پنڈت جی کے بعد کوئی باقی نہ رہا ہو۔" اسی طرح ڈاکٹر تارا چند نے اس تخلیق کو "گنجِ گراں مایہ" کا نام دیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے اسے "فن کی معراج" ٹھہرایا۔ سیّد سجّاد حیدر نے اسے "مستقبل کا راستہ" سے تعبیر کیا۔ پروفیسر انور صدیقی نے اسے "عہد آفریں تخلیق اور زندگی کے جمال و جلال کا آئینہ خانہ" گردانا۔ مخمور جالندھری نے اسے "نویدِ فردا" سے مماثلت دیتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک رزمیہ ہے جو انسانی فہم و ادراک کے ارتقا کا پیمانہ ہے۔ ساغر نظامی نے اپنی اس نظم میں ہئیت و موضوع اور تکنیک و فن کا دلآویز اور پائیدار تجربہ کرتے ہوئے اسے جامِ جہاں نما ہی نہیں بلکہ خورشیدِ کائنات افروز بنایا ہے۔"

نہرو نامے کی تخلیقی، فنی اور شعری عظمت کے تعلق سے ہر سطح کے مشاہیر نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے ساغر نظامی کی شاعرانہ قدر و منزلت کے پہلو تو سامنے آتے ہی ہیں:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

اس سے کہیں زیادہ اور بہتر اس عظیم شخصیت کے ان افکار و کردار کی تصویر بھی اجاگر ہوتی ہے جس کی بنا پر جواہر لال کو "شہرۂ آفاق" کا امتیاز حاصل ہوا اور وہ دنیا کے ہر کہہ و مہ کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے گھر کر گیا۔ جواہر لال کے خاندانی پس منظر، اسے دیش سیوا کی تحریک دینے والے ملک کے

198, AGCR ENCLAVE, DELHI-92

ناگفتہ بہ حالات، آزادی کے حصول اور ملک کی
از سر نو تعمیر کی جانب اس کے عملی اقدامات کا ذکر
کرتے ہوئے ساغر صاحب نے کہا ہے:

گود میں لکشمی کے کھولی آنکھ
سائے میں وہ سرسوتی کے پلا
عیش و عشرت میں وہ جواں ہوا
اور جواں ہو کے جب نظر ڈالی
اپنے ماحول کی کثافت پر
اپنے ماحول کی جہالت پر
اپنے ماحول کی قدامت پر
صدیوں کی مستقل غلامی پر
قرنوں کے دردِ ناتمامی پر
بھوک اور پیاس کے جزیرے دلیر
اپنے ٹوٹے ہوئے سفینوں پر
تو ہر اک اشک میں اُمڈ آیا
ایک طوفاں جنونِ خدمت کا
اس کے احساس میں بھڑک اُٹھا
ایک شعلہ نئی بغاوت کا
اور خود اس کے لطیف پیکر سے
اک نئے شخص کا ظہور ہوا
تھا جو دار و رسن کا دیوانہ
بیڑیوں سے جسے محبت تھی
سازِ راحت تھیں جس کو زنجیریں
جیسے پھولوں کا ہار، طوقِ گلو
جیسے ہر موسمِ بہاراں میں
تنگ زنداں، چمن کا آنگن تھا
کاٹ کر ہفت خوانِ مصائب کے
کیا اس نے جہانِ نو پیدا
اور غلامی کی کاٹ دی زنجیر
ایشیا کی بدل گئی تقدیر
اپنے خونِ جگر سے اس نے دیا

روحِ آزادیِ وطن کو فروغ
موجۂ چشمِ تر سے اس نے دیا
آتشِ لالۂ چمن کو فروغ
اس نے اپنی تباہ جنت کو
اک نیا نقشۂ بہار دیا
مسکرانے لگے نئے خاکے
جگمگانے لگے نئے خاکے
دیر و کعبہ میں، کوہ و صحرا میں
ایک جشنِ حیات ہونے لگا
ایک رقصِ حیات ہونے لگا
سُن کے ہر سمت نغمۂ تعمیر
خود ابھرنے لگے در و دیوار
ہر نظر اس کی اک پیامِ حیات
ہر نفس اس کا نغمۂ معمار

جواہر لال اشتراکیت کا حامی تھا۔ بنی نوعِ
انسان کی خیر و عافیت اس کا مسلک تھی۔ وہ امنِ
عالم کا شیدائی تھا۔ پنچ شیل کی بین الاقوامی
حکمتِ عملی اسی کے ذہن رسا کی تخلیق تھی۔ ہر
ملک سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا لیکن سیاسی
دھڑوں سے ناوابستگی اسی کی سوچ کا نتیجہ تھی جو
اس کے لیے روحانی قوت اور نفسیاتی تشفی کا وسیلہ
بنی۔ اس سلسلے میں ساغر صاحب نے شعری اظہار
سے جو پیکر تراشی کی اس کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

متلاشیِ خیر تھا نہرو
خیر وہ خیر جس کا غازۂ رُخ
روئے تخلیق کا جمال بنا
لحۂ خیر جس کا پَرتوِ نور
رُخِ تہذیب کا جلال بنا
جس کی گرمی سے روحِ انساں میں
آگ روشن ہوئی تجسّس کی
جذبۂ خیر جس کی چنگاری
بنی پہلی کرن تمدّن کی
روحِ فن کار میں ستارۂ فن
دستِ محنت کشاں میں مشعلِ مُزد
ذہنِ دانشوراں میں شعلۂ فکر
دلِ پیغمبراں میں شمعِ نجات
جس کی تابش نے روحِ نغمہ کو
گرمِ الفاظ کا خزانہ دیا
اور لفظوں کو خلعتِ معنی
اور معنی کو بے کرانیِ رمز
ننگ میں جُودتِ بیاں رکھ دی
بے زباں کائنات کے مُنہ میں
حسرتِ خیر نے زباں رکھ دی
خیر کی ایک بار فطرت نے
اک نئے بادۂ پرستش کا
نئی سرشاریوں کا پیمانہ
اک نیا جام اک نئی صہبا
اور یہ مظلوم نوعِ انساں کو
شمعِ امن و اماں دکھانے لگا
رس کی گنگ و جمن بہانے لگا

شانتی کے اس دیوتا کو، ملک کی خاطر خواہ
ترقی کے لیے فکر و عمل کے اس خضرِ راہ کو، جمہوریت
کے اس علم بردار کو، عظمتِ انسان کے اس
پرستار کو، پرانے اور نئے تمدن کے اس سنگم کو،
جملہ انسانی اقدار کے اس فرشتے کو ساغر صاحب
نے کوکبِ اعظم سے مماثلت دی ہے چنانچہ وہ
فرماتے ہیں:

دردِ انساں کا آبشارِ رواں
عشقِ انساں کا چشمۂ جاری
پیار ہی پیار اور وفا ہی وفا
روپ میں آدمی کے دلداری
شبِ تاریکِ غم میں مشعلِ راہ

شورِ طوفاں میں روشنی کا ستون
ضبط و برداشت، صبر و حلم و رضا
جذبۂ رحم و عدل، ذوقِ وفا
فیضِ قدرت نے لطفِ خاص کے ساتھ
اس کے کردار میں سمویا تھا
اس کے فکر و عمل کے پرتو سے
جھانکتے تھے اشوک کے تیور
ہو نہ ہو قتل گاہ عالم میں
آئی تھی روپ میں جواہر کے
مضطرب و بے قرار روحِ اشوک
اک نئی حسرتِ قرار لیے
اک اچھوتے جہاں کا خواب لیے
اک نیا ذوقِ انقلاب لیے

جواہر کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے کردار کے آفاقی پہلوؤں کے پیشِ نظر ساغر صاحب لکھتے ہیں:

امن عالم کا وہ علم بردار
عشقِ انساں کے نشّے میں سرشار
سر بسر پیکرِ رواداری
وہ محبت کا چشمۂ جاری
جس نے افکارِ نو کی ضربوں سے
قومیت کے بتوں کو توڑ دیا
رشتہ محدود تھا جو اپنوں تک
ساری دنیا کے دل سے جوڑ دیا

چین کی بے وفائی کے زخموں کا مارا، فرض کے مرحلوں کو عبور کرتا ہوا، باپو کے نقشِ قدم پر ملک اور دنیا کی خدمت انجام دیتا ہوا۔ ایک شہید فرض کی طرح راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ لیکن جسم کا چولا بدلنے کے بعد بھی اس کرم یوگی کی یادوں کی کائنات اس کے فکر و عمل کے لافانی ورثے کی بدولت دنیا بھر کے لیے جوں کی توں قائم رہی۔ ساغر صاحب نے چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا جو حسبِ ذیل ہے:

بجھ گئی شمع نور باقی ہے
نور یہ دُور دُور باقی ہے
نہ وہ محفل ہے اور نہ وہ ساقی
جاوداں اک سرور باقی ہے
نہیں خورشید لیکن اب بھی ہیں
ہر سو اس آفتاب کی کرنیں
گو نہیں وہ گلاب پھر بھی ہے
ہر طرف اس گلاب کی خوشبو
لالہ زاروں میں گل عذاروں میں
ہر طرف اس گلاب کی خوشبو
ہر سو اس آفتاب کی کرنیں

جواہر لال کے جسم خاکی کی پوتر راکھ کو، اس کی وصیت کے مطابق کھیتوں پر گاؤں اور شہروں کے اوپر بکھیر دیا گیا۔ شاعر نے بے ساختہ کہہ دیا:

وطن کی خاک میں ملنے دو راکھ کو اس کی
وطن کی خاک نہ سمجھے، وطن کو چھوڑ گیا

بغض و عناد کی اس دنیا میں، باہمی تضادات اور تنازعات کے اس معمورے میں جہاں؛

گونج ذہنوں میں ہے دھماکوں کی
گھن گرج زلزلوں کی روحوں میں
اک قیامت بپا خیالوں میں
لیکن اس کارزارِ طوفاں میں
شانتی ون کے ذرّے ذرّے سے
نغمہ یہ زندگی کا جاری ہے
جیو اور دوسروں کو جینے دو
تشنہ کاموں کی تشنگی کی قسم
پیو اور دوسروں کو پینے دو

سارے لوگ ہم...
منہ میں اپنا سر...
میں نیلی...
...نے کی رکاوٹ بننے لگے ہیں۔ اتنی طویل
مسافت کے بعد تھکن کا غلبہ فطری ہے۔ اسی لیے
رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ اب شاید
میں اور زیادہ منزلیں طے نہیں کر سکوں گا۔

میرے آبائی مکان کے وسیع صحن سے گزر کر
ایک شکستہ سائبان ہے جو کسی زمانے میں بطور
باورچی خانہ استعمال ہوتا تھا مگر ادھر کافی مدت
سے ویران پڑا تھا۔ چند ماہ قبل میں یہاں منتقل
ہوا ہوں۔ کافی پہلے میرے پاس باقاعدہ ایک
کمرہ تھا مگر میرے ملازمت سے سبکدوش ہوتے
ہی سب سے بڑے پوتے نے غالباً اپنے والدین کی
ایما پر یہ کہہ کر کمرے پر قبضہ کر لیا کہ اب دادا جان
کو کمرے کی کیا ضرورت ہے۔ واقعی مجھے کمرے
کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے میں
بڑے دالان کے وسیع برآمدے کے ایک گوشے
میں منتقل ہو گیا۔ وہاں میں نے کچھ سال آرام اور
سکون سے کاٹے مگر مجھے کھانسی کی شکایت ہو گئی۔
خاص طور سے رات میں کھانسی زور زیادہ دکھاتی
تھی۔ شاید عمر کا تقاضہ تھا۔ ایک رات میں کھانستے
کھانستے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اچانک پاس کے
کمرے سے بہو کے بڑبڑانے کی آواز آئی "اُفوہ سونا
حرام ہو گیا ہے۔" شاید اس کے شوہر کی نیند بھی اُچٹ
گئی تھی کیوں کہ اگلے ہی لمحے اس کی آواز آئی "ہاں،

...دوائیں دے...
صبح ہوتے ہی اس سائبان میں چلا آیا۔ بیٹے کے
استفسار کرنے پر میں نے اسے سمجھا دیا کہ میں تم
دونوں کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔ اسی
دن میں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے معائنہ کرکے
دوائیں دیں، سختی سے پرہیز کرنے کے لیے کہا
اور صبح شام دودھ پینے کی تاکید کی۔ گھر آکر میں
نے بہو سے اپنے لیے پرہیزی کھانا بنانے کے لیے
کہا وہ بولی "ڈیڈی گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے،
دو طرح کا کھانا بنانا میرے لیے کتنا مشکل ہوگا؟"
میں نے فوراً کہا "کوئی بات نہیں بیٹی، تم ایک ہی
طرح کا کھانا بناؤ البتہ آج سے میرا کھانا نہ بنانا۔
ناشتہ بھی نہیں۔" اس نے مصنوعی تعجب کا
اظہار کرتے ہوئے پوچھا "پھر آپ کہاں
کھائیں گے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ارے
بیٹی، اکیلی ذات ہوں، کہیں بھی کھا لیا کروں گا۔"
مجھے یاد آیا کہ میری بیوی میرے والد کی بیماری
کے دنوں میں پہلے ان کا پرہیزی کھانا بناتی تھی
اور بعد میں ہم سب کا۔ یہ بھی یاد آیا کہ صبح شام
پابندی سے والد کو دودھ دیا جاتا تھا۔ میرا یہ
حال ہے کہ دو چار دفعہ کی چائے کے ذریعے
سے ہی تھوڑا بہت دودھ جسم میں پہنچ پاتا ہے۔

...سلوانا
...ار ہونے لگا۔
...نہیں پوچھا کہ آپ
...ت تو نہیں ہے
...ایک مہینہ
...نے سو کا ایک نوٹ میری
...ڈیڈی' اپنے کھانے
...نے ملائمت سے کہا:
"بیٹے! اس کی ضرورت نہیں۔ آخر میری
پنشن کا بھی کوئی مصرف ہوگا کہ نہیں۔" اس نے
اصرار نہیں کیا۔ جب سے اس نے ملازمت شروع
کی ہے، اس دن پہلی مرتبہ مجھے سو کا نوٹ
دکھایا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی
کتنی تنخواہ ہے، مجھے تو بس یہ معلوم...
تک میرے والدین زندہ رہے، میں اپنی پوری
تنخواہ ان کو ہی دے دیا کرتا تھا۔...
بعد گھر کے اخراجات سے مجھے کوئی...
رہ جاتا تھا۔

ایک دن بہو نے نہایت...
پوچھا "ڈیڈی، آپ نے کم و بیش...
ملازمت کی مگر ایک چھوٹی کوٹھی بھی نہیں...
نہ کر سکے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "دراصل
میں بہت فضول خرچ تھا۔" میں بھلا اسے کیا
بتاتا کہ تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کو یونیورسٹی
تک کی تعلیم دلانا، ان کی شادیاں کرنا اور مکان
کی از سر نو تعمیر کرانا تنخواہ اور فنڈ ہی سے تو
ممکن ہو سکے۔ ان اخراجات کے بعد کچھ بچ رہتا کا

تار پن محل، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

دوپٹے
نہیں
سے دوپٹہ
کی ہو۔ دُو
کی شکل
والدین کے
لیا جب کر
بچے کو

بچوں سے پیار نہیں
سے پہلے بھی پیار تھا اور آج
ن سال قبل تک میں اپنے پوتوں
کھیلا کرتا تھا مگر ایک دن بہو
ی جو میں نے سُن لی: "خبردار"
ں میں سوار ہوئے۔ بوڑھے
یاں ہو جاتی ہیں' دہی
بیں کی"۔ اس دن سے
تے اور نہ ہی میں نے
شش کی۔ مجھے تو اپنے
۔ وہ جب تک مجھ سے
انھیں چین نہیں
اور مجھے پیٹھ پر سوار
کانا شروع کر دیتے حتیٰ کر
نار کر کہتیں "ارے کیا اپنے
ی ہی تھکا دو گے"۔ رات میں ان
س رہیں ان سے کہانیاں سنتا
الدہ آتیں اور مجھے اٹھا کر کہتیں
، ہو نہ دادا جان کو سونے دیتے ہو"
ین ہو گیا ہے کہ میری زندگی کا سفر
تم ہو سکتا ہے' اس لیے میں نے
فین کا پہلے ہی سے مکمل انتظام کر لیا

ہے کفن خرید لیا ہے' قبر کھودنے والے کو پیشگی اُجرت دے چکا ہوں اور اپنی بیوی کی قبر کے برابر میں نے اپنے لیے جگہ بھی منتخب کر لی ہے۔ میری بیوی نے میرے ریٹائر ہونے سے تین سال پہلے ہی اپنی زندگی سے ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ وہ میری منتظر ہوگی۔ خیر اب اسے مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بس سانس کی ڈور ٹوٹتے ہی نہلا دھلا کر اور کفن پہنا کر قبرستان تک پہنچانا ہی باقی رہ گیا ہے۔ بیٹے کو اگر توفیق ہوگی تو جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک پہنچا دے گا ورنہ ابھی نیک انسانوں کی اتنی کمی نہیں ہوئی ہے کہ مجھے وہاں تک پہنچانے والے ہی نہ ملیں۔

آج کی صبح بہت بے کیف لگ رہی ہے۔ سورج بھی اپنی شعاعیں پھینکنے میں کنجوسی دکھا رہا ہے۔ ہر طرف اُداسی ہی اُداسی نظر آ رہی ہے' کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ دل و دماغ انجانے قسم کے اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ایسے میں نہ جانے کیوں مجھے دادا جان' والدین اور بیوی کی یاد آ رہی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ سب بھی مجھے یاد کر رہے ہیں۔ پوتے صحن میں کرکٹ کھیلتے ہوئے خوب شور مچا رہے ہیں مجھے ان کا شور مچانا سخت ناگوار محسوس ہو رہا ہے مگر میں ان سے خاموش ہونے کے لیے بھی تو نہیں کہہ سکتا۔

اچانک گیند میری چارپائی کے نیچے آ گری' پوتے گیند کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں مگر برآمدے کے باہر ہی ٹھٹک جاتے ہیں۔ میرے دل میں خواہش بیدار ہوتی ہے کہ کاش وہ آئیں اور مجھ سے لپٹ جائیں مگر مجھے بہو کی تنبیہہ یاد آ جاتی ہے اور دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ سوچا کہ

خود ہی گیند اُٹھا کر ان کی طرف پھینک دوں مگر جب میں نے چارپائی کے نیچے سے گیند اُٹھائی تو وہ میرے تھوکے ہوئے بلغم میں بُری طرح لتھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کو دھونے کے لیے اُٹھنے لگا مگر شاید بہو نے دُور سے دیکھ لیا تھا وہ اپنے بچوں پر زور سے چلّائی "خبردار جو اس گیند کو دوبارہ ہاتھ لگایا"۔ پوتے تو سہم کر واپس چلے گئے مگر میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا۔ میں نے چھڑی زمین پر ٹیکا کر سہارا لینے کی کوشش کی مگر ہاتھوں میں رعشے کی وجہ سے ناکام رہا چنانچہ میں لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

اپنی تکلیف بھول کر میں اپنے دادا جان کو یاد کرنے لگا۔ ایک بار وہ بھی دہلیز سے ٹکرا کر گر پڑے تھے' میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کو سہارا دیا تھا۔ اس وقت انھوں نے مجھے ڈھیر ساری دُعاؤں سے نوازا تھا۔ ان دُعاؤں میں میری عمر طویل ہونے کی دُعا بھی شامل تھی۔ اس وقت میں بھی امید کر رہا تھا کہ پوتے آ کر مجھے اٹھائیں گے مگر وہ تو صحن میں کھڑے ہوئے اُچھل اُچھل کر اور تالیاں بجا بجا کر کہہ رہے تھے "دادا جان گر پڑے' دادا جان گر پڑے"۔

میں سوچ رہا ہوں کہ میرے دادا جان نے مجھے درازی عمر کی دُعا کیا یہی سب دیکھنے کے لیے دی تھی؟ کیا تاریخ اپنے ابواب کو اسی طرح دہراتی ہے؟ ان کی دُعا کا سایہ میرے سر سے اُٹھ جانے میں اب اور کتنی مدت باقی ہے؟

خورشید ملک

دُعا کا کرب

زندگی کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے میں نے ستر منزلیں طے کرلی ہیں مگر گزشتہ کچھ منزلوں سے پگڈنڈی پر جابجا خاردار جھاڑیاں اور گہرے گڑھے راستے کی رکاوٹ بننے لگے ہیں۔ اتنی طویل مسافت کے بعد تھکن کا غلبہ فطری ہے، اسی لیے رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ اب شاید میں اور زیادہ منزلیں طے نہیں کرسکوں گا۔

میرے آبائی مکان کے وسیع صحن سے گزر کر ایک شکستہ سائبان ہے جو کسی زمانے میں بطور باورچی خانہ استعمال ہوتا تھا مگر اِدھر کافی مدت سے ویران پڑا تھا۔ چند ماہ قبل میں یہاں منتقل ہوا ہوں۔ کافی پہلے میرے پاس باقاعدہ ایک کمرہ تھا مگر میرے ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی سب سے بڑے پوتے نے غالباً اپنے والدین کی ایما پر یہ کہہ کر کمرے پر قبضہ کرلیا کہ اب دادا جان کو کمرے کی کیا ضرورت ہے۔ واقعی مجھے کمرے کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اسی لیے میں بڑے دالان کے وسیع برآمدے کے ایک گوشے میں منتقل ہوگیا۔ وہاں میں نے کچھ سال آرام اور سکون سے کاٹے مگر مجھے کھانسی کی شکایت ہوگئی۔ خاص طور سے رات میں کھانسی زور زیادہ دکھاتی تھی۔ شاید عمر کا تقاضہ تھا۔ ایک رات میں کھانستے کھانستے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اچانک پاس کے کمرے سے بہو کے بڑبڑانے کی آواز آئی "اُفوہ سونا حرام ہوگیا ہے۔" شاید اس کے شوہر کی نیند بھی اچٹ گئی تھی کیوں کہ اگلے ہی لمحے اس کی آواز آئی "ہاں، آج ڈیڈی کو کچھ زیادہ ہی کھانسی آرہی ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میرے والد کو رات میں کھانسی آتی تھی تو میں ان کے سینے کی مالش کرتا رہتا اور دوائیں دیتا رہتا حتیٰ کہ وہ سو جاتے۔

بہرحال میں نے جیسے تیسے رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی اس سائبان میں چلا آیا۔ بیٹے کے استفسار کرنے پر میں نے اسے سمجھا دیا کہ میں تم دونوں کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔ اسی دن میں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے معائنہ کرکے دوائیں دیں، سختی سے پرہیز کرنے کے لیے کہا اور صبح شام دودھ پینے کی تاکید کی۔ گھر آکر میں نے بہو سے اپنے لیے پرہیزی کھانا بنانے کے لیے کہا وہ بولی "ڈیڈی گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے، دو طرح کا کھانا بنانا میرے لیے کتنا مشکل ہوگا؟" میں نے فوراً کہا "کوئی بات نہیں بیٹی، تم ایک ہی طرح کا کھانا بناؤ البتہ آج سے میرا کھانا نہ بنانا۔ ناشتہ بھی نہیں۔" اس نے مصنوعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "پھر آپ کہاں کھائیں گے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ارے بیٹی، اکیلی ذات ہوں، کہیں بھی کھا لیا کروں گا۔" مجھے یاد آیا کہ میری بیوی میرے والد کی بیماری کے دنوں میں پہلے ان کا پرہیزی کھانا بناتی تھی اور بعد میں ہم سب کا۔ یہ بھی یاد آیا کہ صبح شام پابندی سے والد کو دودھ دیا جاتا تھا۔ میرا یہ حال ہے کہ دو چار دفعہ کی چائے کے ذریعے سے ہی تھوڑا بہت دودھ جسم میں پہنچ پاتا ہے۔

بہرحال میں نے اسی دن پڑوس کی ایک ضعیف بیوہ کو اپنے لیے پرہیزی کھانا بنانے کے لیے تیار کرلیا۔ اپنے لیے آدھا کلو دودھ منگوانا شروع کردیا اور ناشتہ بھی باہر کرنے لگا۔

بیٹے نے ایک دن بھی نہیں پوچھا کہ آپ کہاں کھا رہے ہیں، کوئی تکلیف تو نہیں ہے اور طبیعت کیسی ہے؟ البتہ ایک مہینہ پورا ہو جانے پر اس نے سو کا ایک نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ڈیڈی، اپنے کھانے کے روپے لے لیجیے۔" میں نے ملائمت سے کہا: "بیٹے! اس کی ضرورت نہیں۔ آخر میری پنشن کا بھی کوئی مصرف ہوگا کہ نہیں۔" اس نے اصرار نہیں کیا۔ جب سے اس نے ملازمت شروع کی ہے، اس دن پہلی مرتبہ مجھے سو کا نوٹ دکھایا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی کتنی تنخواہ ہے، مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ جب تک میرے والدین زندہ رہے، میں اپنی پوری تنخواہ ان کو ہی دے دیا کرتا تھا، اس کے بعد گھر کے اخراجات سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہ جاتا تھا۔

ایک دن بہو نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا "ڈیڈی، آپ نے کم و بیش ۳۵ سال ملازمت کی مگر ایک پھوٹی کوڑی بھی پس انداز نہ کرسکے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "دراصل میں بہت فضول خرچ تھا۔" میں بھلا اسے کیا بتاتا کہ تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کو یونیورسٹی تک کی تعلیم دلانا، ان کی شادیاں کرنا اور مکان کی ازسرِنو تعمیر کرانا تنخواہ اور فنڈ ہی سے تو ممکن ہوسکے۔ ان اخراجات کے بعد کچھ بچ رہنے کا

تارین ٹکلی، شاہجہانپور ۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

سوال ہی کیا تھا؟ بہر حال اس وقت دو بیٹے
ے بے نیاز بہو کا انداز تخاطب مجھے پسند نہیں
یا۔ مجال ہے کہ میری بیوی کبھی قرینے سے دوپٹہ
ڑھے بغیر میرے والدین کے سامنے گئی ہو۔ دو
وں کی ماں بن جانے تک والد نے اس کی شکل
نہیں دیکھی تھی۔ مزید یہ کہ میں نے والدین کے
منے اپنے بچّوں کو کبھی گود میں نہیں لیا جب کہ
بیٹا زیادہ تر اپنے سب سے چھوٹے بچّے کو
دمیں لے کر مجھ سے باتیں کرتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ مجھے بچّوں سے پیار نہیں
۔ مجھے بچّوں سے پہلے بھی پیار تھا اور آج
ہے۔ دو تین سال قبل تک میں اپنے پوتوں
ساتھ خوب کھیلا کرتا تھا مگر ایک دن بہو
ں کو تنبیہہ کی جو میں نے سُن لی: ”خبردار،
دا جان کی گود میں سوار ہوئے۔ بوڑھے
ں کو بہت سی بیماریاں ہو جاتی ہیں، وہی
یاں تم کو بھی لگ جائیں گی۔“ اس دن سے
پوتے میرے قریب آئے اور نہ ہی میں نے
قریب جانے کی کوشش کی۔ مجھے تو اپنے
ان کی یاد آتی ہے۔ وہ جب تک مجھ سے
وگھنٹے کھیل نہ لیتے، انھیں چین نہیں
۔ خود گھوڑا بنتے اور مجھے پیٹھ پر سوار
دالان کے چکّر لگانا شروع کر دیتے حتیٰ کہ
تیں اور مجھے اتار کر کہتیں ”ارے کیا اپنے
ن کو بالکل ہی تھکا دو گے۔“ رات میں ان
ریں گھس کر میں ان سے کہانیاں سنتا
رکار والدہ آتیں اور مجھے اُٹھا کر کہتیں
سوتے ہو نہ دادا جان کو سونے دیتے ہو۔“
مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری زندگی کا سفر
بھی ختم ہو سکتا ہے، اس لیے میں نے
و تدفین کا پہلے ہی سے مکمل انتظام کر لیا

ہے۔ کفن خرید لیا ہے، قبر کھودنے والے کو پیشگی اُجرت دے چکا ہوں اور اپنی بیوی کی قبر کے برابر میں نے اپنے لیے جگہ بھی منتخب کر لی ہے۔ میری بیوی نے میرے ریٹائر ہونے سے تین سال پہلے ہی اپنی زندگی سے ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ وہ میری منتظر ہوگی۔ خیر اب اسے مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بس سانس کی ڈور ٹوٹتے ہی نہلا دھلا کر اور کفن پہنا کر قبرستان تک پہنچانا ہی باقی رہ گیا ہے۔ بیٹے کو اگر توفیق ہوگی تو جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک پہنچا دے گا ورنہ ابھی نیک انسانوں کی اتنی کمی نہیں ہوئی ہے کہ مجھے وہاں تک پہنچانے والے ہی نہ ملیں۔

آج کی صبح بہت بے کیف لگ رہی ہے۔ سورج بھی اپنی شعاعیں پھینکنے میں کنجوسی دکھا رہا ہے۔ ہر طرف اُداسی ہی اُداسی نظر آرہی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ دل و دماغ انجانے قسم کے اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ایسے میں نہ جانے کیوں مجھے دادا جان، والدین اور بیوی کی یاد آرہی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ سب بھی مجھے یاد کر رہے ہیں۔ پوتے صحن میں کرکٹ کھیلتے ہوئے خوب شور مچا رہے ہیں مجھے ان کا شور مچانا سخت ناگوار محسوس ہو رہا ہے، مگر میں ان سے خاموش ہونے کے لیے بھی تو نہیں کہہ سکتا۔

اچانک گیند میری چارپائی کے نیچے آگری۔ پوتے گیند کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں مگر برآمدے کے باہر ہی ٹھٹک جاتے ہیں۔ میرے دل میں خواہش بیدار ہوتی ہے کہ کاش وہ آئیں اور مجھ سے لپٹ جائیں مگر مجھے بہو کی تنبیہہ یاد آجاتی ہے اور دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ سوچا کہ خود ہی گیند اُٹھا کر ان کی طرف پھینک دوں مگر جب میں نے چارپائی کے نیچے سے گیند اُٹھائی تو وہ میرے تھوکے ہوئے بلغم میں بُری طرح لتھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کو دھونے کے لیے اُٹھنے لگا مگر شاید بہو نے دُور سے دیکھ لیا تھا وہ اپنے بچّوں پر زور سے چلّائی ”خبردار جو اس گیند کو دوبارہ ہاتھ لگایا۔“ پوتے تو سہم کر واپس چلے گئے مگر میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا۔ میں نے چھڑی زمین پر ٹیکا کر سہارا لینے کی کوشش کی مگر ہاتھوں میں رعشے کی وجہ سے ناکام رہا چنانچہ میں لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

اپنی تکلیف بھول کر میں اپنے دادا جان کو یاد کرنے لگا۔ ایک بار وہ بھی دہلیز سے ٹکرا کر گر پڑے تھے، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کو سہارا دیا تھا۔ اس وقت انھوں نے مجھے ڈھیر ساری دُعاؤں سے نوازا تھا۔ ان دُعاؤں میں میری عمر طویل ہونے کی دعا بھی شامل تھی۔ اس وقت میں بھی امید کر رہا تھا کہ پوتے آکر مجھے اٹھائیں گے مگر وہ تو صحن میں کھڑے ہوئے اُچھل اُچھل کر اور تالیاں بجا بجا کر کہہ رہے تھے ”دادا جان گر پڑے، دادا جان گر پڑے۔“

میں سوچ رہا ہوں کہ میرے دادا جان نے مجھے درازی عمر کی دُعا کیا یہی سب دیکھنے کے لیے دی تھی؟ کیا تاریخ اپنے ابواب کو اسی طرح دہراتی ہے؟ ان کی دُعا کا سایہ میرے سر سے اُٹھ جانے میں اب اور کتنی مدت باقی ہے؟

الجھنوں کی سرد لو میں چاہتیں سنولا گئیں
ٹہنیاں تھیں سونی سونی رنگتیں سنولا گئیں

ہر بدن تھا زخم خوردہ اور اذیت ناک سانس
کیا عجب رُت تھی کہ ساری صورتیں سنولا گئیں

چوکھٹوں پر نام کے طغرے لگے تھے کو بہ کو
گھر کے اندر کی مگر سب عزتیں سنولا گئیں

اک ملن کی پیاس کو دے کر توانائی تمام
پھول کے دامن کی ساری نکہتیں سنولا گئیں

اب کہاں لذتِ کشِ احساسِ شب جب کہ صبا
ایک شعلے میں جھلس کر قربتیں سنولا گئیں

علیم صبا نویدی

۲۴، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، مدراس ۶۰۰۰۰۲

تابش مہدی

بلا سے مرتبے اونچے نہ رکھنا
کسی دربار سے رشتے نہ رکھنا

پڑوسی کے مکاں میں چھت نہیں ہے
مکاں اپنے بہت اونچے نہ رکھنا

کبھی تم سائلوں سے تنگ آ کر
گھروں کے بند دروازے نہ رکھنا

رئیسِ شہر کو میں جانتا ہوں
کوئی اُمید تم اُس سے نہ رکھنا

اگر پھولوں کی خواہش ہے تو سن لو!
کسی کی راہ میں کانٹے نہ رکھنا

بہت بے رحم ہے تابشؔ یہ دُنیا
تعلق اس سے تم گہرے نہ رکھنا

الایمان منزل، دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (یو۔پی)

عجب ہے کیا جو چمکنے لگی ہے ہجر کی رات
دیارِ چشم میں اُتری ہے جگنوؤں کی برات

ہوائے وقت کی زد سے بکھر رہا ہوں میں
تو آ کے تھام لے جاناں طنابِ خیمۂ ذات

مری صدا کے پرندوں کی اب کے خیر نہیں
چہار سمت خموشی لگائے بیٹھی ہے گھات

اندھیری شب میں جو بھائی کا خون پیتا ہے
وہ دن میں بانٹتا پھرتا ہے پیار کی سوغات

ہمارے پاؤں میں زنجیر ڈال دی کس نے
رُکا رُکا سا ہے مدت سے کاروانِ حیات

جلائے رکھو تم آندھی میں بھی چراغِ [illegible]
یہ آگے دیکھنا دیتا ہے کون کس کو مات

طارق متین

ڈاکخانہ لکھمنیاں، ضلع بیگو سرائے (بہار)

عزیز الحسن جعفری

صحافت پر مضامین کا سلسلہ ——— ۴

تقاریر کی گزارش نویسی

تقریریں خبروں کا بہترین سرچشمہ ہیں۔ دنیائے صحافت میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تقریر کی خبرنگاری کے لیے خصوصی ذہانت و فراست کی احتیاج نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی بعض موقعوں پر یہ کافی دشوار مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ کچھ تقریریں تو ایسی ہوتی ہیں، جن میں معلومات اور اطلاعات کی بہتات ہوتی ہے؛ ایسی تقریر کی گزارش تیار کرنا آسان کام ہے لیکن بعض مقررین سُنے سنائے مسلّم خیالات کا ہی اظہار کرتے ہیں، یا ایسے جدید خیالات پیش کرتے ہیں، جنھیں بغیر تشریح کے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی سمجھایا جاسکتا ہے۔ جن تقاریر میں نئے نکات و نظریات پیش کیے جاتے ہیں، ان کی گزارش نویسی میں نئے نکات کی تشریح خصوصی توجہ کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔

بعض تقریریں بے حد جذباتی اور لفّاظی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ جن کے ذریعے مقرّر کا مقصد سامعین کو جوش دلانا، ان کے جذبات کو چھیڑنا، انھیں اُکسانا اور بھڑکانا ہوتا ہے۔ عموماً ایسی تقریروں میں معلومات اور معنویت کا فقدان ہوتا ہے، مگر اثر انگیزی کے اعتبار سے یہ شاہکار ہوتی ہیں۔ عوام بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ایسی تقریروں کو سننے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ قاری ایسی تقریر کی گزارش پڑھنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ جو لوگ اس جلسے میں شریک تھے وہ بھی اس کی اخباری گزارشات پڑھنے کے لیے بیقرار رہتے ہیں۔

پیشگی تیّاری

تقریروں کی خبرنگاری کے لیے خود کو تیّار کرنے میں بنیادی طور پر صحافت کے اصول و ضوابط پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔ خبرنگار کو اوّلین کام یہ کرنا چاہیے کہ دعوت نامے میں مذکور زیرِ غور امور کی فہرست کا مطالعہ کرے۔ اُس کے بعد مقررین کا تعارفی خاکہ اور اُن کی شخصیت سے متعلق دیگر معلومات اکھٹی کرے۔ اگر مقرر کی تقریر کا مسودہ قبل از وقت دستیاب ہو جائے تو جلسے میں شرکت سے قبل اُس کا بھی غائر نظر سے مطالعہ کر لینا چاہیے۔

جس جلسے کی خبرنگاری کے لیے خبرنگار کو جانا ہے، اگر اسی نوعیت کے دیگر جلسے بھی اُس سے پہلے منعقد ہو چکے ہیں تو اُن کی گزارشات کے اخباری تراشے ضرور ملاحظہ فرمالیں۔ زیرِ بحث امور کی فہرست اور گذشتہ خبروں کے تراشے خبرنگار کو یہ اندازہ کرانے میں مددگار ہوں گے کہ بحث گذشتہ نوعیت کی ہی ہوگی یا کوئی نیا رُخ اختیار کرے گی۔

جلسے میں جانے سے قبل اپنے قلم، کاغذ، ٹیپ رکارڈر، کیسٹ رکارڈر، ڈکٹیٹنگ مشین (DICTATING MACHINE)، کیمرہ یا دیگر لوازمات جو ادارہ فراہم کرتا ہے یا خبرنگار کے پاس ہیں، اُن کا بخوبی معائنہ کر لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عین موقع پر شرمندہ کردیں۔ خبرنگار کو چاہیے کہ ہر وقت اپنے پاس ایک روپے والے دو سکے محفوظ رکھے کیوں کہ ممکن ہے پبلک بوتھ سے فون کرنا پڑجائے۔ خبرنگار کے لیے یہ بھی مناسب ہے کہ وہ اپنی تحویل میں ایک سے زائد قلم رکھے۔

ضروری تیّاریوں کے بعد، خبرنگار کو معینہ وقت پر جلسے گاہ پہنچ جانا چاہیے۔ جلسے گاہ میں نشریاتی نمائندوں کے بیٹھنے کے لیے عموماً اسٹیج کے قریب ہی بندوبست کیا جاتا ہے۔ خبرنگار کے پاس اگر کسی تقریر کا مسودہ پہلے سے موجود ہے تو بھی تقریر سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے بلکہ مقرر کی تقریر کے مطابق اُس کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مقرر صرف وہی کہے گا، جو لکھا ہوا ہے۔ وہ فی البدیہہ تبصرے کرسکتا ہے اور یہ تبصرے گزارش میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقریروں سے قبل اخباری نمائندوں کے لیے ایک PRESS CONFERENCE کا انعقاد کردیا جاتا ہے۔ جس میں خبرنگار زیرِ بحث امور سے متعلق تشریح طلب کر لیتے ہیں۔ اور مقرر اُن کا جواب دیتا ہے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود منتظمینِ جلسہ کو تقریر سے قبل، مقرر سے ملاقات کا موقع نہیں مل پاتا اور وہ براہ راست اسٹیج پر چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی پریس کانفرنس منعقد نہ

۱۸، بلک مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

کی گئی ہو اور جلسے سے قبل مقرّر سے ملاقات کا موقع نہ ملے تو منتظمین کی وساطت سے اُس کی تقریر یا جلسے کے بعد اُس سے ملاقات کرنے کا وقت معیّن کر لینا چاہیے۔

اصولی طور پر تو خبر نگار کو مقرّر سے تنہائی میں گفتگو کرنی چاہیے، لیکن مقرّر اگر کوئی بہت اہم شخصیت ہے، تو اُس سے سوالات کرنے کے متمنی متعدّد اخباری نمائندے وہاں موجود ہوتے ہیں۔ خبر نگار نے جو سوالات پہلے سے تیّار کر رکھے ہیں یا تقریر کے دوران پیدا ہوئے ہیں، موقع ملنے پر اُن کو پوچھنے میں ہرگز نہیں جھجکنا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر متعدّد خبر نگار اپنے سوالات پوچھتے ہیں۔ ان کے جوابات پر سبھی خبر نگاروں کا مشترکہ حق ہوتا ہے۔ ہر ایک خبر نگار اُن جوابات سے اپنے اپنے طرز و انداز پر استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

محرمانہ دستاویز

اگر کسی جلسے میں کوئی مقرّر کسی دستاویز کا حوالہ دے اور وہ صرف چنیدہ افراد کو دِکھائی جائے تو خبر نگار کو چاہیے کہ اُس کو دیکھنے کا مطالبہ کرے، یا اُس کو پڑھ کر سنانے کے لیے کہے۔ اگر اُس کی درخواست رد کر دی جائے، تو اُسے چاہیے کہ اپنے مُدیر کو وہاں بلا کر حالات سے آگاہ کر دے، تاکہ وہ اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرے۔

مثال: اگر کسی جلسے میں کوئی مقرّر کہے کہ اس سلسلے میں ایک خط بھی موصول ہو چکا ہے۔ وہ خط وہاں موجود کچھ لوگوں کو دکھا دیا جائے مگر خبر نگار کی طلب پر نہ پڑھ کر سنایا جائے اور نہ ہی اسے دکھایا جائے تو اس خبر نگار کا مُدیر قانونی چارہ جوئی کر کے اُس خط کی نقل حاصل کر سکتا ہے۔ کیوں کہ عوام کے سامنے جس دستاویز کا اظہار کر دیا گیا اُس کے مندرجات عوامی ملکیت ہو جاتے ہیں۔ عوام کو اُس سے آشنا کرانا مسئولین کی ذمّے داری ہے۔

ناروا جھانسہ

جلسے کے منتظمین نشریاتی اداروں کے ساتھ ہمدردانہ راہ و روش کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عام روش سے باہر جا کر بھی خبر نگاروں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اگر کسی خبر نگار کو جلسے سے مربوط اطلاعات درکار ہیں تو متعلقہ عملہ وافر مقدار میں اُس کو فراہم کر دے گا۔ لہٰذا اوٹ پٹانگ بیان یا حوالہ تحریر کرنا، جو کہ جھانسہ دینے کے زمرے میں آتا ہے، اس سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ عمل خبر نگار کی بدنامی کا باعث، نااہلی کا ثبوت اور اس کی شخصیت کے لیے ضرر رساں ہے۔

گزارشات کی تیّاری

خبر نگار چاہے تو مقرّر کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو ضبطِ تحریر میں لا سکتا ہے، یا صرف انھی نکات پر اکتفا کر سکتا ہے جو اہم اور قابلِ اشاعت نظر آئیں۔ اگر کسی خبر نگار کو اپنی یادداشت پر ضرورت سے زیادہ بھروسا ہے تو وہ تقریر کو قلمبند کرنے سے گریز کر سکتا ہے۔ اگر کوئی خبر نگار تقریر نہیں لکھ رہا ہے تو اُس کا ہمہ تن گوش رہنا بہت ضروری ہے تاکہ کوئی اہم بات چھوٹ نہ جائے۔ بعض جلسے اتنے حسّاس اور پُرمعنی ہوتے ہیں کہ انھیں لفظ بہ لفظ شائع کرنا بہتر ہوتا ہے۔

جلسوں میں غیر رسمی بیانات
(OFF THE RECORD COMMENTS)

کا گزارش میں استعمال، گزارش مصاحبہ کے مقابلے میں آسان تر ہے۔ اگر کسی عوامی جلسے میں کوئی بات کہی گئی ہے تو وہ عوامی اطلاع ہے، خواہ مقرّر یا ناظم اعلان کر دیں کہ فلاں بات غیر رسمی تھی اور قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ بہرصورت اگر وہ بات "قابلِ خبر" ہے تو خبر نگار اُسے جزوِ گزارش بنا سکتا ہے۔

بعض اہم تقاریر کے مسودے خبر نگاروں کو پیشگی فراہم کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً یومِ جمہوریہ پر صدرِ جمہوریہ کی تقریر، یومِ آزادی پر وزیرِ اعظم کی تقریر، دانش گاہوں میں تقسیم اسناد کے جلسے میں مہمانِ خصوصی کی تقریر کے مسودے کئی روز قبل نشریاتی اداروں کو دے دیے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں خبر نگاروں کو مذکورہ مسودہ، تفصیل سے اور غائر نظر سے پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے خطابات کی گزارشات خبر نگار پہلے سے ہی تیّار کر لیتے ہیں۔

اصل تقریر سُنتے ہوئے خبر نگار کو چاہیے کہ وہ سامعین کے ردِّ عمل کی جانب بھی توجہ کرے۔ اور مقرّر کی ہر ادا پر نظر رکھے۔ بعض اوقات گزارشات میں یہ حوالہ دینا بہتر ہوتا ہے کہ سامعین نے تقریر غور سے سنی، یا درمیان میں بے چینی کا اظہار کیا۔ تاکہ قارئین کو جلسے میں موجود سامعین کے رویّے، جوش یا برتاؤ کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

تقریر کی گزارش نویسی کے لیے خبر نگار کو اس بات پر توجہ کرنی چاہیے کہ مقرّر نے سب سے زیادہ اہم بات کیا کہی، یا کون سا

عمل بہت زیادہ توجہ طلب تھا۔ اگر بہت سی باتیں ذہن میں آتی ہیں تو اُن کا خلاصہ یعنی مقرر کی تقریر کا ماحصل شامل گزارش کر لیا جائے۔ اگر جلسے میں بعض رسمیں یا اعمال انجام پائے ہیں تو اُن کو بھی گزارش میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرآن خوانی سے آغاز ہوا، شمع روشن کی گئی، انعامات تقسیم کیے گئے، کوئی نقشہ یا فہرست پیش کی گئی..... بہرصورت اس بات کا خیال رہے کہ آپ کی گزارش کا خریدار کون ہے اور وہ اس جلسے سے متعلق کونسی چیزیں اس گزارش میں دیکھنا پسند کرے گا۔

تجزیہ

جلسے، جلوس، نشست، مجلس، سمینار، کانفرنس، سمپوزیم اور اس نوعیت کے دیگر اجتماعات میں خبرنگار کو پروگرام سے قبل آمادگی، مصاحبہ اور گزارش نویسی کی خصوصیات کو روبہ عمل لانا چاہیے۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اجتماعات میں کہی ہوئی کوئی بھی بات یا محولہ دستاویز، نہ غیر رسمی بیان کے زمرے میں آتی ہے اور نہ ہی وہ صیغۂ راز میں رکھی جاسکتی ہے۔

خبروں کا ایک خاص اسلوب ہے، جس کا گذشتہ شماروں میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ خبر معکوس مثلث (الٹے اہرام) کی شکل میں لکھی جاتی ہے، اس میں اہم باتیں شروع میں اور غیر اہم بعد میں تحریر کی جاتی ہیں۔ اگر مقرر کی تقریر میں جملے پیچیدہ اور طویل ہیں تو خبرنگار کو چاہیے کہ وہ اُن جملوں کا مفہوم برقرار رکھتے ہوئے اُن کو چھوٹا اور عام فہم بنادے۔ تقاریر کی گزارش نویسی میں، صداقت اور واقعیت کو برقرار رکھتے ہوئے، نشریاتی ادارے کے "رنگ" کا چشمہ لگایا جاسکتا ہے۔

انیس احمد خاں انیس

مجھ دیوانے کو نہ ابھی تک میرے نام سے جانے لوگ
نام لیا جب میں نے ان کا تب مجھ کو پہچانے لوگ

میرے گھر کی آگ بجھانے والے تھے انجانے لوگ
لیکن آگ لگانے والے تھے جانے پہچانے لوگ

تم تو اپنے گھر کی خوشبو ہی کے نشے میں ڈوبے ہو
تم کیا جانو چھوڑ کے گھر کیوں جاتے ہیں میخانے لوگ

عقل تو ذہن کی الجھن ہے یہ صبر و سکوں لے لیتی ہے
پہلے عقل ہی والے تھے یہ بیچارے دیوانے لوگ

اپنی بات کہی تھی میں نے تو اپنے شعروں میں انیس
لیکن ان کو جان رہے ہیں اپنے ہی افسانے لوگ

بنی ہے وہ نظر دل کا قرار آہستہ آہستہ
خزاں پر جس طرح چھائے بہار آہستہ آہستہ

رُخِ منزل پہ آیا ہے نکھار آہستہ آہستہ
چھٹا ہے راہ کا گرد و غبار آہستہ آہستہ

نظر آئے گی اس کی چاند سی صورت ستاروں میں
جواں ہوگی یہ شامِ انتظار آہستہ آہستہ

ابھی دنیا کی نظروں میں یہ رشتہ معتبر کم ہے
بڑھے گا دو دلوں کا اعتبار آہستہ آہستہ

بدل جاتا ہے نازِ بے رُخی حسنِ تلطف میں
اثر اپنا دکھا دیتا ہے پیار آہستہ آہستہ

نسیم اس کی نظر جیسے طلوعِ صبح کا عالم
ہُوا روشن محبت کا دیار آہستہ آہستہ

نسیم نیازی

انجنا سدھیر

ہم ستاروں سے کیا کرتے ہیں باتیں اکثر
کاٹ دیتے ہیں تری یاد میں راتیں اکثر

پھر بھی منزل کی طلب شوقِ جنوں کم نہ ہوا
ہم کہ ہر گام پہ کھاتے رہے ماتیں اکثر

چاند کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی ہے ہم کو
دل کو اچھی نہ لگیں چاندنی راتیں اکثر

تیری تصویر کتابوں میں چھپا کر رکھ لی
تیری تصویر سے کرتے رہے باتیں اکثر

انجنا لب نہ ہلے اور نہ نظر ہی اُٹھی
اُن سے اس طرح ہوئی ہیں ملاقاتیں اکثر

سپریم کورٹ ایڈوکیٹس لائبریری نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۱۰۔سی، ڈی۔ ڈی۔ اے۔ فلیٹس، ماتا سندری روڈ، نئی دہلی ۲
۳۶۸، لکشمی نگر سوسائٹی، ایروڈرام روڈ، احمد آباد ۳۸۰۰۱۲

شبیہہ عبّاس جارچوی

اَن کہی

گول چہرا، سانولا رنگ، لمبی چوٹی، دراز قد، صراحی دار گردن، ابھرا ہوا جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں، متناسب بدن، غرض لڑکی کیا تھی ایک قیامت تھی۔ جس نے ایک دفعہ دیکھا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ حالانکہ گروپ میں اور بھی لگ بھگ بیس لڑکیاں تھیں۔ لیکن سب لڑکوں کی نظریں اُسی کی طرف اُٹھ رہی تھیں —— مشرقی پاکستان سے میڈیکل کالج کے دس طلبا کا گروپ دو اساتذہ کے ساتھ مغربی پاکستان کے تاریخی و تفریحی مقامات کا دورہ کرنے آیا تھا۔ کراچی سے بھی میڈیکل کالج کے بیس طلباؑ اور چار اساتذہ اس گروپ میں شامل ہوگئے تھے اور اس ۳۶ رُکنی گروپ میں کراچی کے طالبعلم گل محمد اور موہن داس نانکانی بھی شامل تھے۔

"نگر ٹھٹھہ" بس کے رُکتے ہی بنگالی طالبعلم ابوالقاسم موجمدار نے پُرزور نعرہ لگایا۔ اور سب لوگ کراچی یونیورسٹی کی بس سے اتر کر شاہجہاں کی بنائی ہوئی شاہی مسجد کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ ایک گائیڈ گروپ کے افراد کو ایک سو ایک مینار کی اس تاریخی مسجد کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ گروپ مکلی پہنچ گیا۔ مکلی پہنچ کر طلبا نے بس میں سے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے دیگ اُتاری۔ اور ایک مقبرے کے احاطے کے سائے میں کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ لوگوں کے کھانا کھانے کے دوران گائیڈ نے کھڑے ہوکر کہنا شروع کیا۔ "چھ مربع میل سے زائد رقبے پر پھیلا ہوا دنیا میں مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا قبرستان آج سے چار سو سال پرانی ایک عظیم تہذیب کی یادگار ہے۔ ۱۳۴۰ء سے ۱۷۳۹ء تک کے زمانے میں ٹھٹھہ شہر کو خاندانِ سمّہ، ارغون، ترخان، اور شاہانِ مغلیہ نے شان و شوکت بخشی، بعض یورپی سیاحوں نے شہر ٹھٹھہ کو "کانِ زر" کے نام سے موسوم کیا۔ یہاں عہدِ مغلیہ کے مقابر میں جانی بیگ، غازی بیگ، طغرل بیگ، جان بابا اور دیوان شُرفا وغیرہ کے مقبرے قابلِ ذکر ہیں۔ ترخان اور ارغون دور کے مقابر میں عیسیٰ خان، ترخان اوّل، باقی بیگ ترخان، اہنسا بائی، سلطان ابراہیم، میر سلیمان اور دیگر مقبرے شامل ہیں۔ عہدِ سمّہ کے زمانے کے مقابر میں حاجی نظام الدین، مبارک خان، ملک راجپال کے مقبرے اور کچھ چھتریاں جو اوائل چودھویں صدی کی قبروں پر مبنی ہیں، خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اینٹیں اس قدر عمدہ ہیں کہ چوٹ لگنے پر ٹھنکتی ہیں اور ٹوٹنے کی حالت میں شیشے کی طرح چکنی نظر آتی ہیں۔" گائیڈ کے بیان اور کھانے کے بعد متعدد گروپ فوٹو لیے گئے۔ موقع پا کر گل محمد نے موہن داس سے اس لڑکی کا ذکر کیا تو اس نے فوراً جواب دیا۔ "اوہ یو بروٹس ٹو"

"ارے میرے سیزر یہاں تو نہ جانے اور کتنے بروٹس ہوں گے تم کس کس کا وار بچاؤ گے۔"

گل محمد نے جواب دیا۔ "لیکن تم تو میرے عزیز دوست ہو اسی لیے تمھیں بروٹس کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا تو یہ معاملہ ہے تو یہ تو بتاؤ کہ اس قتالۂ عالم کا نام کیا ہے۔" گل محمد نے دوسرا سوال کیا۔

"اس کا نام ہے گیتا اُپادھیائے چودھری۔"

نانکانی نے جواب دیا۔ "اچھا پھر ہم ڈوئل سے دستبردار ہوئے اور سوئمبر کی تقریب میں اور کھڑے ہوں تو ہوں لیکن یہ ناچیز بندہ اب اُمیدوار نہیں البتہ کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ لیکن ایک بات میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ عشق کی اس راہِ پُرخار میں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، نہیں تو پتھر کے ہو جاؤ گے اس راہ میں بڑے بڑے بہروپیے، راہِ مستقیم سے بھٹکانے والے اور ظالم سماج آتے ہیں۔ اگر اُن سب کے وار اور سوانگ سہہ جاؤ گے تو کامیابی کا امکان ہے بشرطیکہ معاملہ یکطرفہ نہ ہو بلکہ دوطرفہ ہو —— میری یہ باتیں گرہ میں باندھ لو۔" گل محمد نے آخری جملہ کہہ کر اپنی بات ختم کی بعد میں گل محمد گروپ کے دوسرے ارکان سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

نانکانی نے مس چودھری سے تعارف حاصل کرکے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کردیں۔ کچھ دیر کے بعد نانکانی نے گل محمد سے بھی اس کا تعارف کرایا۔ نانکانی مس چودھری کو سندھ کے اہم مقامات خاص طور سے ہندوؤں کے تاریخی مقامات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اور وہ اس سے بنگال کے متعلق باتیں کرتی رہی —— نانکانی مس چودھری کو بتا رہا تھا۔ "ایک زمانے میں ہندستان کا کوئی بھی شہر تجارت میں ٹھٹھہ کے برابر نہیں تھا۔ اور یہاں کپڑے بُننے والوں کے تقریباً تین ہزار خاندان آباد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کھیس (سندھ کا مخصوص اور شکل سے بننے والا کپڑا) تیار کرنے والے کاریگر تھے۔ مس چودھری یہ ٹھٹھہ جہاں

H-28-A/8, MALIR EXTENSION
COLONY, KARACHI -37

اس وقت آپ موجود ہیں اپنے زمانے میں بڑا صنعتی
مرکز اور بڑی بندرگاہ تھا۔ اور یہاں ہر وقت
سمندری جہازوں کی قطاریں موجود رہتی تھیں۔
پھر ہوا یہ کہ ۱۶۹۶ء میں ٹھٹھہ شہر میں طاعون کی
ایسی وبا پھیلی جس نے ٹھٹھہ اور اس کے آس پاس
کے علاقوں میں تباہی مچادی اور صرف ٹھٹھہ شہر
کے ریشمی اور اونی کپڑے بننے والے اسّی ہزار کاریگر
مر گئے۔ کچھ دریائے سندھ کے رخ تبدیل کرنے
سے بھی اس شہر پر تباہی آئی اور ماضی کا شان و
شوکت والا یہ شہر ایک پرانے کھنڈر اور اُجڑے
ہوئے شہر میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔" بس تیار
ہے سب لوگ واپس کراچی جانے کے لیے بس میں
بیٹھ جائیں۔" بعد میں یہ گروپ جھنبور اور جوکنڈی
سے ہوتا ہوا واپس کراچی آگیا۔ بنگال سے آتے
ہوئے طلبا کچھ اور مقامات کا دورہ کر کے واپس
چلے گئے۔

میڈیکل کا فائنل امتحان پاس کرنے کے
بعد ڈاکٹر گل محمد اور ڈاکٹر موہن داس نانکانی کا
تقرر حسب اتفاق سے ایک ہی ہسپتال میں ہو گیا
تو ان کا باہمی تعلق اور دوستی مزید مستحکم ہو گئی۔
نانکانی گل محمد کو بتاتا کہ اس کی خط و کتابت مس
چودھری سے برابر ہوتی رہتی ہے۔ وہ بھی اب
ڈاکٹر ہو چکی تھی۔ اور ملازم ہو گئی تھی۔ دو چاہنے
والے دلوں کے درمیان طویل فاصلہ حائل تھا۔ کچھ
عرصے کے بعد ڈاکٹر گل محمد کا اس اسپتال سے کسی
دوسرے شہر کے اسپتال میں تبادلہ ہو گیا اور
بعد ازاں ڈاکٹر نانکانی بھی اس اسپتال میں نہ رہا
علیحدہ ہونے کے بعد کچھ عرصے تک تو دونوں دوستوں
میں خط و کتابت باقاعدگی سے ہوتی رہی پھر خطوط
کا دورانیہ طویل ہوتا گیا اور پھر آپس کا تعلق مکمل
طور پر منقطع ہو گیا۔

بہت عرصے بعد کی بات ہے، ڈاکٹر گل محمد اب
بوڑھا ہو چکا تھا، اس کے بال سفید ہو چکے تھے
اور ٹھوڑی کے نیچے کھال لٹک گئی تھی۔ آنکھوں
پر دبیز شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ ماضی کا نوجوان
اور شوخ ڈاکٹر اب ملازمت سے ریٹائر ہونے
کے بعد اپنے آبائی گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔
ڈاکٹر کی داہنی آنکھ میں موتیا اُتر آیا تھا اور اس
نے اپنے گاؤں کے ضلعی ہیڈ کوارٹر جا کر آپریشن
کرالیا تھا۔ اب اس کی بائیں آنکھ میں بھی سفیدی
جھلکنے لگی تھی اور وہ شہر جا کر آپریشن کرانے کے
متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے برابر والے گاؤں
میں مفت آئی کیمپ لگنے کی اُسے خبر ملی تو وہ بھی
وہاں پہنچ گیا۔ چند سو گھروں پر مشتمل اس دیہات
کے باہر کھلے میدان میں متعدد شامیانے لگے ہوئے
تھے جہاں آئی کیمپ کا عملہ موجود تھا۔ قرب و
جوار کے دیہاتوں کے مریضوں کا آنا جانا لگا ہوا
تھا۔ دوسرے دیہاتوں سے آنے والے معمولی نوعیت
والے مریض صبح یا دوپہر تک آتے اور اپنی باری آنے
کے بعد ڈاکٹر کو دکھا کر دوائیں لے کر سہ پہر
یا شام تک واپس چلے جاتے لیکن جن مریضوں
کا آپریشن ہونا ہوتا وہ اپنے ساتھ بستر بھی لاتے اور
انھیں دو تین دن وہیں ٹھہرنا ہوتا۔ آئی کیمپ
کے پاس ایک عارضی ہوٹل بھی کھل گیا تھا جہاں
ہوٹل والا دو قسم کے کھانے تیار کرتا، ایک وہ سالن
جن میں مرچیں بالکل نہ ہوتیں اور جو مریضوں کے
لیے ہوتا اور دوسرے عام کھانے جو ان کے
ساتھ آنے والے عزیزوں اور دوسرے لوگوں کے
لیے ہوتے۔ پان، بیڑی، سگریٹ کا ایک خوانچے
والا بھی یہاں آگیا تھا۔ کیمپ کے ایک طرف
گارڈن کے کچے پکے، اونچے نیچے بے ترتیب
مکانات تھے تو دوسری طرف دور تک دھان
کے کھیت تھے۔ جن کے درمیان کہیں کہیں آم کے
اونچے نیچے درخت کھڑے نظر آتے۔ کیمپ سے کچھ
فاصلے پر ایک نہر تھی جس پر لڑکے پل سے نہر میں
چھلانگ لگاتے اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ
تیرتے ہوئے غوطہ لگا کر دور جا کر سر پانی سے باہر
نکالتے اور پھر کنارے پر آکر باہر نکلتے اور پیدل
پل تک واپس آکر پھر چھلانگ لگاتے اور یہ
سلسلہ کئی گھنٹوں تک جاری رہتا۔

بوڑھے گل محمد نے پرچی بنانے والے سے
پرچی بنوائی اور ڈاکٹر کو دکھانے والے مریضوں کی
قطار میں بیٹھ گیا۔ پرچی بنانے والے نے اُسے بتایا
کہ اگر ڈاکٹر نے اُس کا آپریشن تجویز کیا تو اُس کے
آپریشن کا نمبر دو دن کے بعد آئے گا۔ ڈاکٹر
نے پرچی دیکھی اور مریض کو دیکھا۔ وہی نام وہی
چہرہ۔ ڈاکٹر نے مریض کو پہچان لیا لیکن مریض ڈاکٹر
کو نہ پہچان سکا۔ مشہور آئی سرجن ڈاکٹر موہن
داس نانکانی نے اپنے کالج کے دوست کو بتایا کہ
وہ اس کا پرانا دوست ہونے کے ناطے اس کے
گاؤں جا کر اُس کی آنکھ کا آپریشن کرے گا تا کہ وہ
خود تکلیف اُٹھالے لیکن مریض کو زحمت نہ ہو
ڈاکٹر نانکانی نے کیمپ سے جلدی فراغت
حاصل کر لی اور آپریشن کا سامان اور کچھ دوائیں
ساتھ لیں اور گل محمد کے ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچ
کر متعدد ضروری اور غیر ضروری باتوں کے بعد
ایک وقت آیا جب گل محمد نے ڈاکٹر نانکانی سے
گیتا اپادھیائے چودھری کے متعلق پوچھا۔ جواب
میں ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ اس کے گھر میں ہے اور
ٹھیک ہے۔ بچوں کے متعلق پوچھنے پر اس نے بتایا
کہ اس کے دو بیٹے تھے اور عین جوانی میں دونوں
ایک ساتھ ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئے اور
اب وہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہیں۔ گل محمد نے

ڑناٹکانی سے مزید سوال کیا "یار ناٹکانی یہ
ہیں اکثر تمھارے بارے میں سوچتا تھا اور
تک میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ کیا یہ محبت کا جذبہ
رُس چودھری اپنے وطن اور عزیزوں سے
ہو کر اور ساری زندگی کے لیے ان سے علیحدہ
ر تمھیں اپنانے پر آمادہ ہوگئی یا اس کا کوئی
سبب تھا اور تمھاری طرف سے بھی صرف
ق و محبت کا ہی معاملہ تھا یا کوئی اور وجہ بھی
، مزید یہ کہ اگر کوئی اور سبب بھی تھا تو وہ کیا
" یار گُل محمد کیا کروگے یہ بات پوچھ کر" رہنے
" ناٹکانی نے جواب دیا۔ کچھ دیر تک دونوں
ست مختلف باتیں کرتے رہے۔ ہوتے ہوتے
تگو ایک مرتبہ پھر غیر ارادی طور پر وہیں پہنچ گئی
ڈاکٹر ناٹکانی نے بتایا کہ میں نے تو اپنی طرف سے
جوئی کے ساتھ سیدھا سادہ عشق کیا تھا۔ لیکن
بری اہلیہ کی طرف سے معاملہ اس قدر سادہ نہیں
ا۔" یار تو اب ہمیں بھی بتادو، بڑھاپے میں کیوں
یلیاں بھجوا رہے ہو۔" گُل محمد نے اس مرتبہ زور

دے کر اصرار کے ساتھ کہا۔ ناٹکانی کچھ دیر خاموش رہا اور سوچتا رہا۔ پھر بولا "گُل محمد تم میرے لڑکپن کے دوست ہو اور بات کو حد سے زیادہ چھپانے یا جھوٹ بولنے کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تمھارا اصرار ہے تو میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ میری بیوی کے لیے اپنے جاننے والوں، رشتے داروں وغیرہ میں شادی کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ یہ بات میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی لیکن تمھیں بتا رہا ہوں بات اصل میں یہ ہے کہ میری بیوی کے والدین غریب لوگ تھے۔ میری بیوی سے بڑے اُن کے پانچ بچے تھے۔ ہوا کچھ یوں کہ پانچ بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی اور شوہر کی موجودگی کے باوجود میری ساس کا ایک دوسرے مرد سے معاشقہ چل گیا اور ناجائز تعلقات قائم ہوگئے۔ اُن کی ملاقاتوں کا علم شوہر کو ہوگیا اور متعدد ثبوت بھی مِل گئے لیکن شوہر کمزور اور غریب شخص تھا اس کا اپنی بیوی کے نئے عاشق سے ٹکرانا مشکل تھا۔ لیکن اس نے بھی ایک فیصلہ

کرلیا۔ وہ یہ کہ اس نے ساتھ رہنے کے باوجود بیوی سے زن و شوہر کا تعلق منقطع کرلیا اور اس کے باوجود بھی ایک خاص مدت کے بعد جب اُس کی بیوی کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تو وہ اُسے ہسپتال سے سیدھا لے کر اپنی بیوی کے عاشق کے گھر پہنچ گیا۔ وہ شخص بھی شادی شدہ تھا اس نے اُس سے کہا کہ میں چھوٹے چھوٹے پانچ بچوں کا باپ ہوں اس لیے بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ تم بھی شادی شدہ ہو لیکن یہ تمھاری امانت تم تک پہنچانے آیا ہوں۔" اس شخص نے اپنے رسوخ سے کام لے کر اس بچی کو کسی بے اولاد جوڑے کو دِلوا دیا۔ جنھوں نے اسے اچھی تعلیم دلوائی اور جس سے بعد میں میں نے شادی کی۔" ڈاکٹر ناٹکانی نے اپنی بات ختم کی۔ گُل محمد بولا " دوست یہ دنیا اتنی سادہ نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ ہاں دوست۔" ناٹکانی نے جواب دیا اور پھر دونوں دوست دوسری باتوں میں مشغول ہوگئے۔

صولت علی خاں (علیگ)

دودمانِ داغ کا ایک دیدہ ور شاعر

جس زبانِ داغ کی دھوم سارے ہندستان میں مچی ہوئی تھی، اسی زبان کی بہار راجپوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست ٹونک کے درودیوار پربھی چھائی ہوئی تھی۔ عوام وخواص داغ کی زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ بکتہ ورانِ باکمال اور سخن ورانِ شیریں مقال داغ کی زمین میں غزل کہنے کو استادی سمجھتے تھے۔ دلی کی ٹکسالی زبان یہاں رچ بس گئی تھی۔ رئیس سے فقیر تک کی زبان پر داغ کے شعر اور داغ کی زبان کا چرچا تھا۔ داغ کے چہیتے شاگرد عاشق مرحوم بھی اسی سرزمین کے سپوت تھے جن کے لیے داغ نے کہا ہے:

اس کو عاشق بھی لوگ کہتے ہیں
داغ کا نام دوسرا بھی ہے

مولانا احسن مارہروی نے عاشق مرحوم کو داغ کے نورتنوں میں شمار کیا ہے۔ ٹونک میں دو ہی اسکول تھے۔ ایک دلی دبستان، جس کے میرِ کارواں عاشق تھے۔ دوسرا لکھنوی دبستان، جس کے قافلہ سالار حضرت کیف مرحوم تھے۔

لیکن ٹونک میں عاشق مرحوم کا سکہ زیادہ چلتا تھا۔ زیادہ تر شعرا عاشق کے تلامذہ تھے۔ خود رئیس وقت نواب ابراہیم علی خاں خلیل اور بعدہٗ نواب سعادت علی خاں مختار، عاشق سے متاثر تھے۔

انھیں عاشق داغ کے شاگردِ رشید حضرت نظر بھی تھے۔ عاشق صاحب اپنے شاگردوں میں جن پانچ پر زیادہ فخر کرتے تھے وہ تھے مُرشدی حضرت صولت، حضرت ہمام، حضرت نظر، حضرت احسان اور حضرت اعجاز۔

نظر اور احسان نے تو عاشق ہی کے طرز پر شعر کہے۔ اور نظر صاحب اس اعتبار سے عاشق کے صحیح جانشین تھے کہ وہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ غزل کے تو وہ شاعر تھے ہی لیکن ٹھمری دادرا، خیال، جلاب، سہاگ، مانڈے، گیت، شادیانے، بہاریں، برساتیں لکھنے میں دوسرے عاشق تھے۔ محاکات، اور تغزل کے دھنی تھے۔ خود عاشق کہتے تھے کہ نظر اس رنگ سے غزل کہتا ہے کہ غزل خود اس کی زندگی کا رنگ و آہنگ بن جاتی ہے۔

بنیری خانوادے کے سالار، یوسف زئی پٹھانوں کے قافلہ سالار، اخوند محمد ایاز خاں جو اپنے وقت کے ایک متبحر عالم بھی تھے ٹونک آکر بس گئے تھے انھیں کے اخلاف میں حضرت نظر تھے۔

اخوند محمد ایاز خاں تحصیل علم کے لیے نیبر وال سے ہندستان چلے آئے تھے اور نواب امیر خاں کے لشکر میں عساکر کشا اور کشور گیر مرد میدان بن گئے تھے۔ نواب امیر خاں نے شادی بھی اسی مجاہد عالم کی بیٹی سے کی تھی۔ اور ریاست کے قیام سے نواب امیر خاں کے ساتھ اخوند محمد ایاز خاں بھی ٹونک میں آبسے تھے۔ جدّی رشتے سے صاحبزادہ محمد امداد علی خاں نظر انھیں کے خاندان سے تھے اور ننھیال کی طرف سے نواب ابراہیم علی خاں بہادر خلیل چہارم فرمانروائے ٹونک کے خاندان سے تعلق تھا نظر صاحب نواب ابراہیم علی خاں کے بھائی صاحبزادہ عبدالوہاب خانصاحب (جو نائب ریاست ہونے کے علاوہ ایک متبحر عالم اور بزرگ صوفی بھی تھے) کے نواسے تھے۔ اس طرح نظر صاحب کا سلسلہ ایک طرف اگر عبدالوہاب خاں صاحب تک جاتا ہے تو دوسری طرف فقیہ و محدث و قاری حضرت مولانا عبدالمجید خاں صاحب عرف نوشے میاں تک جاتا ہے۔

جناب صاحبزادہ امداد علی خاں صاحب ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد کا نام صاحبزادہ الیاس علی خاں تھا جو قلعدار تھے۔ یہ عہدہ آپ ہی کے خاندان میں وارثتہً چلا آرہا تھا۔ ٹونک کے آخری قلعدار نظر صاحب کے والد مرحوم تھے اور نائب قلعدار خود نظر صاحب تھے آپ نے اصلاح خاندان کی غرض سے ایک انجمن خاندانِ امیریہ بنائی تھی۔ جس سے ناراض ہوکر نواب سعادت علی خاں مرحوم نے آپ کو اس عہدے سے برطرف کردیا تھا۔ چونکہ نظر صاحب نواب صاحب کے بھانجے تھے، اس لیے بہن کی خاطر زیادہ سزا نہ دے سکے۔ آخر میں معافی ہوجانے کے بعد نواب سعادت علی خاں نظر صاحب سے بہت خوش تھے۔ شعری مجالس میں اور خلوت وجلوت میں بہت قریب رکھنے لگے تھے۔

حضرت نظر نے ابتدا میں جیساکہ خاندان کا رواج تھا قرآن شریف پڑھا اور پھر فارسی عربی کی درسی کتب گھر پر ہی نکالیں، منشی اور منشی کامل کے امتحانات دیے۔ انگریزی بھی تھوڑی بہت پڑھی تھی۔ افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ وہ رنج وغم اور یاس والم کے ہو رہے تھے۔ زندگی میں زیادہ تر پریشان حال رہے اور پریشان حال ہی عالم

نذر باغ، ٹونک (راجستھان)

جاودانی کو سہارے۔ غم ان کی زندگی کا عنوان بن
گیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری پر بھی المیہ رنگ
چھایا ہوا ہے۔ ابتدائی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔
حضرت بسمل سعیدی ان کے دوستوں میں
ہی نہیں بلکہ رضاعی بھائی تھے۔ بسمل صاحب نے
ان کی موت پر دلی سے اظہار تعزیت اس طرح کیا تھا۔

"واجب الاکرام شوکت صاحب
سلام مسنون
قاضی صاحب منظور میاں کے خط سے معلوم
ہوا کہ صاحبزادہ یسین محمد خاں کی بیگم صاحبہ کا
انتقال ہو گیا ہے۔ بہت رنج ہوا۔ بہت کچھ یاد
آتا رہا۔ بڑے تعلقات تھے ہمارے ہاں سے اور
یہ کہ جناب صاحبزادہ امداد علی خاں نظر بھی اللہ
کو پیارے ہو گئے۔ ذاتی طور پر بھی بربنائے تعلقات
مجھے صدمہ ہوا۔ اور آپ کے رنج و غم کے تصور سے
بھی مجھے ان حادثات کا رنج ہوا۔ میری جانب سے
دلی تعزیت قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت
فرمائے ان پر رحمتیں فرمائے اور متعلقین پسماندگان
کو صبر و شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ میں
بڑی مشکل سے لکھ سکتا ہوں ورنہ نظر صاحب
کی دائمی مفارقت پر ان کی استادانہ خدمتِ
شعر پر بہت کچھ لکھتا۔"
(خط بنام صاحبزادہ شوکت علی خاں)

نظر صاحب ایک کہنہ مشق، قادر الکلام
غزل گو شاعر تھے۔ آج کے دور میں بھی وہ دلی اور
دلی کی تہذیبی اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے اس
طرح بیٹھے تھے جس طرح کوئی بے سروسامان،
آشفتہ سر خانماں برباد، ناشاد و نامراد قافلے
سے بچھڑا ہوا ایک جگہ بیٹھا ہو۔ وہ شاعر کے علاوہ ایک
ادیب، مفکر اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔ ان کی شاعری
میں کیف و مستی کم، درد و الم، یاس و حرماں زیادہ
ہے۔ زبان کی نفاست و نزاکت کے ساتھ ساتھ
مضمون آفرینی، جدت اور اسلوب کی نیرنگی نے
ان کی شاعری کو تڑپ، برجستگی اور تاثیر بخشی
تھی۔ ۸۵ سالہ زندگی میں دیوان کے دیوان کہہ
ڈالے۔ وہ دل کے شکستہ ساز کی ایک ایسی آواز
تھے۔ جس کے ہر تارِ نفس میں کرب و اضطراب
درد و یاس، غم و الم کی جان گسل کیفیات سمائی
ہوئی تھیں۔ وہ سراپا شعر تھے۔ وہ خود شعر کا مزاج
بن گئے تھے۔ یا شعر خود ان کا مزاج بن گیا تھا۔
مشکل سے مشکل زمینیں اور نزاکت خیال کے
ساتھ ساتھ زبان کی نزاکتوں کا لحاظ، الفاظ کا رکھ
رکھاؤ، اسلوب کی نیرنگی، نظر صاحب کے یہاں
یہ خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ مشاعروں میں
آن بان سے تحت میں اس طرح غزل پڑھتے تھے
کہ خیال، جذبہ اور تاثیر نظر کے سامنے مجسم ہو جاتے
تھے۔ وہ جس جذبے سے شعر کہتے تھے اسی جذبے
سے شعر پڑھتے تھے اور سامع کا متاثر ہونا لازمی تھا۔
ایک واقعہ یاد آ رہا۔ ریاست کو ختم ہوئے زیادہ
دن نہیں ہوئے تھے۔ ایک خصوصی مشاعرہ نواب
اسماعیل علی خاں صاحب تاج مرحوم آخری فرماں
روائے ٹونک کے محل میں ہو رہا تھا۔ ان کے مشیر
سخن حضرت خنداں بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے
اور مشاعرے سے باہر جا کر وارفتگی کے عالم میں بار
بار ایک شعر دہرانے لگے۔ وہ شعر حضرت نظر کا
تھا۔ جس پر خنداں صاحب سر دھنتے ہوئے
بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ شعر یہ تھا:

انھی آنکھوں نے زمانے کو کہاں دیکھا تھا
انھی آنکھوں نے زمانے کو کہاں دیکھا ہے

دلی اسکول اور لکھنوی اسکول کی نوک جھونک
چلتی رہتی تھی۔ ایک مشاعرے میں کیف مرحوم نے
غالب کی زمین میں غزل پڑھی۔ مقطع تھا:

غالب دہلوی سے کیف جس میں غزل نہ بن پڑی
میں نے اسی زمین میں کہہ کے بتا دیا کہ یوں

نظر صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی، اسی وقت غزل
کہی اور مقطع پڑھا:

غالب دہلوی سے تو کیف بڑھے تھے کیا مگر
کیف سے بڑھ کر اے نظر تم نے بتا دیا کہ یوں

نظر صاحب کی شاعری میں وسعت خیال کے ساتھ
ساتھ گہرائی اور گیرائی بھی تھی، یہ وسعت خیال
ودیعت تھی اپنے محبوب حقیقی کی تلاش و جستجو کی۔
کہتے ہیں:

میں وسعتِ خیال بڑھاتا چلا گیا
لیکن وہ آج تک نہیں آئے خیال میں

اور پھر خیال کی پہنائیوں میں کھو کر بھی نہ کہیں قیام
کیا نہ قرار لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ الفت میں صبر تو آتا
ہی نہیں، حرماں نصیبی سے تھک جانے کو سکون و
قرار کہو تو کہہ لو:

صبر تو کمبخت اس الفت میں آتا ہی نہیں
دل کے تھک جانے کو یوں کہہ دو قرار آ ہی گیا

لیکن محبت میں پاس ادب اور تاکید صبر
کے وہ اتنے قائل تھے کہ اپنی ناکامی کے لمحات میں بھی
ضبطِ فغاں کی تصویر بن جاتے تھے۔ لیکن پھر ضبط
پیہم سے گھبرا کر بے اختیارانہ رو بھی پڑتے ہیں۔
لیکن کس اچھوتے انداز سے روتے ہیں کہ:

میں کہاں روتا ہوں جب سے صبر کی تاکید ہے
آج کچھ رونا مجھے بے اختیار آ ہی گیا

عشق کی اس صحرا نوردی میں وہ قدم
قدم پر صبر آزما لمحات سے گزرتے ہیں اور اپنی
پے در پے ناکامیوں کے ساتھ صبر کو کامیابی اور
آسودگی کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنی ان ناکامیوں
پر تمسخر اغیار سے تھراتے ہیں۔ عزت نفس کی خاطر
ناکامی تو منظور ہے لیکن شماتت اغیار گوارہ نہیں،

ہ اُٹھتے ہیں :

یسے ناکامیوں پہ تو بالآخر صبر آ جاتا
گر دشمن مری ناکامیوں سے کام لیتے ہیں

نظر کی شاعری تغزل کی ان منزلوں سے
رتی ہوئی وصل کو بھی ہجر کے جاں گسل لمحات
بیر کرتی ہے اور وہ بے نیازِ فراق و وصال
ر کہہ اُٹھتے ہیں کہ :

کونِ قلب کی تکمیل تجھ سے بھی نہیں ہوتی
و پھر فرقت میں تیری کون ہے جو یاد ہوتا ہے

شکایت کس انداز سے کرتے ہیں کہ شعر کے
ایک لفظ سے عیاں بھی ہے اور نہاں بھی :

س کا ذرا سا رنج گوارا نہ ہو سکا
فسوس ہے کہ وہ بھی ہمارا نہ ہو سکا

نظر صاحب نے غزلوں کا ایک مکمل دیوان
مجموعۂ رُباعیات' ایک مسدس اور ایک
شاہپارہ 'پارسی ناٹک' کی شکل میں چھوڑا ہے۔
جستھان کے اردو ادب کا بیش بہا ذخیرہ
ور باقیات الصالحات کی شکل میں روح کو
دگی' قلب کو کیفیاتِ سوز و سازِ زندگی اور
غ کو آسودگی دیتا رہے گا۔

جواں مرگ لیکن باکمال شاعر جناب
ر ٹونکی نے ایک نظم ٹونک کے نامور شعراء پر
تھی۔ اس نظم میں وہ نظر صاحب کا ذکر ان
وں میں کرتے ہیں :

ما شاعر اپنا اسم بامسمیٰ ہے نظر
جس کی نظروں سے نہیں صنفِ سخن کوئی نہاں
کا اک اک لفظ ہے جذبات میں ڈوبا ہوا
جس کا اک اک شعر ہے رنج و الم کی داستاں
دلِ پر مرتسم ہے اس کا اک اک شعر یوں
جیسے تھم کے رہ گیا ہو غم کا بحرِ بے کراں

ہے وہ گر ہمدرد اپنوں کا تو غیروں کا رفیق
ہے اسے یکساں حدیثِ خویش و حرفِ دیگراں

اس کے پہلو میں نہاں سارے جہاں کا درد ہے
وہ ہے وابستہ جہاں سے اس سے وابستہ جہاں

دردِ غم سارے جہاں کے اور مرکز اس کا دل
ساری دنیا کے ستم اور اس کی جانِ ناتواں

ایسا گھیرا ہے اسے فکرِ بلند و پست نے
جیسے اس کو پیس ڈالیں گے زمین و آسماں

ہر ستم ہے اس پہ یوں جو رِ ستم ایجاد کا
جیسے اس کے ہی لیے ہو ہر بلائے ناگہاں

ہے وہ اک زندہ مرقع سوز و سازِ عشق کا
آہ جو کمبخت پھنک جائے نہ دے لیکن دھواں

وہ ہیولیٰ ہے یہ غم کا ہے یہ وہ تصویرِ حزن
سانس لیتی لاش اک تربت ہے جو جیتی یہاں

آخر میں نظر صاحب کی غزلوں کے چند اشعار اور ایک رباعی پیش کر کے یہ مضمون ختم کرتا ہوں :

عدو سے التفات اُن کا فقط اک چھیڑ ہے میری
سراسر ہوں منت ہو جو دشمن شاد ہوتا ہے

نہیں آتی تری وجہِ مسرت ذہن میں جس دن
تو پھر مشکوک کیا کیا یہ دلِ ناشاد ہوتا ہے

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں

میں وسعتِ خیال بڑھاتا چلا گیا
لیکن وہ آج تک بھی نہ آئے خیال میں

دل کو سرور چاہیے پھر کیوں پیوں شراب
تم ہی کو کیوں نہ دیکھ لوں عہدِ شباب میں

وہ زبانہ لاؤں کہاں میں یہی سوچتا ہوں کہ کیا کروں
مجھے دیکھ کر رہے شاد تو میں نثار تجھ پہ ہوا کروں

یہی چاہتا ہوں میں رات دن اسی شغل میں رہا کروں
تری باتیں سب سے سنا کروں ترے قصے سب سے کہا کروں

رُباعی :

مُنہ اپنا کسی حال میں کوشش سے نہ موڑ
اُمید بڑی چیز ہے اُمید نہ توڑ
کیا ہوگا مآل اس کی نہ کر فکر کبھی
یہ کام ہے اللہ کا اللہ پہ چھوڑ

نئی مطبوعات

فرہنگِ کلیاتِ میر

مصنف : ڈاکٹر فرید احمد برکاتی
ناشر : " " " "
صفحات : ۸۵۴
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کے پتے: (۱) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
(۲) مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور (راجستھان)
(۳) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین الدولہ پارک، لکھنؤ (یو۔ پی)

ڈاکٹر فرید احمد برکاتی، ٹونک کے ایک نامور علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں اور آج کل راجستھان یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو و فارسی میں بہ طور استاد تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب، ان کا ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جو نہ صرف طلبہ کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ اس سے اردو شاعری بالخصوص کلامِ میر کے عام شائقین بھی مستفید ہوں گے۔ میر کو عام طور پر ایک سہل شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن سچائی اس کے برعکس ہے۔ ان کا کلام اگر ایک طرف ہمہ جہت معنوی ابعاد کا حامل ہے تو دوسری طرف زبان و بیان کی سطح پر بھی اس میں بڑی نزاکتیں اور باریکیاں پائی جاتی ہیں۔ ان نزاکتوں اور باریکیوں تک رسائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف میر کے اسلوب سے گہری واقفیت بہم پہنچائی جائے بلکہ عہدِ میر کی زبان، اس وقت کے روزمرہ اور اس معاشرتی اور تہذیبی فضا سے بھی آگاہی حاصل کی جائے جس میں میر کا شعری کارنامہ سر انجام پایا۔ ڈاکٹر فرید احمد برکاتی نے دونوں پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے مبسوط مقدمے اور اس کے حواشی سے، اگر میر کے عہد اور اس عہد کے علمی ادبی ماحول نیز لسانی تشکیلات کے تاریخی عمل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو ان کی مرتب کردہ فرہنگ، کلامِ میر میں مستعمل ایسے ہزاروں الفاظ، تراکیب اور محاورات کی تشریح و توضیح سے ہمارے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرتی ہے جن سے باخبری کلامِ میر کو خاطر خواہ طور پر سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے۔

کتاب کے مقدمے میں برکاتی صاحب نے کلامِ میر کے ان تمام نسخوں کا تعارف بھی کرا دیا ہے جنھیں سامنے رکھ کر انھوں نے فرہنگ مرتب کی ہے اور مختلف نسخوں میں انھیں جو اختلاف نظر آئے ہیں ان کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ فرہنگ میں الفاظ و تراکیب کے جو معنی درج کیے گئے ہیں، وہ مستند لغات سے، حوالے کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اور اگر کسی مشہور و معتبر لغت میں کوئی لفظ نہیں ہے تو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہیں کہیں برکاتی صاحب نے محض قرینے اور قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ ایسا غالباً انھوں نے اس صورت میں روا رکھا ہے جب کوئی لفظ یا اس لفظ کا وہ استعمال جو میر نے کیا ہے، انھیں ان لغات میں سے کسی میں نظر نہ آیا جو فرہنگ مرتب کرتے ہوئے ان کے سامنے تھیں۔ (ان کی فہرست شاملِ کتاب ہے) مثلاً میر کا ایک شعر ہے:

راہ خوبی کی بتا کر اُسے گمراہ کریں
تو سہی ضد سے تری ایسی ہی شتاہ کریں

شتاہ، جیسا کہ متعدد حوالوں سے فرہنگ میں بھی درج ہے "بے حیا، حرافہ، شوخ دیدہ، قحبہ، بدچلن عورت" کو کہتے ہیں۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے برکاتی صاحب نے "شتاہ کرنا" کا مطلب لکھ دیا ہے "مکاری کرنا، شوخ چشمی کرنا، بے حیائی کرنا" لیکن اس سے غالباً وہ خود بھی مطمئن نہیں اسی لیے اس کے آگے انھوں نے سوالیہ نشان کی علامت لگا دی ہے۔ شعر میں بھی اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو پہلے مصرعے کے "اُسے" کا مشارٌ الیہ کون ہوگا؟ راقم السطور کے خیال میں یہاں "شتاہ کرنا" کا مفہوم وہی ہوگا جو "رنڈی کرنا" کا یعنی رنڈی سے بیاہ کر لینا۔ واضح رہے کہ یہ شعر واسوخت کا ہے۔

کتابت، طباعت زیادہ اچھی نہیں لیکن اس سے کتاب کی افادیت اور اہمیت کم نہیں ہوتی۔

——— مخمور سعیدی

گجری مثنویاں

مصنف : ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۳۵ روپے
ناشر : گجرات اُردو اکادمی، گاندھی نگر، گجرات

گجرات اُردو اکادمی کے سیکریٹری نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے: "اُردو زبان کی ترقی اور ترویج میں گجرات کا ایک اہم تاریخی رول رہا ہے۔ آج بھی گجرات میں ایسے ادیب، شاعر، نقاد اور محقق پیدا ہوتے ہیں جن کے ادبی کارناموں کا اعتراف ہندستان گیر پیمانے پر ہوا ہے۔ اُردو زبان کو گجرات میں نشوونما پانے کے بہتر مواقع حاصل ہوں اور اس کی ترویج و تعلیم کی راہ میں جو دشواریاں حائل ہیں انھیں دُور کیا جاسکے، اسی مقصد کے تحت ۱۹۸۶ء میں حکومت گجرات نے اُردو اکادمی کی بنیاد رکھی ـــــــ گجرات میں گجری ادب کا بڑا سرمایہ ہے جس کی تحقیق و تدوین کی بڑی ضرورت ہے۔ گجری زبان و ادب کے متعلق نئے تحقیقی مواد کی فراہمی، تاریخ گجرات سے متعلق اہم مآخذات کا اُردو میں ترجمہ، نایاب کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور اہم مخطوطات کی نئی تدوین وطباعت شامل ہے۔"

"گجری مثنویاں" اکادمی کے اسی عزم کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر مدنی نے صنف مثنوی کا ایک جامع جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں: "صنف مثنوی ایک جامع صنف سخن ہے۔ یہ صنف داخلی اور خارجی شاعری کا ایک حسین مجموعہ ہے ۔۔۔۔ تاریخی نقطۂ نظر سے مثنویاتی ادب ۔۔۔۔۔ اہم دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔" گجراتی مثنویوں کے لیے وہ کہتے ہیں: "گجرات میں مذہبی مثنویاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے یہ گجری ہے جو دکنی اور دہلوی سے ترکیبوں، لب ولہجہ وغیرہ میں قدرے مختلف ہے۔"

کتاب مقدمے کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۸۸ تک گجری کی مذہبی مثنویوں کا تعارف اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بزمیہ مثنویوں کا تعارف اور جائزہ صفحہ ۹۱ سے صفحہ ۱۱۴ تک پھیلا ہوا ہے جب کہ رزمیہ مثنویوں کی گفتگو صفحہ ۱۱۷ سے ۱۴۶ تک ہے۔ آخری باب میں عالمی شہرت رکھنے والے تین قصّوں؛ یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور خسرو شیریں پر لکھی جانے والی گجری مثنویوں کا جائزہ ہے۔

"گجری مثنویاں" نہ صرف ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی اہم کتاب ہے بلکہ موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی اہم پیش کش ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے کتاب دیدہ زیب اور معیاری ہے۔

ختم المرسلین

مصنّف : عروج زیدی
صفحات : ۱۸۴
قیمت : ۱۷ روپے
ناشر : عرفان زیدی، گھیر سیف الدین خاں، رامپور (یو۔پی)

"ختم المرسلین" نعتوں کا مجموعہ ہے۔ شاعر نے بارگاہِ رسالت میں عقیدت و نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ نعت گوئی میں جہاں تخلیقیت، تخیل کی بلندیوں کو چھوتی ہے وہیں دل کی کرشمہ سازیاں اور رسول مقبولؐ سے تعلق روحانی اپنی تمام نیازمندیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ نعت گوئی، ہر شاعر کے حصّے میں نہیں آتی۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔ اس کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔
عروج زیدی سلسلۂ داغ کے اہم شاعر تھے۔ عروج کی شاعری روایت کی روشنی، تجربے کی تازگی، زبان و بیان کی شستگی، مشاہدے کی تپش اور تخلیقی عوامل کی پرکاری کی عکاس ہے۔ وہ چاہے ان کی غزلیہ شاعری ہو یا نعتیہ لیکن ان کی شاعری تغزّل کی جمالیاتی فضا تخلیق کرتی ہے۔ مشکل گوئی عروج کو پسند نہیں، وہ تو بڑے سادہ اور سلیس انداز میں اظہار عقیدت کرتے ہیں:

دینے والے نے تجھے ساحلِ مقصود دیا
میرا کشتی پہ بھروسا تھا نہ پتواروں پر

وہ تو یہاں تک کہتے ہیں:

بشر کیا لکھ سکے گا نعت پُرعظمت محمدؐ کی
خدا قرآں میں کرتا ہے خود مدحت محمدؐ کی

انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اس لیے اس کی عظمت پر شک کیا ہی نہیں جاسکتا۔ عروج صاحب کہتے ہیں:

بشر وہاں سے بھی بیگانہ وار گزرا ہے
جہاں فرشتے کھڑے تھے پرا جمائے ہوئے

دراصل انسان کی عظمت اس کی نیازمندی میں ہی پوشیدہ ہے۔ شاعری میں حمد و نعت گوئی دو گوشے ہیں جہاں انسان اپنی کمزوریوں اور کمیوں کا اعتراف اور خالق کائنات اور اس کے پیارے نبیؐ سے اپنا واسطہ بنا کر انسان کی عظمت کی بنیادوں کو مستحکم کرتا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عروج زیدی کی نعتیں روحانی تسکین کا وسیلہ

بنتی ہیں چوں کہ وہ عشقِ رسولؐ کے جذبے کو اُبھارتی ہیں اور اس طرح وجدانی کیف داخلی اور خارجی محسوسات کو سکون پہنچاتا ہے۔ محمدؐ سے وفا زندگی کی تہوں کو معنویت دیتی ہے اسی لیے نعت گوئی میں اظہارِ وفا کے جذبے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر منشا آلرحمٰن کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "نعت گوئی درحقیقت نازک ترین فن ہے۔ یہ خاص قسم کے ادب و احترام کا متقاضی ہے۔ اس میں الفاظ و تراکیب کے علاوہ لب ولہجہ بھی اس قسم کا ہونا چاہیے جو عین شایانِ شانِ محبوبِ ربّانی ہو۔ یہاں صرف روایتی عاشقانہ الفاظ استعمال کرنے یا قادر الکلامی کا ثبوت دینے اور مشاقیِ سخن کے کرتب دکھانے سے کام نہیں بنتا' اس کے لیے تو خلوصِ قلب کے ساتھ والہانہ جسِ عقیدتؐ اور جذبۂ حبِ نبیؐ شرطِ اوّلین ہے۔"
بلاشبہ نعت گوئی کارِ شیشہ گری ہے لیکن "ختم المرسلین" اس بات کا مظہر ہے کہ عروج زیدی نے بڑے توازن اور اعتدال سے کام لیتے ہوئے نعت گوئی کی ہے۔ عروج زیدی نہ غزل گوئی میں لکیر کے فقیر بنے اور نہ نعت گوئی میں۔ ہر دو میدانوں میں انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے چوں کہ ان کے پاس فکر بھی تھی' الفاظ بھی اور انھیں اظہار پر بھی قدرت حاصل تھی۔ "ختم المرسلین" اظہارِ عقیدت بھی ہے اور اظہارِ محبت بھی۔ علامہ انور صابری نے گنبدِ خضرا کے حوالے سے کہا تھا:

یہ بارگہِ نازِ رسولؐ عربی ہے
پلکوں کا جھپکنا بھی یہاں بے ادبی ہے

اور یہی جذبۂ رسولؐ مقبول کے لیے عروج زیدی کی نعتوں میں جھلکتا ہے۔ عقیدت اور محبتِ رسولؐ کے مختلف اظہار ملاحظہ فرمائیے:

آپ ہیں عفو و شفاعت کے مثالی پیکر
ہر اندھیرے کو اجالوں سے مٹانے والے

تمنا خون بن کر دوڑتی پھرتی ہے رگ رگ میں
مری ہستی کی گویا روح ہے الفت محمدؐ کی

اب اس محبت و عقیدت کی جرأت کی امید ملاحظہ فرمائیے:

سرِ محشر جو میں پہنچا تو اک غیبی صدا ابھری
یہ مداحِ نبیؐ ہے اے فرشتو! راستہ دینا

۱۸۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ۱۷ روپے ۹ شاید اس لیے کہ عاشقانِ رسول اسے بہ آسانی حاصل کرسکیں۔ کتابت' طباعت صاف ستھری اور سرورق جاذب نظر ہے۔

——— ایس۔ اے۔ رحمٰن

اے۔۵' گرین پارک' نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

گناہِ سخن

مصنف : کانتی موہن سوز
صفحات : ۱۱۶
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ۲۲۲' وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس' نئی دہلی

آزادی کے بعد اردو غزل نے کئی کروٹیں لی ہیں۔ آج کی اردو غزل کا غالب رجحان سیاست اور سیاست سے پیدا شدہ صورتِ حال کی عکاسی ہے۔ حالاں کہ ترقی پسندی نے حسرت' جوش' مجاز اور مخدوم وغیرہ کی غزل کو واضح طور پر سیاسی رنگ و آہنگ عطا کیا تھا لیکن موٹے طور پر اُس کی غزل رجائیت سے مملو تھی جب کہ آج کی غزل کا رنگ کافی حد تک قنوطی اور یاس انگیز ہے۔ خوابوں کی شکست و ریخت' ریاست کا جبر' تنگ نظر معاشرے کی پیدا کردہ گھٹن اور اجتماعی تشدد کے بالمقابل حساس فرد کی بے چارگی اس غزل میں واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے' ظاہر ہے کہ یہ سب منفی اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جدید معاشی نظام کی دین ہیں جو یکے بعد دیگرے تیسری دنیا کے خطوں میں اپنے دائرہ اختیار کو فروغ دے رہا ہے۔

کانتی موہن سوز کی غزل ہماری دنیا کے نادار و مظلوم عوام کے ساتھ کی جانے والی سازشوں اور معاشی استحصال کے خلاف احتجاج کی صدا ہے۔ وہ بائیں بازو کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے فیض کی شاعری کی بازگشت ان کے کلام میں کئی مقامات پر محسوس کی جاسکتی ہے:

سوز سے یارو سُرخ لبی کا سُرخی مے کا ذکر کرو
نورِ سحر نایاب ہے جب تک نورِ سحر کی بات چلے

یوں دست و گریباں ہیں اندھیروں سے اُجالے
جوں دار کی آغوش میں یہ مست جیالے

کیوں پریشاں ہے مری جان ذرا صبر تو کر
یوں ہی بدلے گی زمانے کی فضا ہولے سے

تاہم کانتی موہن کی غزل اپنی بلند آہنگی اور جذبات کے خطیبانہ اظہار کی بنا پر سا

سرور جعفری کے راست بیانیہ لہجے سے زیادہ قریب ہے۔ شاید اس کی وجہ غزل کی طویل روایت کے انجذاب کی کمی یا تجربات کا اکہرا پن رہا ہو۔ سوز کی غزل اپنی اسی راست گوئی کی بنا پر زیادہ عوامی ہوگئی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف اور برملا انداز میں کہتے ہیں اور قاری ان کو پوری طرح سمجھ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ایک طرف جہاں صد فی صد ترسیل کی شرط پر پورے اُترتے ہیں وہیں اپنے تغزل اور شعری حسن کے لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہیں:

واے قیامت سر ہیں سلامت کھنچ پڑے ہیں دار و رسن
ہم کو باغی کون کہے گا، رہبر کون بنائے گا

اس رات کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں ہے
کچھ دور سہی شمس کا گھر ہے کہ نہیں ہے

پہلی سی نزاکت ہے، نمک ہے نہ ادا ہے
کوچے میں کوئی آئینہ گر ہے کہ نہیں ہے

وہ جو سارا مال و منال تھا وہ جو سارا لطف و جمال تھا
سبھی ریزہ ریزہ چلا گیا نہ گیا غیور کا بانکپن

اگرچہ محولہ بالا اشعار میں کلاسیکی انداز و علامات کا دخل کافی ہے لیکن سوز کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن میں ایک نظم مسلسل نظر آتا ہے اور جو ایک طرح سے موضوعاتی ہیں۔ مثلاً: "بھوپال گیس المیہ سے متاثر ہوکر"۔ "ذیل کے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں"۔ "الیکشن کے دوران ایک جھوٹے آدمی سے ملاقات کے بعد"۔ "میرٹھ کے فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہوکر" وغیرہ غزلوں میں ان کا سیکولر رویّہ اور انسان دوستی واضح نظر آتی ہے، سوز اردو رسم الخط پر مکمل مہارت نہیں رکھتے ہیں لیکن لفظیات پر ان کی گرفت، قابلِ تعریف ہے۔ "گناہِ سخن" کی شاعری اتنی اہم اور عظیم نہیں ہے جتنی کہ خوبصورت اور لطیف ہے۔

——— خالد اشرف

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

لمحے لمحے (سہ ماہی جریدہ)

خصوصی اشاعت، جناب ساحر ہوشیارپوری کی نذر

مُدیران : حسیب سوز اور خان فہیم
مرتبہ : ذکی تال گانوی
صفحات : ۴۴۷ (ہندی اور انگریزی تحریروں کے علاوہ)
قیمت : ۸۰ روپے
اشاعت : بدایوں (یو۔پی)
تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ء گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شعر و ادب سے وابستہ مردم خیز سرزمین بدایوں سے شائع ہونے والا یہ جریدہ خصوصی اشاعتیں پیش کرنے کا امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت اس سلسلے کی چھٹی اشاعت ہے۔

ساحر ہوشیارپوری جیسے کہنہ مشق اور مستند شاعر پر ان کے فن اور شخصیت کے تعلق سے اربابِ قلم کی تحریریں اس رنگ و آہنگ سے پیش کی گئی ہیں جیسے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

یہ تحریریں نہ صرف نقد و نظر کے معیار پر پوری اُترتی ہیں بلکہ ادبی صحافت کا دل پذیر نمونہ بھی ہیں۔ یہ فریضہ بڑے خلوص کے ساتھ لکھنے والوں نے اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی حسبِ توفیق و صلاحیت ادا کیا ہے۔

اس شمارے میں مختلف مضامین اور تحریروں کے ذریعے ساحر صاحب کے شخصی اور ادبی سراپا کے ہر پہلو کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ مختصر تحریریں محض ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ کچھ تحریریں ان کے فن اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتی ہیں اور اُردو ادب میں موصوف کے معیار و مقام کی توثیق کرتی ہیں۔ انتخابِ کلام اگرچہ خصوصی عنوان کے تحت نہیں لایا گیا لیکن اس کی کمی وہ تبصرے بڑی حد تک پوری کر دیتے ہیں جو ان کی متعدد تصانیف پر مختلف ادبی مشاہیر نے کیے ہیں اور انھیں شاملِ شمارہ کر لیا گیا ہے ان تبصروں میں موصوف کے بہت سے فن پارے خاصی برجستگی کے ساتھ QUOTE کیے گئے ہیں۔ رسالے کا اہم گوشہ برہمانند جلیس کے اس مضمون پر محیط ہے جو تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ساحر صاحب کے فن اور ادبی قد و قامت کی ایک تجزیاتی دستاویز ہے۔ ان کے شعری فن اور تخلیقی معیار پر پروفیسر عنوان چشتی، آزاد گلاٹی اور بسمل سعیدی کی تحریریں خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ اور خلوص کے ساتھ پڑھنے کا تقاضہ کرتی ہیں کیوں کہ عیارِ طبع خریدار ہی متاعِ سخن کی سچی پارکھ ہوا کرتی ہے۔

غرض یہ کہ، اگر کسی عام قاری کو ساحر ہوشیارپوری کے کلام کا حظ اٹھانا ہو یا کسی تحقیق کے طالب علم کو ان کی سوانح حیات، فن اور شخصیت اور ادبی معیار و مقام کے متعلق ایک دستاویزی منظرنامے کی ضرورت پیش آئے تو "لمحے لمحے" کا یہ خصوصی شمارہ بڑا معاون ثابت ہوگا۔

——— رام پرکاش راہی

198, AGCR ENCLAVE, DELHI-110092

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اکتوبر ۱۹۹۱ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

نہ مطلب رکھ بہارِ رنگ و بو سے
چمن تخلیق کر اپنے لہو سے (سروش)

مرسلہ: محمد زاہد انصاری،
۱۰۳، خلیل غربی، شاہ جہاں پور
۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

جہاں پسینہ بہا ہے وہیں سے لینا ہے
مشقتوں کا صلہ اس زمیں سے لینا ہے (شہزاد ایوبی)

مرسلہ: محمد احمد بن ابراہیم،
ڈاکخانہ سیدانہ ۳۸۴۱۵۱، ضلع
مہسانہ (شمالی گجرات)

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا (امیر)

مرسلہ: اے۔علی، برہانپور

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا (مجروح سلطانپوری)

مرسلہ: قریش حسین، برہانپور

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل (اقبال)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

قبا بدلتے یہ موسم، یہ روز و شب کا نظام
ہے کس کی آئینہ بندی کمال کس کا ہے (حیات وارثی)

مرسلہ: نظیر سہروردی، مناتھ نگر

لبوں پہ پیاس ہو تو آس کے بادل بھرے رکھیو
سرابوں کے سفر میں اس طرح گلشن ہرے رکھیو (ابراہیم اشک)

مرسلہ: غضنفر دانش، بھلائی نگر

چمن میں رونقِ فصلِ بہاراں دیکھنے والے
چمن کے ہی کسی گوشے سے ہوتی ہے خزاں پیدا (نامعلوم)

مرسلہ: پرویز محسن، شاہ گنج

پچھلے ماہ کی تصویر

اگلے دن جب ہوں بیدار
محنت کو ہوں پھر تیار (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: شائستہ، حمزہ پور

نہ سردی کی پروا نہ گرمی کا رونا
سویرا ہوا اور چھوڑا بچھونا (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: اعجاز احمد، حمزہ پور

جواں ہوئی تو سمندر کو کچھ نہ سمجھے گی
ابھی تو پیاس کو صحرا میں پلتے رہنا ہے (سرور ساجد)

مرسلہ: مشکور احمد قریشی، پالن پور

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا (اقبال)

مرسلہ: نازنین، حبیب پور

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا (اقبال)

مرسلہ: صبیحہ پروین، حبیب پور

کیا ملے گا تجھے بکھرے ہوئے خوابوں کے سوا
ریت پر چاند کی تصویر بنانے والے (قتیل شفائی)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدرآباد

جالب اپنے حوصلوں کے سامنے
کوئی طوفاں رک نہ پایا دیر تک (محمد مقصود جالب)

مرسلہ: محمد سلیمان، دہلی

یہی غنیمت ہے کہ بچے خالی ہاتھ نہیں
اپنے پرکھوں سے دکھ کی میراث تو لیتے ہیں (پروین شاکر)

مرسلہ: محمد ابن بھیلونی، بھیلون

بادل جو اُمنڈ آئے صحرا پہ نہیں برسے
وہ جا کے سمندر کو نہلا کے چلے آئے (مجید سیتاپوری)

مرسلہ: عدنان قاسم، شاہ گنج

اب معتدل ہوا سے ہیں سہمے ہوئے درخت
یا آندھیوں کے سامنے جھکتے نہ تھے درخت (ذکی برنی)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

یوں زمانے میں بھٹکتے نہ ارادوں کو لیے
اپنے بازو پہ بھروسہ جو مکمل ہوتا (نامعلوم)

مرسلہ: انجم القادری، سمستی پور،
کہکشاں انجم، جس پور

نثری عنوانات

"صبحِ آوارگی" (ساغر کرناٹکی کی نظم)
مرسلہ: سعید احمد قائد،
۱۵۶/۴، نظام الملک اسٹریٹ،
اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

"ساحل، سیپ، سمندر" (سیدہ شانِ معراج کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: معید مرزا، حیدرآباد

"ریت ریت لفظ" (حمید سہروردی کے افسانوں کا مجموعہ)
مرسلہ: مدثر مرزا، حیدرآباد

اُردو خبر نامہ

پاکستانی شعرا کو استقبالیہ

۲۵ستمبر ۱۹۹۱ء کو شام چھ بجے دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے پاکستان سے آئے ہوئے تین نامور شعرا جنابِ قتیل شفائی، جنابِ شہزاد احمد اور جنابِ مظفر وارثی کو استقبالیہ دیا گیا۔ استقبالیہ تقریب غالب اکادمی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی اور اس کی صدارت پروفیسر جوگندر پال نے کی۔ اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ بدقسمتی سے ہندستان اور پاکستان کے سیاسی تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ شعبے ایسے ہیں جن میں ہم ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں۔ اُردو شعر و ادب سے دلچسپی دونوں ملکوں کی مشترک قدر ہے اور آج کا یہ جلسہ اسی باہمی رشتے کو اور زیادہ مضبوط بنانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ جلسے میں مہمانوں کو اکادمی کی مطبوعات بھی ہدیتہً پیش کی گئیں۔

داہنے سے، جنابِ مظفر وارثی، جنابِ شہزاد احمد، جنابِ قتیل شفائی، جنابِ جوگندر پال اور پروفیسر اشتیاق عابدی

مہمان شعرا کلام سناتے ہوئے
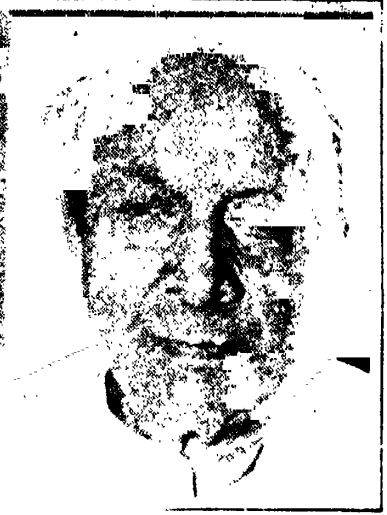
(تصاویر: سید فدا علی)

بہار اُردو اکادمی کے نئے نائبین صدر

پروفیسر صدیق مجیبی اور ڈاکٹر شاہد احمد شعیب نے بہار اردو اکادمی کے نائبین صدر کے عہدے کی ذمّے داریاں سنبھال لی ہیں۔ اکادمی کے دستور کے مطابق اکادمی کے صدر وزیرِ اعلیٰ بہار بہ جہت عہدہ (EX-OFFICIO) ہوا کرتے ہیں۔

مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے نئے سیکریٹری

حکومتِ مدھیہ پردیش نے جناب عبدالقوی دسنوی کو مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کا نیا سیکریٹری مقرّر کیا ہے۔ اب تک اس عہدے پر مشہور شاعر جناب فضل تابش کام کر رہے تھے۔

دسنوی صاحب کی علمی اور تحقیقی دلچسپیوں سے اُردو دُنیا بخوبی واقف ہے۔ وہ سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اُردو کے صدر رہے ہیں اور اُردو کے تعلیمی مسائل سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں نیز ہندستان بھر کے ادبی حلقوں سے ان کا نزدیکی رابطہ رہا ہے۔ امید ہے کہ ان کا تقرّر اکادمی کے کاموں کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔

پروفیسر آزاد برطانیہ کے دورے سے وطن واپس

پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو اکادمی آف آرٹ اینڈ لٹریچر اور انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر لندن کی دعوت پر برطانیہ تشریف لے گئے تھے، برطانیہ اور جرمنی کے دورے کے بعد ہندستان واپس آگئے ہیں ـــ لندن میں اُردو سینٹر کی دعوت پر آزاد صاحب نے ایک سمینار بعنوان "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور شاعری" کی صدارت کی اور دوسرے ہفتے اسی اُردو سینٹر نے ان کے اعزاز میں "جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام" کے عنوان سے ایک ادبی پروگرام کا اہتمام کیا۔ برمنگھم یونیورسٹی میں آزاد صاحب نے علامہ اقبال کے فکر و فن پر تقریر کی اور اُسی شام کو اقبال اکادمی برمنگھم اور انجمن ترقّیِ اردو برمنگھم کے زیرِ اہتمام منعقدہ انٹرنیشنل مشاعرے کی صدارت کی۔ چند روز بعد برمنگھم سے انجمن فانوسِ اُردو، برمنگھم کی دعوت پر آزاد صاحب دوبارہ برمنگھم تشریف لے گئے اور انھوں نے وہاں انجمن فانوسِ اُردو کے زیرِ اہتمام ایک انٹرنیشنل مشاعرے کی صدارت کی۔

بریڈ فورڈ میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے انٹرنیشنل اُردو کانفرنس میں شرکت کی اور "برِصغیر ہندو پاکستان سے باہر فروغِ اُردو" کے مسائل پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ بریڈ فورڈ میں انھوں نے دو انٹرنیشنل مشاعروں کے علاوہ ہڈرز فیلڈ کے انٹرنیشنل مشاعرے میں بھی شرکت کی۔

(نامہ نگار)

نوجوان شاعر کی قدر افزائی

نوجوان شاعر منظر بھوپالی کو مرکزی سرکار کی جانب سے دو سال کے لیے دو ہزار دو سو روپے ماہانہ کا اعزازی وظیفہ جاری کیا گیا ہے۔ اس کا اعلان مرکزی وزیرِ فروغِ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ صاحب نے سیفیہ کالج بھوپال کے تقسیم انعامات کے جلسے میں اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ منظر بھوپالی نے چھوٹی سی عمر میں بھوپال، مدھیہ پردیش اور ہندستان کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا ہے۔ اِس لیے ہم بھارت سرکار کی جانب سے انھیں دو سال تک دو ہزار دو سو روپے ماہانہ بطور اعزازی رقم دینے کا اعلان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ مرکزی ہند سرکار کی جانب سے یہ اعزاز کسی اردو شاعر کو پہلی بار دیا گیا ہے۔

(شجاع فرخی، بھوپال)

پتے کی تبدیلی

میں یونیورسٹی کی رہائش گاہ سے ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو رہا ہوں، آئندہ مراسلت کا پتا یہ ہوگا:

C-1339, INDIRA NAGAR
LUCKNOW-16

—— ملک زادہ منظور احمد

وفیات

راجستھان کے مشہور شاعر، ادیب، صحافی اور عالم سید عبدالقادر خنداں کا ۸ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ٹونک میں انتقال ہو گیا۔ مولانا خنداں کا تعلق اجمیر شریف سے تھا لیکن انھوں نے ٹونک کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ کانگریسی تھے۔ ٹونک سے انھوں نے کئی اخبار نکالے جن سے وہ اپنے سیاسی عقائد کی تبلیغ کا کام بھی لیتے تھے اور عوامی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کا بھی۔ وہ ایک خوش فکر اور خوشگو شاعر تھے اور ریاست ٹونک کے آخری فرماں روا نواب محمد اسماعیل علی خاں تاج نے انھیں اپنا مشیرِ سخن مقرر کر کے تاج الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد خنداں صاحب نے بڑی پریشاں حالی کے دن گزارے لیکن جب ٹونک میں عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا تو انسٹی ٹیوٹ کے علم دوست ڈائرکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور ان کی معاشی پریشانیاں بڑی حد تک دور کر دیں۔

چند سال پہلے راجستھان اردو اکادمی نے ان کا اعزاز و اکرام کیا تھا اور اب اکادمی ان کا مجموعۂ کلام بھی شائع کرنے والی تھی۔ خنداں صاحب کو اس مجموعے کی اشاعت کا بڑا اشتیاق تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ کام نہیں ہو سکا۔ امید ہے اکادمی اب اس طرف خصوصی توجہ دے گی اور جلد ہی یہ مجموعہ منظرِ عام پر آجائے گا۔

●

کانپور سے جناب تسکین زیدی نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر عبدالحلیم صدیقی اچانک رحلت کر گئے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ممتاز ماہرِ تعلیم اور نظریہ ساز ترقی پسند ادیب ڈاکٹر عبدالعلیم کے اکلوتے صاحبزادے تھے وہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سماجیات میں لیکچرر تھے پھر ۱۹۸۱ء میں حلیم کالج، کانپور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور تادمِ وفات اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ مرحوم کو اردو زبان و ادب کے فروغ سے بیحد دلچسپی تھی۔ انھوں نے یو۔پی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مہم میں سرگرمی سے حصّہ لیا تھا وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی قیام گاہ پر اکثر شہر کے ادبا و شعرا کا اجتماع رہتا تھا

خریداروں اور ایجنسیوں سے درخواست

ہے کہ دفتر کو خط لکھتے ہوئے خریدار حضرات اپنا خریداری نمبر اور ایجنٹ حضرات اپنا ایجنسی نمبر ضرور لکھیں تاکہ ان کے خط پر فوری کارروائی کی جا سکے۔

—— منیجر ایوانِ اردو، دہلی

آپ کی رائے

○ عابدی صاحب حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہونے پر ہماری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام حجاج کرام کے حج اکبر کو قبول فرمائے آمین! سفر حج کی مختصر روداد ہماری معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث بنی، اب تک تو مرکزی حج کمیٹی اور جدہ میں ہندستانی سفارت خانہ کے ذمے داروں پر تبرا ہی پڑھنے کو ملتا تھا، البتہ سعودی حکومت کے غیر معمولی انتظامات کی تعریف سب ہی کرتے نظر آئے، مگر موصوف کے قلم سے پہلی مرتبہ مذکورہ دونوں اداروں کے بارے میں کلمات تحسین پڑھنے کو ملے، معاف کیجیے گا عابدی صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ وی آئی پی گروپ میں تھے اس لیے ..... اللہ کرے وہ لوگ سچ مچ ویسے ہی ہو گئے ہوں جیسا آپ نے لکھا ہے۔ آمین!

—— شفقت کاظمی، پٹنہ

○ اگست ۹۱ء کے "ایوانِ اردو" میں اسرار گاندھی اور احمد عثمانی کے افسانے نہ صرف اسلوب اور پیش کش بلکہ موضوع کی ہم آہنگی کے باعث بیحد پسند آئے۔ اس کے علاوہ نظموں، دوہوں اور ہائیکو پر مشتمل شعری تخلیقات حظ آور اور نشاط پرور ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ستمبر کے شمارے میں "سیل سفر درمیان ہے" کے علاوہ "مقدس فرشتے" اور "بدلتے موسم کا غم" نامی افسانے جاندار ہیں۔

آپ کے ناروے اور ڈنمارک کے سفر کا مفصل تذکرہ پڑھنے کا آرزومند ہوں، ذاتی طور پر مجھے غیر ملکی سفر ناموں سے بیحد دلچسپی ہے۔

—— محمد ابراہیم صدیقی، الہ آباد

○ اگست کے ایوانِ اردو میں جناب احمد عثمانی کا افسانہ "ملیچھ" پڑھتے وقت لگا کہ میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں لیکن کھلی آنکھوں سے بھیانک خواب دیکھنا شاید اب بھی ہمارے یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے! افسانے کی مرکزی کردار "مانگی" دیو گاؤں کے باشندوں کی روزی روٹی کے لیے منسارام (گارڈ) کی ہوس کا شکار ہوتی ہے لیکن "مانگی" منسارام کی ہوس کا شکار بننے کے لیے خود تیار نہیں اور نہ ہی وہ اس گندے کام سے خوش ہے مگر اپنے ہونے والے شوہر اور گاؤں والوں کے بے معنی لفظوں کے آگے اسے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنا جسم بیچتی ہے اور اس کے عوض گاؤں والوں کو جنگل میں جانے کی اجازت ملتی ہے۔ مگر کہانی کا ایک کمزور پہلو یہی ہے کہ گاؤں کا کوئی بھی فرد منسارام اور خود اپنے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا۔

—— ڈی۔ ڈی۔ جمید، دربھنگہ

○ "ایوانِ اردو" (ستمبر ۹۱ء) میں ڈاکٹر حکم چند نیر کا مقالہ "منشی پریم چند سے منسوب بعض تحریروں کے بارے میں" غور سے پڑھا۔ موصوف نے پریم چند کی بعض تحریروں پر "د۔ر" (پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا اور ابتدا میں وہ دھنپت رائے اور پھر نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے) کے تحت شائع شدہ تحریروں کے بارے میں شکوک کا اظہار فرمایا ہے کہ کیا وہ فی الواقع پریم چند ہی کی تھیں یا جناب مالک رام کے خسر معظم جناب دھنپت رائے کی۔ (موصوف گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈیفنس ڈپارٹمنٹ کی ڈیری فارم واقع انبالہ میں سپرینٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے پورے نام کے بجائے 'د۔ر' کے تحت مضامین لکھتے تھے —— تصریح از ڈاکٹر نیر)۔

اس سلسلے میں میں مختصر ترین الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں:

اواخر ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ "سوزِ وطن" کے قضیے کے بعد پریم چند نے "د۔ر" اور "ن۔ر" (دھنپت رائے/نواب رائے) کے مخفف ناموں کے تحت اپنے مضامین اور افسانے شائع کرانے شروع کر دیے تھے۔ منشی دیا نرائن نگم صاحب نے ان کا نیا نام "پریم چند" تجویز کیا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۰ء سے "زمانہ" میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر افسانے اور مضامین اسی نئے نام سے شائع ہوتے۔ "ادیب" اور دیگر رسائل میں وہ کافی عرصے تک 'د۔ر' یا 'ن۔ر' کے ناموں کے تحت لکھتے رہے تھے۔

ڈاکٹر نیر نے "اردو زبان اور ناول" (ڈاکٹر نیر نے اس کا عنوان "اردو ادب اور ناول" دیا ہے) پر بھی اپنے شبہے کا اظہار کیا ہے کہ کیا یہ فی الواقع پریم چند کا تھا؟

خدا بخش لائبریری جرنل (شمارہ نمبر ۷ اور ۸) میں ادیب الہ آباد کا انتخاب شائع ہوا ہے جس میں 'د۔ر' کے نام سے پریم چند کے درج ذیل مضامین کی تفصیل موجود ہے۔

(۱) "اردو زبان اور ناول" اگست ۱۹۱۰ء۔
پریم چند، گل پہاڑ سے ۱۳ مئی ۱۹۱۰ء کو

نگم صاحب کے نام اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔
"نظر نے ناول والا مضمون واپس مانگا تھا۔ اور فرماتے تھے کہ میں نے محض ترمیم کے لیے بھیجا تھا۔ اگر آپ اسے آسانی سے علیحدہ کر سکیں یعنی ردّی کے ٹوکرے میں پڑا ہو تو بھیج دیجیے۔ انھیں کے سر ٹیک دوں گا" (پریم چند کے خطوط، مرتبہ مدن گوپال، ص ۳۸)۔

(۲) "خوفِ رسوائی" (کہانی)، اگست ۱۹۱۱ء (افسانوی مجموعہ "خاکِ پروانہ" مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں یہ افسانہ شامل ہے)۔

(۳) "بیغرض محسن" (کہانی)، ستمبر ۱۹۱۰ء (پریم پچیسی، حصہ اوّل، مطبوعہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں شامل ہے)۔

(۴) "بڑی بہن" (کہانی)، جولائی ۱۹۱۱ء ("آخری تحفہ" مطبوعہ ۱۹۳۴ء میں شامل ہے)۔

"ہندستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ" زمانہ جنوری ۱۹۱۵ء (نیّر صاحب نے جنوری ۱۹۱۴ء لکھا ہے) کے آخر میں بطور مصنف "دھنپت رائے" کا نام درج ہے۔ میں نے اسے اپنی کتاب "پریم چند: کچھ نئے مباحث" (مطبوعہ اکتوبر ۱۹۸۸ء) میں پریم چند کی تصنیف سمجھ کر شامل کر لیا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ پریم چند کا طرزِ تحریر نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس وقت انھیں بطور مصنف اپنا نام دھنپت رائے دینے کی ضرورت تھی۔ ممکن ہے یہ مضمون مالک رام صاحب کے خسرِ معظم جناب دھنپت رائے کا تحریر کردہ ہو۔ اور یہاں انھوں نے "د۔ ر" کی بجائے دھنپت رائے اس لیے لکھ دیا ہو گا کہ یہ مضمون برطانوی سرکار کی تعریف و توصیف میں لکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر نیّر کے پیش کردہ "د۔ ر" کے تحت شائع شدہ دیگر مضامین کے اولین مآخذ تک میری رسائی نہیں ہو سکی اس لیے میں ان کے متعلق کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔

—— مانک ٹالا، بمبئی

○ "ایوانِ اُردو" ستمبر ۱۹۹۱ء کے شمارے کے "حرفِ آغاز" میں آپ کا یہ جملہ "مرکز میں ترقی اُردو بیورو اور مختلف صوبوں میں اُردو اکادمیوں کا قیام ایک طرح سے اس حقیقت کا اعتراف و اعلان تھا کہ سیاسی طور پر بھی اُردو کی بقا اور اس کے تحفظ کی ضرورت اور اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے، بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا اس سمت میں ایک اور مثبت قدم ہے۔"

میری ناچیز رائے ہے کہ آپ نے حقیقت کی پردہ پوشی کی ہے۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ اُردو اکادمیوں کے قیام سے اُردو کی بقا اور اس کے تحفظ کا معاملہ سامنے نہیں آتا ہے بلکہ اُردو مطالبے کا جو جوش و خروش ہندستان بھر میں یہاں وہاں اُٹھتا رہتا تھا اس پر آبِ سرد ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہی ہوا انعامات اور اعزازات نے اردو والوں کو کافی حد تک نرم کر دیا اور اب اردو مطالبے کے سلسلے میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا اور یہی مقصد تھا اُردو اکادمیوں کے قیام کا۔

اُردو اکادمیوں کا کام اُردو زبان کا فروغ ہے مگر ہر اکادمی کے آس پاس ادیبوں نے ڈیرے ڈال دیے ہیں گویا اکادمی کا خزانہ ان ادیبوں کی پریشان حالی کو دُور کرنا ہے۔ اُردو فروغ کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اُردو پڑھنے پڑھانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ کس کو کتنی رقم دی جائے۔ اُردو اکادمیاں گداگری کا دفتر بن گئی ہیں۔ بے حد افسوس ناک حالت ہے۔ معاف فرمائیں گے۔

—— سیّد علی رضا، بمبئی

○ "ایوانِ اُردو" بابت ستمبر ۹۱ء نظر نواز ہوا۔ "حرفِ آغاز" فکر انگیز ہے آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ "پچھلے دس پندرہ سال میں فضا اُردو کے حق میں ساز گار ہوتی ہے اور ایسی کئی غلط فہمیاں جو آزاد ہندستان میں اس کے خلاف تعصب پیدا کرنے کا سبب بنی تھیں دُور ہو گئی ہیں۔"

میرے خیال میں یہی وقت ہے جب اُردو داں حضرات اس کی بقا کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم دینا آج سب سے زیادہ اہم ہے۔ جب تک اُردو پڑھنے والے پیدا ہوتے رہیں گے اُردو زندہ و پائندہ رہے گی۔

—— اقبال حسن آزاد، مونگیر

○ ستمبر کے "حرفِ آغاز" میں آپ نے اُردو کے تعلق سے ہندستان اور یورپی ملکوں کے درمیان جس پیرائے میں موازنہ کیا ہے اس سے ہر شخص کو اتفاق کرنا چاہیے۔ موجودہ صورتِ حال میں یقیناً ہمیں ساری توقعات حکومت ہی سے وابستہ نہیں رکھنی چاہیے۔ بلکہ خود اپنے طور پر تعمیری منصوبہ بنا کر اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے تبھی ہم اُردو دوست ثابت ہو سکتے ہیں ورنہ ہماری چیخ پکار "صدا الصحرا" ثابت ہو گی۔

—— محمد طارق صدری، سمستی پور

○ "ایوانِ اُردو" کے ستمبر کے شمارے میں شکیل الرحمٰن کا مضمون اور نصر ملک کا افسانہ پسند آیا۔ غزلیں، نظمیں بھی اچھی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے لیا گیا مناظر عاشق ہرگانوی کا انٹرویو اس اعتبار سے ادب پارہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی ادبیت نے اسے غور و فکر کی چیز

بنایا ہے۔ چیکوسلواکیہ کے ادبی و ثقافتی حالات پر ایسی دلچسپ اور فکر انگیز گفتگو اس سے پہلے اُردو میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہر سوال کے جواب میں انھوں نے نئی معلومات فراہم کی ہیں، اور ساتھ ہی ساختیات اور پس ساختیات کے بارے میں بھی آسان زبان میں خیال افروز وضاحت کی ہے۔

——— محمد حامد علی خاں، مظفر پور

○ ماہ ستمبر ۱۹۹۱ء کا "ایوانِ اُردو" پیشِ نظر ہے۔ نظموں میں اندر سروپ دت نادان کی نظم بے مثل ہے۔ نفیس غازی پوری اور انور باری کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ گیارہ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفر نامہ بڑا معلومات افزا اور دل پذیر ہے۔ ساختیات کے بیان کے علاوہ کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ "حرفِ آغاز" میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے نارنگ صاحب کی آنکھوں دیکھی سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ اب ہند میں اُردو کے کاز کے لیے ہم اُردو والوں ہی کو کچھ کرنا ہوگا۔ حکمرانوں سے بہت زیادہ خوش گمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی بدگمان ہونے کی۔ اب صرف عمل کی ضرورت ہے۔

——— محمد رفیع انصاری، بھیونڈی

○ "ایوانِ اُردو" ستمبر ۱۹۹۱ء دیکھا۔ "خبروں کے سرچشمے" مضمون بہت پسند آیا۔ آپ نے چوں کہ مارچ ۱۹۹۱ء کا حوالہ بھی دیا تھا۔ اور یہ موضوع میری دلچسپی کا ہے، لہٰذا کوشش و تلاش سے اس شمارے کو بھی حاصل کیا۔ بہتر ہوگا کہ ہر ماہ اس موضوع پر کچھ لکھا کریں، تاکہ اُردو خبر نگاری کے پیشے میں داخل ہونے کے مجھ جیسے سینکڑوں خواہشمند جوانوں کی رہنمائی ہو سکے۔

——— سید احمد علی رضوی، دہلی

○ شکیل الرحمٰن صاحب کا مضمون "مصوری کا دبستانِ تیموریہ ——— ابتدائی نقوش" اور حکم چند نیر صاحب کا مضمون "منشی پریم چند سے منسوب بعض تحریروں کے بارے میں" خصوصی دلچسپی سے پڑھے۔ حکم چند نیر کا مضمون تحقیق کے نئے دروازے وا کرتا ہے۔ شکیل الرحمٰن اگر مصوری کے چند نادر نمونے بھی پیش کرتے تو اس مضمون کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ——— مناظر عاشق ہرگانوی کا "سیلِ سفر دریبان ہے" کافی طویل ہے۔ اس کو دو قسطوں میں شائع کیا جاتا تو بہتر تھا۔

——— م۔ ق۔ سلیم، حیدر آباد

○ کنیڈا، ناروے اور برطانیہ وغیرہ جیسے یورپین ممالک میں اُردو زبان کو وہاں کی ایک مروج و معروف زبان بنانے اور وہاں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں پاکستانی تارکینِ وطن کی دلچسپی اور ہندستانی تارکینِ وطن کی اُردو کے تئیں عدم دلچسپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ان تارکینِ وطن کے معاشرتی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی پس منظر کے بنیادی اور اہم فرق کو کیسے فراموش کر گئے۔ ان یورپین ممالک میں پاکستانی تارکینِ وطن کی اکثریت ان افراد پر مشتمل ہے جن کے اجداد یو۔پی، بہار، دِلّی، راجستھان اور مدھیہ پردیش جیسے اُردو کے علاقوں سے نقلِ مکانی کر کے پاکستان جا بسے تھے اور جو لوگ اُردو کو اپنے اجداد کی وراثت ہی نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی تفسیر اور شرح کی زبان بھی سمجھتے ہیں، اسی پس منظر میں پاکستانی تارکینِ وطن کی اُردو سے دلچسپی قدرتی ہے، اس کے برعکس ان ممالک میں ہندستانی تارکینِ وطن کی غالب اکثریت کا تعلق اُردو تہذیب یا اُردو رسم الخط سے کبھی نہیں رہا۔ ان ہندستانی تارکینِ وطن کا اُردو سے بس واجبی سا تعلق ہے جو "جام پلا دے ساقی" یا "رخِ روشن دکھا دے، نقابِ رخ اُٹھا دے" جیسی شاعری کا مرہونِ منّت ہے۔

یہ بات بہت تلخ ہے، ممکن ہے بہت دوستوں کو ناگوارِ خاطر گزرے لیکن سچائیاں رقم کرتے ہی رہنا چاہیے۔ اس لیے مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اُردو کبھی بھی ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کی مشترک زبان نہیں رہی ہے۔ کوئی کچھ کہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو کو اس کے زرّیں عہد میں یعنی تقسیمِ وطن سے قبل ہندستانی سماج کے ایک مخصوص طبقے نے اپنے اجداد کی میراث سمجھ کر اور قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان کے طور پر گلے لگایا اور اسی سماج کے دوسرے طبقوں کے افراد نے کاروباری، معاشی اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں کے دباؤ کے تحت اردو کو اپنایا لیکن ایک فاصلہ قائم رکھا ——— تقسیمِ وطن کے بعد یہ ضرورتیں اور ترجیحا یکسر بدل گئیں، جس کے نتیجے میں تمام کا تمام منظر نامہ ہی بدل گیا ——— اسی منظر نامے کے بدلنے کی وجہ سے جو صورتِ حال ابھری اس کے نتیجے میں اُردو تہذیب کے پروردہ بدترین قسم کے احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے، نئے حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے سچائیوں سے آنکھیں چرا کر مصلحتوں کے تحت گفتگو کرنے لگے۔ اسی احساسِ کمتری اور مصلحت آمیز رویّے کے نتیجے میں آج بھی اُردو پر ایک مشترک زبان ہونے کا لیبل لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مشترک زبان ہونے کا لیبل یقیناً خوبصورت ہے لیکن عملی زندگی میں یہ زبان کہاں تک مشترک ہے اس ک

طرف دھیان دینے کی کسی میں بھی جرأت نہیں ہے۔ اگر یہ زبان ہندستانی سماج کے تمام طبقوں کی ایک مشترک زبان ہے تو صرف ایک مخصوص طبقے کی آبادی والے علاقوں میں اُردو میڈیم اسکول کھولنے کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے ــــ؟

آئیے اب دوسری طرف، دہلی والوں پر یہ الزام لگانا کہ یہاں رسالے خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے، غلط فہمی اور کم علمی پر مبنی ہے۔ عوامی ذوق پر پورا اُترنے والے درجنوں رسالے اسی دہلی کے گلی کوچوں میں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ عوام الناس کو ادبی اور معیاری رسالوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اس لیے عوامی سطح پر ان کی عدم نکاسی کا شکوہ بے جا ہے۔ دہلی میں اُردو کے نام پر روزی، روٹی کمانے والے ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور لیکچرروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، کسی سرکاری کمیٹی کی ممبری حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے، مشاعروں اور سمیناروں میں کوششیں کرکے اپنے آپ کو مدعو کرانے والے یہ "خود دار" قلمکار حضرات اگر ان ادبی اور معیاری رسائل کی سالانہ خریداری قبول کرلیں تو یقین مانیے ایک دو نہیں پانچ چھ ادبی اور معیاری رسائل اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں لیکن جو لوگ صرف اعزازی طور پر بھیجے گئے رسالے پڑھنے کے عادی ہوں، اُن سے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ اُردو کے نام پر کچھ خرچ بھی کرسکتے ہیں۔

ــــــ عظیم اختر، نئی دہلی

○ اکتوبر ۹۱ء کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ صحافت سے متعلق عزیز الحسن جعفری کا مضمون 'مصاحبہ یا انٹرویو' پسند آیا۔ اُردو زبان میں صحافت کے اُوپر مواد عنقا ہے۔ امید ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔ سلطان سبحانی کا افسانہ "زیریں دُنیا کی نگاہیں" کافی متاثر کرتا ہے۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عام انسان کی داخلی اور ظاہری کیفیت کی کش مکش کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"آپ کی رائے" کے تحت معروف شاعر شجاع خاور کا جو طویل مراسلہ شائع ہوا ہے اُسے پڑھ کر سخت افسوس ہوا اور حیرت بھی۔ موصوف ایک سنجیدہ شاعر ہیں اور اچھی شاعری کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ "اجتہاد" کے نام پر وہ اُردو زبان و ادب میں گمراہی کو راہ دیں۔ موصوف کے مطابق اُن کے "اس اجتہاد کی پشت کروڑوں نیم خواندہ غیر عربی داں مسلمانوں کی روزمرّہ اردو بول چال کا اعتبار ہے جو خود ایک استناد ہے" ــــــ

اب خاور صاحب کو یہ کون بتائے کہ بول چال کی زبان کبھی سند کا درجہ نہیں رکھتی اور اگر اسے سند مان لیا جائے تو پھر انھیں چاہیے کہ وہ اپنا نام شجاع خاور کے بجائے "شجا خاور" لکھیں کیونکہ نیم خواندہ غیر عربی داں مسلمان لفظ "شجاع" کا تلفظ عام طور سے اِسی طرح ادا کرتے ہیں۔

"غلط العام" اور "غلط العوام" کے فرق کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جو الفاظ خاص و عام کی زبان پر غلط جاری ہو جائیں وہ "غلط العام" الفاظ ہوتے ہیں اور اُن کے استعمال پر فصحا و ادبا کو کوئی اعتراض نہیں، لیکن ایسے الفاظ جو نیم خواندہ حضرات کی اختراعات کا باعث ہوں اور پڑھے لکھوں کا اُن پر اتفاق نہ ہو "غلط العوام" کہلاتے ہیں اور ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے ان سے احتراز لازم ہے۔

خاور صاحب لفظ "سیقول" کو "وسیع تر" اور "غیر مکتبی" جیسے خوبصورت الفاظ کا لبادہ اوڑھانے کی لاکھ کوشش کریں، یہ بات مسلّم ہے کہ لفظ "سیقول" (بروزن فعلان) "غلط العوام" کے زمرے میں آتا ہے "غلط العام" کے خانے میں نہیں!

ــــــ ارشد کمال، نئی دہلی

○ "ایوانِ اُردو" بابت اکتوبر ۱۹۹۱ء میں غفران احمد صاحب اور جناب محمد احمد رمز کے مراسلات کے جواب میں جناب شجاع خاور کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ اگرچہ ہر دو مذکورہ بالا حضرات نے اپنے مراسلات میں بعض جگہ ایسی زبان استعمال کی تھی جو مناسب نہیں تھی مثلاً "اگر آپ مومن ہیں" ... یا "اِستغفار کرلیں"... (غفران احمد صاحب) اور "غیر ادبی کام تو کیا ہی"... یا "معاذ اللہ"... (جناب محمد احمد رمز)۔ تاہم میری ناچیز رائے میں ان کا بنیادی اعتراض بالکل درست تھا یعنی قرآن کے نہ صرف معانی و مطالب بلکہ الفاظ اور تلفّظ میں بھی عمداً کسی کو کسی طرح کی تبدیلی کا کوئی حق ہرگز نہیں ہے۔ ہاں، غیر اختیاری تبدیلی کی بات دوسری ہے مثلاً کوئی شخص "ق" کا صحیح تلفّظ ادا نہیں کرسکتا اور اسے "ک" کے طور پر بولتا ہے تو وہ معذور ہے لیکن اس کے تلفّظ کو بنیاد بنا کر اگر کوئی ایسا شخص یہ تلفّظ اختیار کرتا ہے جو صحیح تلفّظ پر قادر ہے تو اسے کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اِسی کا اطلاق "سیقول" کی "ی" کے متحرک یا ساکن بولنے یا لکھنے پر ہوتا ہے۔ بقول خاور صاحب اگر "لاکھوں کروڑوں مسلمان" سیقول کی "ی" کو بغیر جانے ہوئے غیر متحرک بولتے پڑھتے ہیں (اگرچہ یہ دعویٰ بجائے خود محلِ نظر ہے) تو دوسری بات ہے لیکن اگر خاور صاحب نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے شعر

میں ایسا کیا ہے تو وہ یقیناً قرآن میں لفظی تبدیلی کر رہے ہیں جو ہرگز جائز نہیں ہے۔

باقی رہیں یہ باتیں کہ "... وضاحتی نوٹ میں نے عروضیوں کے لیے لگایا تھا، مسلمانوں کے لیے نہیں" یا "کیا خود میرے وضاحتی نوٹ میں قرآنی لفظ "سیقول" کے صحیح اور مکتبی لفظ کا اعتراف موجود نہیں ہے؟" (اور یہ "مکتبی" کیا ہوتا ہے؟ مسئلہ کسی لفظ کے صحیح یا غیر صحیح تلفظ کا ہے، نہ کہ مکتبی اور غیر مکتبی کا) یا "عفران صاحب جیسے عالم اور عربی داں مسلمانوں کو پوری آزادی ہے کہ میرے شعر میں بھی لفظ سیقول کو مکتبی لحاظ سے متفاعل کے وزن پر ہی پڑھیں ... اور اس عمل میں اگر مصرع وزن میں نہ رہے تو لعنت بھیجیں اس مصرعے پر اور اس کے شاعر پر" یا "ہر مومن کا عربی داں ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی ہر عربی داں کا مومن ہونا ضروری ہے" یا در پردہ جناب محمد احمد رمز کے "اچھا شاعر نہ ہونے" پر چوٹ یا یہ کہ "میں تحریر کے مقابلے میں بول چال اور گفتگو کی زبان اور الفاظ شعر میں باندھنے کو ترجیح دیتا ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں محض لفاظی کے زمرے میں آتی ہیں اور مسئلہ زیر بحث سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ قرآن کے کسی لفظ میں کسی بھی شخص کو کسی بھی نام پر عمداً کوئی ادنیٰ تغیر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی نادانی ہے اور اگر ایسا کرنے پر اصرار کرتا ہے تو افسوس ہے کہ اس کے لیے سوائے "گم راہی" کے کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔

خاور صاحب نے اپنے غلط رویے پر پردہ ڈالنے کے لیے جو کچھ لکھا ہے اس سے مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک مکتبی سے غیر مکتبی، عالم سے غیر عالم، عربی داں سے غیر عربی داں بہتر ہیں اور "مسلمان" تو سب سے ہی گئے گزرے ہیں، اگر ان کے ارشاد کردہ مصرعے میں "سیقول" کا وہ تلفظ ادا کرنے سے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں استعمال فرمایا ہے مصرع وزن سے ساقط ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری یقیناً خاور صاحب پر ہے، پڑھنے والے پر نہیں کیوں کہ پڑھنے والا اگر قرآن پر ایمان رکھتا ہے، اس کا ہر حالت میں صحیح تلفظ ادا کرنے پر مجبور ہے، وہ سیَقول کو سیْقول کہہ ہی نہیں سکتا ہے الّا یہ کہ وہ ناواقف ہو اور ناواقفیت قابلِ معافی ہے، ہر مومن کا عربی داں اور ہر عربی داں کا مومن ہونا بلاشبہ ضروری نہیں ہے لیکن ہر مومن کا، ناواقف نہ ہونے کی صورت میں قرآن کے ہر لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرنا ازبس ضروری ہے۔

کوئی شخص اچھا شاعر ہے یا نہیں؟ اوّل تو یہ مسئلہ بڑی حد تک بحث طلب ہے اور اگر نہیں بھی ہے تو بحیثیت مسلمان اسے اس طرح کے معاملات میں رائے دینے کا حق بالکل حاصل ہے۔ خاور صاحب شوق سے "بول چال اور گفتگو کی زبان اور الفاظ شعر میں" باندھیں مگر للہ قرآن مجید کے الفاظ کو اس خود ساختہ دائرۂ اختیار سے باہر ہی رکھیں۔

—— ریاض الرحمٰن شروانی، علی گڑھ

○ "ایوانِ اردو" کے قارئین کو خطوط کے پتے، بینک چیک اور اپنے کاروبار کا حساب و کتاب صرف اردو زبان میں لکھنے پر آمادہ کیجیے یہ چھوٹا سا کام روزمرہ کے نظم و نسق میں ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

(نام نہیں لکھا)، بنگلور

○ "ایوانِ اردو" کے اندرونی صفحے پر چھپنے والی تصویر کے لیے اگلے ماہ کے شمارے میں جب شعری اور نثری عنوانات شائع ہوتے ہیں، رسالے میں عنوانات سے متعلق تصویر کی ناموجودگی کے باعث موصولہ عنوانات کا صفحہ ایسے قارئین کے لیے بے کار ثابت ہوتا ہے جن کی نظر سے پچھلا شمارہ نہ گزرا ہو۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ عنوانات کے ساتھ اسی صفحے پر متعلقہ تصویر بھی شائع کریں۔*

—— م۔ اسلم انصاری (بستی مشکور زیدی)، سیوہارہ

* آپ کے مشورے پر اسی مہینے سے عمل شروع کیا جا رہا ہے (ادارہ)

قلم کار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔
امید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

—— ادارہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ادارۂ تحریر:

پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۵ ● شمارہ: ۹ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● جنوری ۱۹۹۲ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی

اردو اکادمی، دہلی ــ گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق، عمل: ارشد علی خاں

حرفِ آغاز

مشاعرہ ایک ایسی ثقافتی اور ادبی تقریب ہے جو ہمارے ملک کو اُردو کی دین ہے۔ ہندی کوی سمیلنوں اور پنجابی کوی درباروں کا آغاز بھی مشاعروں کے زیرِ اثر ہی ہوا ہے، جس طرح اب ان زبانوں میں اُردو غزل کی مقبولیت سے متاثر ہو کر غزلیں کہی جانے لگی ہیں۔

مشاعروں کا آغاز کب ہوا، وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ قیاس ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ان کی داغ بیل شاہی درباروں میں پڑی ہوگی، پھر امرا بھی اپنے ایوانوں میں یہ محفلیں آراستہ کرنے لگے۔ ابتدا میں چونکہ ان محفلوں میں منتخب شعرا اور منتخب سخن فہم سامعین ہی کو مدعو کیا جاتا تھا اس لیے اُس دَور کے مشاعرے ایک طرح سے ذہن و ذوق کی تربیت گاہ کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ جو شعر پڑھے جاتے ان پر اس ڈھنگ سے داد دی جاتی کہ ان کی خوبی یا خرابی واضح ہو جاتی اور شاعر کو اپنی فنی دسترس یا کوتاہی کا اندازہ ہو جاتا۔ یہ مشاعرے طرحی ہوتے تھے اس لیے شعرا کو طبع آزمائی کے نو بہ نو مواقع بھی فراہم کرتے تھے اور ان میں مسابقت کا جذبہ بھی پیدا کرتے تھے جو انھیں بہتر سے بہتر شعر کہنے پر مائل کرتا تھا۔

ہمارے زمانے تک آتے آتے مشاعروں کے طور طریق بہت کچھ بدل گئے۔ طرحی مشاعروں کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ مشاعروں کے سامعین کی تعداد اب اکثر و بیشتر ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے جن میں سخن فہموں کا اوسط کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود مشاعرے کو لوگ بڑے ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

مشاعروں کی افادیت کے پُرانے پہلو یقیناً دھندلا چکے ہیں لیکن کچھ نئے پہلو سامنے بھی آئے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں لوگ جو اُردو کے حرف شناس تک نہیں ان تک اُردو کے بے شمار لفظ مشاعروں کے وسیلے سے پہنچتے ہیں اور ان کی گفتگو میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ مشاعرے اس گنگا جمنی ثقافت کی توسیع کا کام بھی کرتے ہیں جس کا سب سے خوبصورت اظہار اُردو شعر و ادب میں ہوا ہے۔ مذہبی رواداری اور انسان دوستی کا جذبہ جو اُردو شاعری کا خصوصی موضوع ہے، مشاعرے عوام تک اس کی ترسیل کا بھی ایک موثر ذریعہ ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ آزادی کے بعد بعض حلقوں میں اُردو سے جو بدظنی پیدا ہو گئی تھی اسے دُور کرنے میں بھی مشاعروں کا کافی دخل رہا ہے۔

یہ کہنا کہ مشاعرے کی روایت از کار رفتہ ہو چکی ہے کسی طرح صحیح نہیں لیکن مشاعروں کا موجودہ ماحول اصلاح کا طلبگار ضرور ہے۔ اب مشاعروں میں ایسے شعرا بالخصوص شاعرات کی بھرمار ہونے لگی ہے جن کا شاعری سے دُور و نزدیک کا کوئی واسطہ نہیں۔ شاعروں اور متشاعروں کی ایک ہی اسٹیج پر موجودگی حقیقی شاعروں کے لیے الجھن اور پشیمانی کا سبب بنتی ہے۔ متشاعروں کی زبان سے جو کلام عوام تک پہنچتا ہے، بالعموم غیر معیاری، ناقص اور بعض اوقات انتہائی واہیات ہوتا ہے اور سنجیدہ لوگوں میں اُردو شاعری کی رسوائی کا سبب بنتا ہے۔ غالباً ایسا نہیں ہے کہ مشاعروں کے مہتمم اچھی بُری شاعری یا شاعری اور غیر شاعری کے فرق سے واقف نہیں ہوتے، وہ متشاعروں کو اس لیے مدعو کر لیتے ہیں کہ وہ خوش آواز ہیں یا فوری اپیل رکھنے والے سطحی اشعار ایک اداکاری کے ساتھ سُنا کر عوام کو خوش کر سکتے ہیں۔ اگر مشاعروں کے ادبی وقار کو برقرار رکھنا ہے تو یہ سلسلہ موقوف کرنا ہوگا۔ سامعین مشاعرہ گاہ میں اچھی شاعری سننے کی توقع لے کر آتے ہیں۔ مشاعرے کی فضا اچھی شاعری کے لیے ناسازگار تب بنتی ہے، جب مائک پر آنے والا ہر تیسرا چوتھا شاعر یا شاعرہ متبذل کلام سناتا نظر آئے۔ اگر مشاعروں میں صرف جینوئن شعرا اور شاعرات کو مدعو کیا جاتے تو ظاہر ہے یہ صورت حال پیدا نہ ہوگی اور سامعین کے شعری ذوق کی تسکین کا بہتر سامان ہو سکے گا۔

مشاعروں کی فضا کو بہتر بنانے میں ہمارے شعرا بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ معتبر شاعر مشاعرے میں ایسا کلام سُنا رہے ہیں جو اُن کے درجۂ اعتبار سے فروتر ہے۔ یہ روش مناسب نہیں، خود اعتمادی سے کام لے کر اپنا نمائندہ کلام ہی سُنانا چاہیے۔ پرانی چیزیں بار بار سُنانے سے بھی گریز کرنا چاہیے اور تازہ کلام کو "آزمودہ کلام" پر ترجیح دینی چاہیے۔ ایک اور نامناسب وطیرہ ہمارے شعرا نے یہ اختیار کر لیا ہے کہ اپنا کلام سُنایا اور اسٹیج سے اٹھ گئے؛ یا جب اسٹیج پر بیٹھے ہیں اس وقت بھی مائک سے پڑھے جانے والے کلام کی طرف متوجہ نہیں، ایک دوسرے سے گپ بازی کر رہے ہیں، یا بیزاری سے پہلو بدل رہے ہیں۔ اوّل تو یہ باتیں آدابِ محفل کے خلاف ہیں، دوسرے سامعین پر ان کا منفی اثر پڑتا ہے۔ خود شاعر ہی، شاعر اور شاعری کا احترام نہ کریں تو دوسروں سے کس حد تک اس کی توقع کی جاسکتی ہے؟

—— مخمور سعیدی

باغ و بہار

اشتیاق عابدی

فلیٹ نمبر ۱۰۵ - بلاک ۲ - ساتویں منزل، قطب اپارٹمنٹس، کٹوریا سرائے، دہلی ۱۶

میر امن دہلوی کی باغ و بہار (یا قصہ چہار درویش) یقیناً اُردو کی ان چند کلاسیکی کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ ہی نہیں رہیں گی بلکہ جن کی کشش اور جاذبیت بھی سدا بہار رہے گی۔ ۱۸۰۱ء یا ۱۸۰۲ء میں لکھے گئے ان قصوں کا ترجمہ اب تک انگریزی، فرانسیسی، پُرتگیزی، چینی، روسی اور چیکوسلواک زبانوں کے علاوہ دنیا کی اور کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آخر اس کی اس لازوال شہرت کا راز کیا ہے؟

اس سوال کا مختصر سا جواب یہی ہے کہ یہ قصے بذاتِ خود بے حد دلچسپ ہیں۔ اور ان کا اندازِ بیان کہانی کے اُتار چڑھاؤ، پیچ و خم کے مطابق انتہائی عمدہ ہے۔ کُل چار قصوں میں پہلے دو قصے دو دُرویشوں کے ہیں۔ بیچ میں شاہ آزاد بخت کی اپنی کہانی آتی ہے۔ اس کے بعد تیسرے اور چوتھے درویشوں کی رودادِ حیات ہے اور آخر میں ان پانچوں کی دِلی مرادیں ایک ہی شہر روم میں بر آتی ہیں۔ یہ ساری حکایتیں چونکہ اُردو نثر کے اس بالکل ابتدائی دور میں دہلی کی خالص ٹکسالی زبان میں بیان کی گئی ہیں اس لیے اُن میں ذائقے کا زبردست چٹخارہ اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی دُنیا سے اُس وقت بے حد دور افتادہ ملک ہندستان کی ایک نئی نئی ابھرتی ہوئی زبان اردو کی بالکل ابتدائی نثر میں لکھی گئی ان حکایتوں کا اتنی ساری زبانوں میں ترجمہ ہو کر ایک بار نہیں بار بار چھپنا، اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں کتنی کشش ہے کتنی ہمہ گیری ہے تبھی تو وہ اُردو کے گہوارے دہلی۔ یوپی سے ہزاروں میل دور سمندر پار کے اتنے ملکوں اور اتنی زبانوں میں (جن کا سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول ہم سے اتنا جُدا ہے) قبولِ عام حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔

باغ و بہار۔ باغ و بہار ہی نہیں ہر زمانے کے لیے، ہر خطۂ ارض کے لیے، ہر عمر کے پڑھنے یا سننے والے کے لیے سدا بہار ہے۔ اُس میں ہر وہ عُنصر پایا جاتا ہے جس سے مل کر ایک حکایت یا حادثاتی ناول کی ترتیب ہوتی ہے۔

بات کو اور آگے بڑھانے کے لیے چند بنیادی نشانات لگانے اس لیے اور بھی ضروری ہیں کیونکہ باغ و بہار کا (MASS) احاطہ بہت وسیع ہے اور وہ اتنی (AMORPHOUS) ہے کہ اُسے کسی بندھی ٹکی تعریف کے دائرے کے اندر بند نہیں کیا جا سکتا۔ ایبل شِوالی نے ناول کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "وہ ایک کہانی ہو۔ نثر میں ہو۔ اور کچھ وسعت رکھتی ہو۔" میر امن کی باغ و بہار اس تعریف پر کھری اترتی ہے۔ وہ نثر میں ہے اور نثر میں بھی اُردو کی تقریباً پہلی سنجیدہ نثر ہے۔ شاعری نہیں ہے۔ لیکن اِن قصوں میں میر امن نے جس اُتم درجے کی قوتِ مُتخیلہ کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مزاج شاعرانہ تھا۔ (HE HAD THE TOUCH OF A POET) - پھر وہ کہانی ہے۔ داستان ہے۔ تاریخ کی حقیقت نگاری سے پرے ہے۔ پھر بھی ان قصوں میں نہ صرف اُس دور کے دہلی اور لکھنؤ کے سماجی و معاشرتی نظام، آداب اور روایتوں کی جھلک ملتی ہے۔ بلکہ ان کا پورا انکشاف (EXPOSURE) بھی ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ای۔ ایم۔ فارسٹر کا خیال ہے "ہم فکشن (FICTION) کو ادوار میں نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں مخصوص وقت کی دھارا پر بہت دھیان بھی نہیں دینا چاہیے۔"

میر امن یقیناً زبردست ظرافت اور بصیرت کے حامل رہے ہوں گے۔ تبھی تو انھوں نے ہمارے سامنے ایک آئینہ پیش کر دیا۔ کوئی آئینہ بذاتِ خود بڑا نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس سے بڑا بنتا ہے کہ اس کے سامنے سے تاریخ کا ایک اہم کارواں رواں دواں ہے۔ فکری آئینہ تب ہی بڑا مانا جائے گا جب وہ نئی جلا دے اور نیا شعور پیدا کرے۔ باغ و بہار کے قصے ٹھیک یہی کرتے ہیں۔ وہ داستان ہیں۔ اچھی داستان ہیں۔ اور بہت ہی دلکش انداز سے سنائی گئی ہے تاکہ سننے یا پڑھنے والے کا تجسس باقی رہے۔ اور یہ سوال

برابر قائم رہے کہ "پھر کیا ہوا؟"

اٹھارویں صدی کے خاتمے پر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے سنجیدہ اور سادہ اردو نثر کا آغاز مانا جاتا ہے۔ یہ ایک پہلا دور رس تہذیبی واقعہ تھا جو ہندستان کے تقریباً آٹھ سو سالہ مشترکہ کلچر میں رونما ہوا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد دلّی پر ویرانہ طاری تھا۔ اُس کی اجڑی بستیاں خوفناک حد تک خاموش تھیں۔ لکھنؤ کے دربار البتہ رومانوں سے بھرے اور باغ و بہار تھے۔ طوائفیں اور رقاصائیں شوخ لیکن باذوق امیرزادوں اور پارکھی سرپرستوں کے سامنے ٹھمک ناچ اور مجرا پیش کر رہی تھیں۔ وہاں کی محفلوں اور مشاعروں میں خوش کلامی اور سخن فہمی کے چرچے تھے۔ فنِ شاعری کی مختلف اصناف کی تراش و خراش جاری تھی۔ یہ مستی اور موج کا (HEDONISTIC) معاشرہ تھا۔

میرامن جیسے نباضِ زمانہ اور جینیس (GENIUS) کے لیے یہ ماحول بے حد سازگار تھا اور انھوں نے اپنے تخلیقی عمل کے لیے نہ صرف ان کا پورا پورا استعمال کیا بلکہ ٹھیٹ دہلوی ٹکسالی زبان میں اُن داستانوں کو پیش کر کے اُن کا لطف دوبالا سہ بالا کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس دور کے ہر طبقے کے افراد کی کمزوریوں اور حماقتوں پر زیرِ لب مسکراتے بھی ہیں۔ تہ در تہ معنی تلاش کرنے کے لیے اُکساتے اور چھیڑتے بھی ہیں اور انتہائی پرکارانہ انداز میں اشارہ بھی کرتے ہیں کہ یہی وہ تقدیر ہے جس سے بہرحال ہر فرد کو گزرنا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے مقابلے کے لیے فسانۂ عجائب لکھی مگر وہ اپنی مصنوعی اور حد درجہ مرصّع نثر کی وجہ سے میرامن کے شاہکار باغ و بہار کے سامنے اس وقت بھی پھیکی رہی اور آج بھی پھیکی ہے۔

جہاں تک میرامن کے تخیلاتی سرچشموں کا تعلق ہے میرے خیال سے یورپ میں بوکاچیو کی ڈیکامیرون (BOCCACIO'S DECA-MERON) اور ایشیا میں الف لیلی کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن کسی ممکن منبع اور سرچشمہ پر ضد کرنا گویا میرامن کے تخلیقی (GENIUS) کی توہین کرنا ہے۔ میرامن خود کہتے ہیں ان زبانی قصوں کی شروعات امیر خسرو سے ہوئی۔ ہوا یہ کہ ان کے (امیر خسرو کے) پیر و مرشد کسی شدید عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کا جی بہلانے کے لیے اور انھیں خوش رکھنے کے لیے امیر خسرو نے تخیلی داستانوں کا تانا بانا بننا شروع کیا۔ مرشد کو شفا ہوئی اور اسی وقت سے عام لوگوں کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ جو بھی ان داستانوں کو بیان کرے گا وہ خوش اور تندرست رہے گا۔ فارسی میں ان کا قدیم ترین نسخہ آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری یا حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ دکنی میں ان کا ترجمہ میر محمد علی شوق نے ۱۷۹۷ء تا ۱۷۹۹ء میں کیا۔ لیکن میرامن کی باری آئی تو انھوں نے اپنے طائرِ تصور کو اتنی آزادی دی اور اتنا اونچا اڑایا کہ ان کی حکایتوں نے زمان و مکان کی حدوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یورپ میں ڈنکن فوربس کے انگریزی ترجمے کی چوتھی اشاعت نے باغ و بہار کی شہرت کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔

اس انداز سے دیکھیے تو باغ و بہار کی اپیل اور اس کے قصوں کی ہمہ گیری مسلّم ہے۔ ادبی تنقید کے اصولوں پر پرکھا جائے تو باغ و بہار کے قصے ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہیں۔ وہ مواد، زبان اور مکان کی وحدت سے آزاد ہیں۔ وہ پوری کائنات کا احاطہ کرتے ہیں اور کسی مخصوص دور یا اس دور کی سماجی قدروں سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں جیسے دائروں کے اندر دائرے ہوں۔ جن کا واحد مرکز شاہِ روم آزاد بخت کی ذات ہے۔ پہلے دونوں درویش اپنی اپنی کہانیاں قبرستانوں میں سناتے ہیں۔ باقی دو محلِ شاہی میں۔ بُرقع پوش گھوڑسوار حضرت علیؑ کا ایک اور ہمت افزا ہیولا بھی سامنے آتا ہے اور زندگی کے مارے اُن تھکے ماندے درویشوں کی ہمت بڑھاتا ہے کہ مقدر کے آگے کسی کا کوئی بس نہیں اور انسان کو نہ ہمت ہارنی چاہیے نہ اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہیے۔ اس لیے حصولِ مقصد کے لیے انھیں روم کی طرف چل پڑنا چاہیے۔ چاروں درویشوں اور خواجہ سگ پرست کے علاوہ جنس سبھی مردانہ کرداروں کی مشترک کمزوری ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہی جنسی کشش انھیں مزید بھٹکنے سے بھی بچاتی ہے۔ اور ان کا حوصلہ بھی باقی رکھتی ہے۔ عورتیں خاص طور سے بصرہ اور سراندیپ کی شہزادیاں مردوں کے مقابلے زیادہ نڈر، زیادہ بڑھ جانے اور رجھانے والی، زیادہ سازشی اور اپنے پیار یا اپنی نفرت کی مہم میں کہیں زیادہ دُھنی ہیں۔ وہ عام طور سے بڑی رنگین مزاج اور جذباتی ہیں۔

آخری بات یہ کہ حالانکہ باغ و بہار ایک افسانوی بھنور ہے لیکن اس کے لوگ ہمارے جیسے لوگ ہیں۔ بیک وقت مضبوط اور کمزور بھی۔ بیک وقت جنسیاتی ہیجان کے شکار اور سچے پریم پجاری بھی۔ بیک وقت عظیم اور پست بھی اور بیک وقت دل و دماغ کے ویسے ہی بڑے یا چھوٹے جیسے ہم انسانوں میں بیشتر لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے چلیے اسے پڑھیں اور ان کا تہ در تہ لطف لیں۔

(۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کو آل انڈیا ریڈیو کی عالمی سروس کے لیے نشر کی گئی انگریزی تقریر کا ترجمہ)

شعلۂ جاں

میں شیر خوار تھی
جب میں نے بڑھ کے چھولی تھی
کسی چراغ کی لو.....
مجھے وہ جذبۂ آتش نوا تو یاد نہیں
جو مجھ کو نور کی محفل میں کھینچ لایا تھا
مگر یہ یاد ہے پہلا وہ شعلۂ دلدار
مرے قرار کا دشمن تھا
اور آج بھی ہے

اور اس کے بعد لڑکپن کی وہ گھنی راتیں
وہ جگنوؤں کا تعاقب
وہ جھلملاتے شرار
وہ ان کا "دامنِ رنگین کی چلمنوں میں اسیر
سمٹ سمٹ کے چمکنا
وہ ان کی خوئے گریز
جو میرے جذبۂ بے اختیار کو مہمیز

پھر اس کے بعد جوانی کی وہ حسیں شامیں
شفق کے رنگوں میں رقصاں وہ نور کے پیکر
مگر میں جب بھی بڑھی والہانہ ان کی طرف
وہ دھندلی دھندلی فضاؤں میں کھو گئے جاکر

اور اس کے بعد افق پر وہ کہکشاں کا ظہور
کہ جس کے نور سے تابندہ روئے آبِ رواں
کشش سے جس کی لرزتا سفینۂ دل و جاں
وہ کہکشاں کہ جو میری رگوں میں ٹوٹی تھی
جو آبشار کی مانند دل میں اتری تھی
مگر وہ بحر کی گہرائیوں کو پا نہ سکی.....
رو پہلی ریت پہ اترا سفینۂ غم جاں
کچھ اور روح کا ہر زخم ہوگیا عریاں.....

کہانی چاند کی بھی ہے یونہی ادھوری سی
کہ اس کا شعلہ حرارت سے آشنا ہی نہیں
کہ وہ تو شمع بھی خود اور خود ہی پروانہ
فسوں طراز اداؤں کا اپنی دیوانہ
کہ فطرت اس کی تو بڑھنا ہے
بڑھ کے گھٹ جانا
اور اس کے بعد اماوس کی وہ کڑی راتیں
اداسیوں کی وہ سوغات، غم کی برساتیں

بس ایک بار چھوا میں نے آفتاب کو بھی
وہ خود ہی اترا تھا شاید مری رگ و پے میں
بس اس کے بعد نہ میں تھی نہ یہ فضائے بسیط
کہ ایک ساعتِ نور آفریں کے ساغر میں
مرا سلگتا ہوا جسم ہوگیا تحلیل
وہ روشنی کا تلاطم تھا، یا کہ چشمۂ نور
جو میری روح کی کشتی کو لے گیا کہیں دور
مگر جب آنکھ کھلی تو وہی در و دیوار
وہی گزرتے شب و روز، ساعتوں کا شمار
مگر وہ نور کے جھرنے
وہ خیرہ کن ذرات
اتر چکے تھے مری روح کے سمندر میں
انھی کو ڈھال لیا میں نے فن کے ساغر میں

کچھ اس طرح سے مری زندگی کی شام ہوئی
نہ جس میں رنگِ شفق ہے نہ نور کا پرتو
نہ ماہتاب کا افسوں نہ آفتاب کی ضو
بس ایک شمعِ فروزاں جو میں نے رکھ دی ہے
شکستہ رات کی تاریکیوں کے دامن میں
یہ سوچتی ہوں کہ اے کاش پھر سے بن جاؤں
میں ایک طفلِ صغیر
اسی کی لو سے بجھا دوں نہ کیوں وہ شعلۂ جاں
کہ جس کے سوز سے میں عمر بھر رہی حیراں
قرار کا مرے دشمن تھا جو
اور آج بھی ہے

زاہدہ زیدی
۲۴، ایچ آئی جی فلیٹس، سرسید نگر، سول لائنز، علی گڑھ (یو۔پی)

باغ و بہار کی نثر —— اہمیت اور اجزائے ترکیبی

رشید حسن خاں
ٹی سی ۹، گوایر ہال، دہلی یونیورسٹی کیمپس، دہلی ۱۱۰۰۰۷

میرامّن کی بامحاورہ اور روزمرّہ سے آراستہ نثر کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نثر کا یہ نیا اسلوب، فارسی کی اُس طاقتور نثری روایت کے دباو سے ذہنوں کو آزاد کرانے کا نقطۂ آغاز بنا، جس نے ہندستان کے اہلِ علم کو بے طرح اپنا گرویدہ، بلکہ یوں کہیے کہ اسیر بنا رکھا تھا۔ ابوالفضل، ظہوری، طغرا اور نعمت خاں عالی جیسے مشکل پسندوں کی نثر کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ نثر جو بیان کی پیچیدگی میں اپنی مثال آپ تھی اور جس میں لفظی و معنوی صنعتوں کا بہت زیادہ عمل دخل تھا، اس نثر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ نوطرزِ مرصّع کو اُردو میں اسی روایت کا پہلا (ہلکا سا اور کچھ بگڑا ہوا سا) نقش کہنا چاہیے۔ ایسے حالات میں معمولی یا اوسط درجے کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص ایسے نئے اسلوب کا ڈول نہیں ڈال سکتا تھا جو فارسی کی اُس طاقتور روایت کے اثر اور دباو کو کم کرسکے اور اس کے ساتھ ہی اُس مرصّع روایت کے مقابلے میں ایک سادہ و صاف (لیکن پُرکار) روایت کو اس طرح پیش کرسکے کہ اب اُس کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل ہوجائے —— میرامّن کی نثر نے یہی کام کیا ہے۔

میرامّن کی اصل حیثیت ایک ایسے صاحبِ طرز نثر نگار کی ہے جس نے اُردو میں سادہ و پُرکار پیرایۂ اظہار کا نقش درست کیا، روزمرّہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی اہمیت کو صحیح معنی میں پہلی بار روشن کیا اور جس چیز کو چلن کہتے ہیں، لغت اور قواعد کے مقابلے میں اُس کی افضلیت اور برتری کا اظہار اور اعلان کیا۔

پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں:

"ادبی نثر کی ترقی کے لیے جس طرح کا ماحول ہونا چاہیے تھا، وہ آہستہ آہستہ ہندستان میں پیدا ہو رہا تھا۔ اٹھارویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی تھی اور زندگی نئے حدود کی طرف بڑھ رہی تھی۔" (اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۳۸)۔ ادب، خاص کر نثر میں "نئے حدود کی طرف" بڑھنے کے لیے فورٹ ولیم کالج نے راستہ بنایا تھا۔ اس ادارے میں پہلی بار اس زبان کی وسعت سامنے آئی۔ کالج میں اچھے اچھے مصنّفین کو گل کرسٹ نے یک جا کر دیا تھا، یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُن مصنّفین میں شیر علی افسوس اور بہادر علی حسینی جیسے کئی لوگ شامل تھے، جو علم میں شاید میرامّن پر فضیلت رکھتے ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ نثر نگاری میں اُن میں سے کوئی بھی میرامّن کے برابر کا نہیں۔ اُن سب نے (گل کرسٹ کی فرمائش اور ہدایت کے مطابق) سادہ و صاف نثر لکھی ہے، مگر اُس نثر میں دلوں کو چھولینے اور ذہنوں کو متاثر کرنے کی ویسی صلاحیت نہیں۔

سادہ و صاف نثر لکھنا بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں۔ جس زمانے میں میرامّن نے کلکتے میں باغ و بہار لکھی ہے، اُسی زمانے میں شمالی ہندستان میں ایک دوسرے مصنّف زرّیں نے بھی قصۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے کی زبان آسان ہے، سادہ و صاف ہے؛ لیکن اُبالی کھچڑی کی طرح بے مزہ بھی ہے۔ میرامّن کی نثر میں جو حُسن، طاقت اور چھا جانے والی کیفیت ہے، اُس میں اُن کے زمانے کا کوئی ایک شخص اُن کا شریک نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ باغ و بہار کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا گیا ہے۔ اس کتاب نے ایک نئے طاقتور اسلوب کی بنیاد ڈالی، جو معیار ساز ثابت ہوا۔ باقی سب کی نثریں خوب ہیں، مشکل پسندی سے محفوظ ہیں، آسان ہیں، مگر اُن میں وہ طاقت نہیں کہ ایک نئے اسلوب کی تشکیل ہوسکے اور ایک نئے پیرایۂ اظہار کے خط و خال روشن ہوسکیں۔ نئی روایت کی تشکیل ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کالج کے کسی اور مصنّف میں یہ

زات اور ہمت نظر نہیں آتی جو (اُس زمانے
ں جب فارسی زبان، قواعد اور لُغت کی حکم
انی کا دَور تھا) قواعد اور لُغت پر استعمالِ
ام کو ترجیح دے سکے اور اُس کو اپنے اُوپر
نا اعتماد ہو کہ: مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔
اُن کی نثر کے اجزائے ترکیبی پر گفتگو
رنے سے پہلے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ میراَمّن
ا حیثیت قصّہ گو یا داستان نگار کی نہیں۔
قعات ہوں یا کردار، یہ سب اُن کو اسی
رح ملے تھے۔ اگر دسترخوان پر طرح طرح کے
انے رکھّے گئے ہیں، یا بہ قولِ شیرانی: "مصنّف
، جغرافیائی معلومات، جیسا کہ افسانوں کا دستور
ہ، ناقص ہے"، یا ایسی ہی کچھ اور باتیں؛
یہ سب بھی اُن کی "تصنیف" نہیں۔ اُنھوں نے
مل قصّے کو، جسے پہلے اُردو ہی میں مرصّع زبان
لکھا جا چکا تھا، اپنی زبان میں لکھا ہے اور
مل حیثیت اُس زبان اور اُس اندازِ بیان
ہے۔ تحسین کی نوطرزِ مرصّع اُن کا اصل ماخذ
ہ؛ اُس کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر
دار تحسین کی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔
غ و بہار میں ہر کردار اپنی زبان میں باتیں
تا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت سے مقامات
یراَمّن نے منظر نگاری یا تصویر کشی کے ذیل
کچھ جزئیات کا اضافہ کیا ہے اور دونوں
بوں کے ایسے مقامات کو آمنے سامنے
کر دیکھا جائے تو صاف صاف معلوم ہوگا
یراَمّن کے اضافوں نے اُس منظر کو جاندار
بھرپور بنا دیا ہے۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش
ہاں میں صرف ایک مکالمے کو بہ طورِ مثال پیش
تا ہوں، صورتِ حال کا اِسی سے بہ خوبی
اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے درویش کی سیر میں ایک مقام
پر کُٹنیاں، شہزادی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔
ایک کُٹنی اُس گھر میں آ جاتی ہے جہاں شہزادی
موجود ہے۔ نوطرزِ مرصّع میں کُٹنی، شہزادی سے
کہتی ہے: "اے صاحب زادی! میں ایک دخترِ
عاجزہ، حاملہ رکھتی ہوں کہ دردِ زہ میں گرفتار
ہے اور بے اختیار نان و کباب چاہتی ہے" (مرتبہ
نورالحسن ہاشمی، طبع اوّل، ص ۲۳۴)۔ اب
میراَمّن کا بیان دیکھیے:

"میں غریب رنڈیا، فقیرنی ہوں، ایک
بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی سے، پورے دِنوں،
دردِ زہ میں مَرتی ہے اور مجھ کو اتنی وُسعت
نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے
پینے کو تو کہاں سے لاؤں! اگر مَر گئی، تو گور
کفن کیوں کر کروں گی! اور جنی، تو دائی جَنائی
کو کیا دوں گی! اور جچا کو ستھوارا، اچھوانی
کہاں سے پلاؤں گی! آج دو دن ہوتے ہیں کہ
بھوکی پیاسی پڑی ہے" (ص ۲۱۱)۔

دونوں کے بیانات میں اندھیرے اُجالے
کا فرق ہے۔ میراَمّن نے جن جزئیات کا اضافہ
کیا ہے، اُن سے مکالمے میں جان پڑ گئی ہے
اور پورا منظر متحرک محسوس ہونے لگتا ہے۔
یہی میراَمّن کا کمال ہے۔ بہ قولِ مولوی عبدالحق:
"لفظ کو اُس کے صحیح مفہوم میں، ٹھیک موقع
پر استعمال کرنا اصل انشا پردازی ہے اور اس
میں میراَمّن کو بڑا کمال حاصل ہے" (مقدمہ
باغ و بہار)۔

جن عناصر نے باغ و بہار کی نثر کو
حُسن بخشا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُسے
بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا ہے، اُن
میں سے چند اہم اجزا کی اختصار کے ساتھ
نشان دہی کی جاتی ہے۔

تکرارِ الفاظ

تکرارِ الفاظ اُن کے اندازِ بیان کی ایک
اہم خصوصیت ہے۔ اِس خصوصیت نے کئی
شکلوں میں اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے۔ کبھی تو
وہ تابعِ مہمل کی پیوند کاری کرتے ہیں، اور
اِس سے اُردوپن اور بول چال؛ دونوں کا رنگ
چمک اُٹھتا ہے۔ کچھ مثالوں سے اِس کا اندازہ
ہوگا (یہ وضاحت کر دی جائے کہ یہاں استقصا
منظور نہیں، اِس لیے ایسے ہر بیان کے ذیل میں زیادہ
مثالیں پیش نہیں کی گئیں) مثلاً: موٹے جھوٹے
کپڑے (ص۱۸) تب لوٹ پوٹ رہیں گے (ص۲۰)
کچھ پیسے پاس رہے تھے (ص۲۷) دھو دھا کر
صاف کیا (ص۲۸) لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں (ص۲۴)
دولتِ دنیا کھو کھا کر (ص۲۴) ہاتھ مُنہ دھو دھا کر
ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے (ص۶۹) کپڑے
و پڑے پھینک پھانک دیے (ص۶۵) ننگا منگا
فقیر بن کر (ص۶۵) بھون بھان کر کھا لیتے (ص۶۴)
بغیر پوچھے گچھے (ص۳۱) ورثہ بانٹ چونٹ نہیں
لیتا (ص۱۳۶) سب چھوڑ چھاڑ کر (ص۱۴۰) لڑھتا
پڑتا پہاڑ سے نیچے آیا (ص۱۴۸) منا منو کر
(ص۶۵)۔

اِسی انداز کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ
کبھی مرادف اور کبھی قریب المفہوم لفظوں کو
ایک ساتھ لاتے ہیں، اس سے بھی گفتگو کا انداز
نمایاں رہتا ہے، مثلاً: آدمیوں کی ساتھ سنگت
سے (ص۹) ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے
(ص۱۱) سپاہ گری کا کسب و فن (ص۲۱) قرض دام
سے کام چلے (ص۲۹) تلاش میں ناؤ نواڑے کی (ص۶۴)

اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا (ص ۲۱) سرپر بوڑھا بڑا نہ رہا (ص ۲۱) راہ باٹ میں اگر بھینٹ ملاقات ہوجاتی (ص ۳۲) رعیّت پر جاگمن ہوتے (ص ۱۵) اُس نے دو دو ایک خط خطوط جو لکھے (ص ۲۳) مجھے جتنے بجنے سے کیا کام ہے (ص ۱۳۵) راہی مسافر، جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے (ص ۱۰) گھاٹ باٹ اِس دریا کا (ص ۶۸)۔

کبھی وہ جملے میں ایک لفظ کو مکرّر لاتے ہیں اور اِس تکرار سے بھی وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے: ابھی سے پڑ پڑ رہنا خوب نہیں (ص ۲) جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی (ص ۲۰) قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار (ص ۲۳) ہزار ہزار شکر بجالایا (ص ۲۳)۔

اِسی انداز کی ایک شکل وہ ہے جس میں وہ متضاد لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں، جیسے: تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے (ص ۸۴) راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے (ص ۷) جہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے (ص ۲۱) جتنے آدمی واں کے ہزاری اور بزاری نظر پڑے (ص ۹۷)۔

اِس انداز کا حُسن اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتا ہے جب وہ طویل جملوں میں ایسے متعدد لفظ یک جا کر دیتے ہیں، جن میں سے بعض میں دو دو مرادف یا قریب المفہوم لفظوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں، مثلاً: "سب دولت دُنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں... اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے سانپ اُن کو کھا گئے" (ص ۱۷)۔

یا پھر موقعے کی مناسبت سے ایسے کئی لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں جو اصل میں ایک ہی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِس طرح عبارت میں بیان کا حُسن تو پیدا ہوتا ہی ہے، لفظیات کے ذخیرے پر لکھنے والے کی نظر کس قدر مُحیط ہے، اِس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے مقامات پر عبارت میں داستان سرائی کا سا انداز پیدا ہوجاتا ہے اور یہ داستانی انداز پڑھنے والے کی نظر میں دِل چسپی کی چمک پیدا کر دیتا ہے اور توجّہ کو پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مثال کے طور پر اِن ٹکڑوں کو دیکھیے: "ویسے ہی آدمی غُنڈے، پھانکڑے، مُفت بر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا ہوئے" (ص ۲۲)۔ "اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی؛ سب چھوڑ کر کنارے لگے" (ص ۲۳)۔ "فرّاشوں نے فرش فروش بچھا کر، چھت، پردے، چلونیں تکلّف کی لگا دیں" (ص ۲۱)۔ "تب اُس نمک حرام، بے رحم، کٹّر، سنگ دل نے" (ص ۵۸)۔ "ایک جوانِ شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحبِ مروّت" (ص ۷۷)۔ "ایک طرف آتش بازی، پُھل جھڑی، انار، داؤدی، بھچُنبا، مروارید، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھُٹتے تھے" (ص ۵۶)۔ "وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی... دربان اور روتے، میوڑے، باری دار اور یساول، چوبدار اُس کو... منع کرنے لگے" (ص ۵۱)۔ "یہ حالت دیکھ کر دائی، ددا، چھوچھو، انگا؛ سب کی سب متفکّر ہوئیں" (ص ۴۹)۔

اِس داستانی اندازِ نگارش کی خوبی میں ایسے مقامات پر اور زیادہ اضافہ ہوگیا ہے جہاں اُنھوں نے طویل جملوں میں ایسے ٹکڑے یک جا کیے ہیں۔ سجع کا سا انداز ہے اور جس سے عبارت میں ایک خاص طرح کی خوش آہنگی پیدا ہوجاتی ہے، مثلاً: "ایک روز بہار کے موسم میں کہ... بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندھ رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی" (ص ۵۵)۔ "ایک صراحی شربت کی تکلّف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر لایا" (ص ۴۹)۔ "میں دل کے شوق اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے" (ص ۴۹)۔ "اس لڑکے سے ٹھٹھّا مزاخ کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی... اچھّی اچھّی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اچنبھے کی نقلیں لانے۔ بلکہ آہ رو ہی بھی بھرنے اور سسکیاں لینے" (ص ۴۹)۔ "وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہوگیا اور وہ رنگ جو کُندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ مُنہ میں پھپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں" (ص ۹۲)۔

میرامّن کے حالاتِ زندگی کی بیش تر تفصیلات معلوم نہیں، اِس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ قصّہ گوئی اور داستان سرائی سے بھی اُن کو کچھ رابط رہا ہے؛ لیکن اِس کتاب میں متعدّد مقامات پر عبارت کا انداز کچھ ایسا ہے جو داستان سرائی کی ہلکی سی چمک لیے ہوئے نظر آتا ہے، مثلاً اِس عبارت کو دیکھیے: "بارے جب آفتاب، تمام دن کا مسافر تھکا ہوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہ تاب، اپنے دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا" (ص ۸۸)۔ یا پھر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے طویل جملوں کی ساخت میں اِس طرح شامل کیے گئے ہیں کہ وہ مفہوم کی تکرار کا حق ادا کرتے ہیں اور

اِس طرح بات کو پُر زور بناتے ہیں؛ ایسے مقامات پر بھی قصہ گوئی کے رنگ کی ہلکی سی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، مثلاً یہ عبارت:

"اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا" (ص ۲۴)۔

اِس سے پہلے تیسرے درویش کی سیر سے ایک کُٹنی کی گفتگو نقل کی جا چکی ہے؛ اُسے ایک بار پھر پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ کوئی باکمال قصہ گو تفصیل بیانی سے مدد لے کر اپنے بیان کو پُر زور بنا رہا ہے۔ ایسے مقامات اچھی خاصی تعداد میں اِس کتاب میں سامنے آتے ہیں۔ بہ ہر حال قصہ گوئی سے اُن کا کچھ تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو؛ جہاں جہاں منظر نگاری، مرقع کشی یا کسی واقعے یا بیان کی تفصیلات معرضِ تحریر میں آئی ہیں، ایسے سب مقامات پر بیان کا رنگ بہت چوکھا ہو گیا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی نہایت دل چسپ بیان کو سُن رہا ہے، جس میں شامل تفصیلات اُس کے خیال اور ذہن کو متاثر کرتی چلی جا رہی ہیں۔ محض وضاحتِ مزید کے لیے اِس منظر کو دیکھیے:

"کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اُردا بیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں، اذبکنیاں، کشمیرنیاں، جواہر میں جَڑی، عُہدے لیے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا" (ص ۸۹)۔

مرادف اور قریب المفہوم لفظوں پر اُن کی نظر بہت گہری ہے اور یہ صفت بھی بیانیہ کے حُسن کو چمکاتی ہے۔ مثلاً ایک جیل خانے کے لیے انھوں نے پانچ لفظ استعمال کیے ہیں: بندی خانہ، زنداں، محبوس خانہ، پنڈت خانہ، قید خانہ۔ اِسی طرح محبوس، بندیوان، قیدی۔ اِسی طرح مثلاً: جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغا باز تھے" (ص ۱)۔ یا مثلاً: "نوکر چاکر، خدمت گار، بہیلے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی (ص ۲۲)۔ ایسی مثالیں بہت ہیں۔ داستاں گو کے تخیّل کی جھلک اِس اندازِ بیان میں دکھائی دیتی ہے۔ پُرانے قصہ گویوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ نام جانتا ہو اور اُن کو سلیقے کے ساتھ اپنے بیان میں کھپانے پر قادر ہو۔ باغ و بہار کی نثر کے بہت سے مقامات اِس خوبی اور اِس فنی چابک دستی اور اِس مہارت سے معمور نظر آتے ہیں۔

امالہ

اِمالے کی بعض بہت دِل چسپ مثالیں اُن کی عبارت میں ملتی ہیں اور ایسے مقامات پر عام بول چال کی زبان کا اثر اُبھر آتا ہے، ایسی چند مثالیں: دل میرا دبدھے میں ہے (ص ۴۷) شاگرد پیشے اور مجرائی ... حاضر تھے (ص ۸۹) مجرے گاہ میں (ص ۱۶) تکلیف روز مرّے کے خرچ کی (ص ۲۹) بونے خانے کی (ص ۱۳۹) آہستے سے کہا (ص ۲۶) اصل و نفعے کا تھا (ص ۲۹) اِدھر اُدھر پڑے پھرے (ص ۴۷) عصے بردار کھڑے ہیں (ص ۳۵) نمک پر ورے (ص ۱۳) یہ کیا معنے رکھتا ہے (ص ۳۹)۔ کئی مرتبے (ص ۲۰۴)۔

"بہ" کے مرکبات

اِسی طرح مرکبات میں "بہ" کا استعمال اُن کی عبارت میں اِس طرح ملتا ہے کہ بعض مقامات پر تو اجنبی پن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اکثر مقامات پر بات چیت کا انداز نکھر جاتا ہے؛ ایسی بعض مثالیں: رنگ بہ رنگ کی شکلیں (ص ۶) رنگ بہ رنگ کے جانور (ص ۳۳) گلابیاں رنگ بہ رنگ کی (ص ۳۶) پیڑھی بہ پیڑھی (ص ۸) زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے (ص ۱۳) لہو میں تر بہ تر (ص ۲۶) خوشی بہ خوشی اجازت دی (ص ۳۴) خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ بہ رنگ کے (ص ۵) میں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا (ص ۱۴۳)۔

قافیہ بندی

یہ خیال کرنا کہ میرامّن نے پوری کتاب میں ساری عبارت اُسی طرح لکھی ہے جس طرح بہ قول اُن کے: "ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں"، کسی طرح درست نہیں ہوگا۔ اِس کتاب میں وہ سب عناصر موجود ہیں جو اُس دَور کی انشا پردازی کا جُز تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ دوسروں کے یہاں اُن کا تناسب اور اُن کی ترکیب وہ نہیں، جو میرامّن کی عبارت میں ہے۔ یہاں صنعتیں بھی ہیں، قافیہ بندی بھی ہے، اجنبی طرزِ ادا بھی ہے، فارسی کے انداز پر تراشے گئے جملے بھی ہیں جن میں بھدّا پن سمایا ہوا ہے، لفظی تعقید اور شتر گربگی بھی ہے۔ یہ سب سہی، مگر

مجموعی طور پر عبارت میں اُردو پن نمایاں رہا ہے اور سہلِ ممتنع کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اُنھوں نے قافیہ بند ٹکڑے عبارت میں سموتے ہیں، مگر ایسے مقامات پر ذہن پر محسوس نہیں کرنے پاتا کہ لکھنے والا قافیہ بندی کا ہُنر دکھانا چاہتا ہے، بلکہ ایسے بیشتر مقامات پر عبارت کا حُسن کم نہیں ہونے پاتا، اور کہیں کہیں تو بڑھ جاتا ہے۔ قافیہ بندی کی یہ چند مثالیں اثباتِ مدّعا کے لیے کافی ہوں گی:

"اور زمین پانی کا بتاشا؛ لیکن یہ تماشا ہے (ص۳)، وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا (ص۵۸)، شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں (ص۵)، سر سے پانو تک موتیوں میں جڑی روش پر آ کر کھڑی ہوتی (ص۴۱)، یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی (ص۴۱)، بادشاہ کو خردمند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا (ص۱۷)، مکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کُندن کی طرح دمکنے لگا (ص۲۹)، میں یہ تسلی پا کر، اپنی استقامت کے مکان پر آکر، منتظر تھا کہ کب شام ہو، جو میرا مطلب تمام ہو (ص۸۸)۔

پوری کتاب ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ قافیہ بندی ذوق پر گراں نہیں گزرتی، اس کے برعکس عبارت میں ایک خاص انداز کی خوبی کا اضافہ کر دیتی ہے۔

صنعتیں: میر امن کی نثر میں مناسباتِ لفظی کی کمی نہیں۔ مراعاتُ النظیر، تضاد اور تجنیس جیسی صنعتیں پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ مثالوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا؛ لیکن ایک اس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا (ص۱۰)، جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے (ص۱۳)، شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی (ص۸۸)، میرا دل تو اُس پر لٹو ہوتی رہا تھا، چکّی کی طرح اُس کے اختیار میں تھی (ص۵۹)، خدا نے مار کر پھر جلایا (ص۵۹)، غصّے کی آگ میں پھنک رہی ہوں، آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی (ص۶۲)، اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے (ص۳)، تیری امید کا سوکھا درخت ان کی توجّہ سے ہرا ہو کر پھلے گا (ص۱۹)، سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور لینے دینے کا سودا ہوا (ص۲۲) ـــــ ایسی مثالیں اس کتاب میں بہت ملتی ہیں۔

بہت سے مقامات پر طویل عبارت کے مختلف ٹکڑے لفظی مناسبتوں سے معمور ہیں (قافیہ بندی مزید براں) بس دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں: جاتے جاتے ان چیت ایک دریا (جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو) راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا... کچھ عقل بیڑا نہ پایا۔ یا الٰہی! اب اس سمندر سے کیوں کر پار اُتریں... آخر یہ لہر آئی کہ... میں تلاش میں ناو نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنیں بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا... گھاٹ باٹ اس دریا کا دیکھوں (ص۶۶)۔ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ شاید اس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو (ص۱۸)۔

صنعتیں اور لفظی رعایتیں، سچ تو یہ ہے کہ زبان کا جُز رہی ہیں۔ جہاں تناسب بگڑ جاتا ہے، بس وہاں نظر رُکتی ہے اور میر امن کے یہاں ایسے مقامات کم سے کم ہیں جہاں تناسب بگڑا ہو، یہی وجہ ہے کہ جب تک خاص طور پر متوجہ نہ کیا جائے عام طور پر یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ باغ و بہار کی نثر میں قافیہ بندی کا اہتمام بھی ہے اور لفظی رعایتوں کی صنعت گری بھی ہے۔ یہ بات لکھنے والے کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے۔ ہاں یہ واضح ہے کہ اسے خواہ انشا پردازی کہا جائے یا داستانی پیرایۂ اظہار سے تعبیر کیا جائے؛ مگر یہ انداز بول چال کی زبان کا نہیں۔

الفاظ اور افعال

میر امن کا یہ بڑا کمال ہے کہ انھوں نے لفظوں کی تراش اور کم مستعمل الفاظ اور کم معروف ہندی الفاظ کے برمحل استعمال کا نیا شعور بخشا ہے۔ ایسے بیسیوں لفظ اس کتاب میں آتے ہیں، جن سے عبارت میں تازگی اور نیاپن پیدا ہو گیا ہے اور پہلی بار یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں کیسے کیسے کام کے لفظ ہمارے پاس تھے، جن کو ہم چھوڑتے گئے اور بھولتے گئے۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

دیدارو (خوب صورت)، تتّا تھو، بھیدو، سرے پاو (خلعت)، سادی خوزادی، پھسا ہندے چوچلے، بندٹ خانہ (قید خانہ)، پَرپیچ، پرچھا، اُپرالا، تُسرت، بسرواہ، لنگری (تھالی) مان مہت، تکیہنی (چھوٹا سا تکیہ)، چار گردے کے گھوڑے، دھراہر، ڈھول چھکڑ، باو بتاس، ندھڑک، مینتے، چلے، رڑاکی فوج، بڑی فجر (صبح صادق)، دسا کریں، پُوشاکی، پھینٹا (صافہ)، آدھار، اُلاق، اٹلگ، اُمرا زادیاں، خوش نقشہ خلوت خانہ، تستری، ورخرچی (فضول خرچی)، طعنہ مہنا، سہی سانجھ، بت کہاو (اندازِ بیان)

نخرے تلّے، پھسلا پندھلا کر، اَن چت (اچانک)، مرد آدمیت، موئی مٹی کی نشانی، بُھوتی ہزاری بزاری، بھاتی چاری، بُھگنا (بھاتی)، بُول (کریلا) پہری (چندا)، دِہرا، صافی نامہ، کرچھال کُھپرا، پنگھولا، مکر چکر، گذربان، چرن برداری، چوچکی، اُکت، نمک پرورد ے، پیر غلام، خوش گزران، مجرے گاہ، پیکھنے کا کھیل، ٹھیپ، چاوچوز، پھانکڑے، خوشامد برامد، روز راتب، معبود اللہ، میاں اللہ، سائیں اللہ، مرشد اللہ، ساتھ سنگت، وغیرہ۔

الفاظ کی طرح اُن کی نثر میں افعال کی بھی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ کچھ فعل تو ایسے ہیں کہ پڑھنے والا اچانک یہ محسوس کرتا ہے کہ نیا لفظ سامنے آگیا ہے، مثلاً:

ننگیالیں گے (سب کچھ چھین لیں گے)، چرطھواں جوتا اڑایا، گھوڑے کو ٹنگیا کر، آپس میں بتیاتے ہیں، جو تحفہ چاہیتا (چاہیے ہوتا)، مجھے بھی بادشاہ زادی کہوایا، شیطان نے ورغلانا (ورغلایا)، خدا سے لو لگاتے رہیں تھیں، جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے۔

باغ و بہار میں افعال کی اِس قدر مختلف شکلیں ملتی ہیں، کہ اس تحریر میں اُن سب کو شامل کرنا مشکل ہے۔ میں بہ طورِ مثال یہاں صرف ایک خاص شکل "کرکر" کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ فعل کی یہ صورت بہ کثرت ملتی ہے، مثلاً: سرفراز کرکر، مقرّر کرکر، تاکید کرکر، یاد کرکر (وغیرہ)۔ {سر سیّد نے آثار الصنادید میں ایک جگہ لکھا ہے: "اگلی تاریخ کی کتابوں میں اس بازار کو لاہوری بازار کرکر لکھا ہے (طبعِ دوم، ص ۵۲)۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ سر سیّد تک یہ کلمہ استعمال میں رہا ہے، البتّہ یہ ضرور ہے کہ باغ و بہار میں اِس کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں}۔

سچ تو یہ ہے کہ خاص الفاظ اور افعال کی مختلف شکلیں، یہ ایک ایسا موضوع ہے جو مفصّل مطالعے کا مستحق ہے۔ اُن کی نثر میں افعال کی ایسی صورتیں بڑی تعداد میں سامنے آتی ہیں؛ جواب اجنبی ہیں اور ارتقاے زبان کے لسانی عمل نے اُن کو پُرانی یادگار بنا دیا ہے۔ اُن کی نثر کے اجزاے ترکیبی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اِن سب کا مطالعہ اور تجزیہ ضروری ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ باغ و بہار میں عربی فارسی کے لفظ تعداد میں کچھ کم ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ بہ طورِ عموم ایسے عربی فارسی لفظ شاملِ عبارت نہیں ہو پاتے ہیں جو کم مانوس یا نامانوس ہوں۔ دوسری طرف یہ ہوا ہے کہ جگہ جگہ (آج کل کے لحاظ سے) کم مانوس یا نامانوس غیر عربی فارسی لفظوں کو جملے میں اِس طرح کھپایا ہے کہ اندازِ بیان میں نیا پن اُبھر آیا ہے۔ اُن کی نثر میں عربی فارسی کے لفظ کم نہیں، لیکن یہ الفاظ چوں کہ مانوس اور نظر آشنا ہوتے ہیں، یوں وہ نظر کو بہ طورِ خاص اپنی طرف نہیں کھینچ پاتے۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے لفظ چوں کہ کم مانوس ہیں، یوں اُن کا نیا پن ذہن پر اپنا نقش ثبت کر دیتا ہے۔ مثلاً اِس عبارت کو دیکھیے:

"اُسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو اِس قیمت باغ کی لونڈی سمیت چُکا کر، قبالہ باغ کا اور خط کنیزک کا لکھوا کر اِس شخص کے حوالے کر اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دلوادو۔ اِس پروانگی کے سُنتے ہی آداب بجالیا اور مُنہ پر رونق آئی"۔

اِس عبارت میں آخری ٹکڑا "مُنہ پر رونق آئی" ایسا آگیا ہے جس پر نظر اچانک رُک جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہے نیا پن۔ یا اِس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھیے: "جو شخص نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے"۔ "گھر سینا" ایسا محاورہ ہے جس سے عام طور پر لوگ مانوس نہیں، مگر ہے دل کش اور مفہوم کو بہت عمدگی کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ اِس ایک ٹکڑے نے پوری عبارت پر اثر ڈالا ہے اور نظر اِس پر خاص طور پر رک جاتی ہے اور ذہن میں نئے پن کا احساس اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

ایک بات اور: ہر اچھے قصّہ گو کی طرح میر امّن نے بھی اِس کا لحاظ رکھا ہے کہ جہاں کوئی خاص کردار آگیا ہے، تو وہ کردار اپنی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ مثلاً جب جوتشی زائچہ بناتا ہے یا کُٹنی جب باتیں کرتی ہے (وغیرہ) تو ایسے مقامات پر عربی فارسی لفظوں کا عمل دخل ہونا ہی نہیں چاہیے۔ ایسے مقامات سے یہ استدلال کرنا کہ باغ و بہار میں ہندی لفظوں کا اوسط زیادہ ہے، درست نہیں ہوگا۔ فسانۂ عجائب میں بھی ایسے مقامات پر ایسے کرداروں کی گفتگو کا یہی انداز ہے۔ یہ تو قصّہ گوئی کا خاص انداز تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میر امّن کی نثر میں ایسے لفظ بہت سلیقے کے ساتھ شامل ہوتے ہیں، جہاں دوسرے لکھنے والے عموماً عربی فارسی کے لفظ لاتے تھے، مثلاً: "بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں"۔ یہ انداز دوسروں کے یہاں نہیں ملتا اور ایسے ہی ٹکڑے اُن کی نثر کا حُسن بڑھاتے ہیں۔

فارسیّت اور اجنبی طرزِ ادا

یہ دل چسپ بات ہے کہ باغ و بہار میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں طرزِ ادا میں اجنبی پن شامل نظر آتا ہے، یا صاف طور پہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے انداز پر جملے گڑھے گئے ہیں، جیسے فارسی جملوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ ایسے طویل جملے بھی ہیں، جن میں تقدیم و تاخیر، تعقید اور کاواک اندازِ بیان نے بھدا پن نمایاں کر دیا ہے۔ ایسے مقامات کچھ کم نہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجایش نہیں، اس لیے نسبتاً کم مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ سادہ و صاف اندازِ بیان، عربی فارسی لفظوں کی جگہ ہندی لفظوں کے کھپانے اور اُس سے پیدا شدہ حُسن کاری کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے؛ ایسے مقامات پر اُس سے مختلف صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً اِس طویل مرکب جملے کو دیکھیے:

"بہ موجب حکمِ بادشاہ کے، اُس آدمی رات میں (کہ عین اندھیری تھی) ملکہ کو (جو جوڑے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھوتی، لے جا کر ایک میدان میں کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذکر ہے، چھوڑ کر چلے آتے۔"

مبتدا کی خبر کس قدر دور واقع ہوتی ہے! پہلے ٹکڑے میں جو لفظی تعقید ہے، وہ مزید برآں۔ چند اور مثالیں:

ساتویں برس میں پاٹو دیا۔ غور میں گیا۔ ایلچی نے زمین خدمت کی چومی۔ رعشہ ہو گیا (کانپنے لگا)۔ آخر یہ حالت اپنی پہنچاتی۔ تجھ سا عقل مند صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے۔ اگر تم میں قوّت نہ تھی، تو کیوں ایسی کچی ہوس پکاتی۔ اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر اُس کے مکان پہ پہنچا۔ نہ مجلس خوشی کی خوش آوے۔ محبت اُس کی دل سے نہ بھولی۔ میں نے اپنے دل پہ قول کیا تھا۔ میں سرِ مو تفاوت کہتا ہوں۔ اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما۔ میں بہ مجرد سُننے اِس قصّے کے۔ کسو کو اُس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوتی۔ خدا کے توکّل پر بھروسا کر کے۔ جس واسطے یہ محنت کشی کر کر گیا۔ جب دو پہر ہوتی، برخاست ہو کر، اندرونِ محل داخل ہوتے۔ درود طفیل پیغمبر کی روح کے۔ ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا۔ مجھے باعث ہوا۔

"نے" اور "کو"

"نے" کے حذف اور استعمال کی چند مثالیں:

تب میں نے بے اختیار اُس پری کو . . . بغل میں لے آیا۔ تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے۔ ذرا سُرت آئی، تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا۔ میں پاس جا کر جو دیکھا۔ جب میں جیتا اُٹھ کر، اُس معشوق کے مقابل جا کر سلام کیا۔ القصّہ رات کو چپکے یے دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے۔[1]

"کو" کا استعمال: اِس قصّے کو ترجمہ کرو۔ نوّاب علی مردان خاں نہر کو لے کر آیا۔ سب کو کہہ دو حاضر رہیں۔ سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی۔ بادشاہ بیگم کو کہو۔ اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا۔ رو بہ قبلہ کھڑا ہوا خدا کو کہتا تھا۔

جمع الجمع

باغ و بہار میں "سلاطینوں" اور "اُمراؤں" یہ دو لفظ کئی جگہ آتے ہیں (اُن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں ایسے متعدد لفظ ہیں؛ اقرباؤں، اصحابوں، مشایخوں، نذورات، اشرافوں) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اُس زمانے میں اِس طرح مستعمل تھے۔

اِس کے برخلاف، جمع کو واحد کے طور پر بھی لایا گیا ہے: میں رئیس اور اکابر اِس شہر کا ہوں (گنجِ خوبی میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں: ایک اُمرا اُس گھڑی حاضر تھا۔ ایک اصحاب نے سوال کیا)۔

تذکیر و تانیث

پُرانے شاعروں اور نثر نگاروں کے یہاں اس سلسلے میں بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں اختلاف آج تک موجود ہے۔ باغ و بہار میں بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں جو آج ہم کو عجیب معلوم ہوں گی، مثلاً "شک"، "فانوس" اور "خلعت" کو اُنھوں نے بہ تانیث لکھا ہے۔ ایسے الفاظ یہ ہیں:

مذکّر: آرام، آنول نال، التماس، بہشت، ٹھیپ، جان و مال، جان و ایمان، جنم بھُم، چَین، دُلمیاں، راجا پرجا، رعیّت پرجا، رقم (جواہر)، سن و سال، شہر پناہ، قوّت، قند، لالچ، مینڈھ، ننگ و ناموس۔

مونّث: آئین، انند، تپ، حفظ و امان، خلعت، خُم، دو ہتّڑا، دھرا ہر،

ڈھارس، رمز، ساتھ سنگت، سنگھاسن، سانس، سنہاف، ٹھنک، عرضِ معروض، غور، فاتحہ، فانوس، فکر، گلاب پاش، مانند، ناوک، نقب، واویلا، ہَول۔

اختلافِ عدد و معدود

عدد جمع ہو اور معدود واحد، یا یہ کہ فعل واحد لایا جائے؛ قدما کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ باغ و بہار میں بھی یہ صورتیں نظر آتی ہیں، یہاں تک کہ ایک ہی جملے میں بعض صورتیں یک جا مل جاتی ہیں، مثلاً: پان سو اشرفی کے بدلے پان پان سے جوتیاں اِن کے سر پر لگاؤ یا ان دو جملوں کو دیکھیے: پان سے اشرفی انعام پاوے۔ پانچ سو اشرفیاں دلوادیں۔

اختلافِ عدد و معدود کی بس چند مثالیں اور: دو شخص کو، دو درویش کا احوال، چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا۔ ناگاہ دو جوان کو دیکھا۔ چاروں فقیر نے بھی دعا دی۔ اگر ہزار سوار آوے۔

اساتذۂ دہلی بہ طورِ عموم اِس اصول پر کار فرما رہے ہیں کہ اسمِ مذکر و مونث کی نسبت سے علامتِ مصدر "نا" بدلتی رہے گی۔ میر امن کے یہاں بھی یہ التزام ملتا ہے، مثلاً: دعا مانگنی، وظیفہ پڑھنا۔ صرف ایک جگہ "جلدی کرنا" آیا ہے: "جلدی کرنا اور اُن کے درمیاں مخل ہونا۔" غالباً قافیے کی رعایت نے یہاں یہ صورتِ حال پیدا کی ہے۔

سے، میں، کا، کی، کے، از، تو

ان کلمات کو جگہ جگہ جملوں میں اس طرح لایا گیا ہے کہ آج اس طرزِ استعمال میں اجنبی پن جھلکتا ہے، مثلاً:

سب علم سے ماہر ہوا، سوداگر بچے سے شادی کردی تھی، اپنے مطلب سے کام یاب ہوا، اِس سال کے گزرنے سے اِس کی امانت اس کے حوالے کردوں گا، کئی دن سے دھوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔

یا "مجھ سے" کی جگہ "مجھے" لانا، صرف ایک مثال: دونوں بھائیوں نے مجھے کہا۔

اب تو بھی جاکر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ، عذر مہمان داری کا کرکے اُس کے شامل نہ ہونا، مجلس کا شریک ہو۔

میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے، ہر سال میں ایک دفعہ، ایک کوٹھری میرے تحت میں کردی، گلے میں چمٹ گئی، خرید کرنے بازار میں گیا، نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا، میرے منہ میں جیسے کسو نے مہر دے دی۔

ایسے مرنے پر میں راضی ہوں۔ از برائے خدا یہ کیا مذکور ہے۔ میرے قبلہ گاہ نے میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے، تو تعلیم کامل ہر نوع کی پاکر۔

"اُس پاس"، "کس پاس"، جیسے ٹکڑے قدیم اساتذہ کے یہاں بالعموم ملتے ہیں اور اساتذۂ متوسطین کے یہاں بھی مثالیں مل جاتی ہیں، مثلاً غالب کی ایک رُباعی کا مصرع ہے: جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو۔ باغ و بہار میں بھی اس کی بہت سی مثالیں محفوظ ہیں، مثلاً: بادشاہ پاس لے چلوں، اُس پاس لے جاؤ، اِس فقیر پاس جو کچھ تھا، فقیر جوہری پاس گیا، بادشاہ پاس جاکر کہتا ہوں۔

مندرجۂ ذیل جملے میں، فارسی کے انداز پر "جب تلک" حرفِ نفی کے اضافے کے بغیر آیا ہے: "پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تلک وہ راضی ہوا۔"

یا جیسے "اِلّا" کو مع اضافۂ "نہ" لانا:

"والّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پائے گا"—— "والّا نہ، اپنے تو سامان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی"—— "والّا نہ، کسو بادشاہ کے ہاتھ نہ لگا۔"

"کتنی" اور "کتنے" کا استعمال: "کتنی کتابیں اُسی سال... تالیف ہوئیں" (یعنی کئی کتابیں یا بہت سی کتابیں)۔ "کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں رہا (یعنی برسوں تک)۔

اسی طرح "کوئی" اور "کئی": "کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر... نکل جاؤں" (یعنی چند روز میں، جلدی)۔ "کئی برس کے عرصے میں... یہ حالت ہوئی (یعنی چند ہی سال میں) —— اسی طرح: "کتنے دن پیچھے وہ مردِ بزرگ جاں بحق تسلیم ہوا" (یعنی کچھ دنوں کے بعد، کچھ مدت کے بعد)۔

اسی طرح "علاوہ" کا استعمال توجہ طلب ہے: "علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا"۔ "علاوہ اپنی تقصیر کی خجلت سے مُوا جاتا ہے" (اب ایسے مواقع پر "اِس کے علاوہ" کہتے ہیں)۔

—— یہ بیان وسعت طلب ہے ——

باغ و بہار کا جو متن میں نے اب مرتب کیا ہے اور جو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جلد شائع ہوگا، اُس کے مقدمے اور حواشی میں یہ بحث پوری تفصیل کے ساتھ آگئی ہے۔

ں صرف ضروری اجزا کا اجمالاً تعارف
یا گیا ہے، اس خیال سے کہ پڑھنے والوں،
ں کر اساتذہ اور طلبہ کی توجہ اس طرف
ملف ہوسکے۔

شی:

"نے" کا استعمال خاصی سیّال حالت میں رہا ہے اور بہت بعد تک اُس کے اثرات کارفرما رہے ہیں۔ انشا عہدِ میر امّن کے شاعر ہیں، اور مومن عہدِ غالب میں تھے؛ دونوں کے یہاں ایسی چند مثالیں:

غیر کے ملنے کا طعنہ جو دیا میں، تو کہا (کلامِ انشا، ص ۸) میں کہا، میں غلام ہوں، بولا (۱۳۵) ساتھ کے اپنے ہم صفیر جتنے تھے، سب نے رو دیا (۲۰۱)

رو دیا بے اختیار اُس شوخ نے تاثیر سے (مومن — دیوان مرتبہ ضیا احمد، ص ۲۴۷) دیکھ اشکِ لالہ گونِ رقیب اُس نے ہنس دیا (۱۰۷) رُو دیا اُس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر (۴۵)۔

- مثلاً: ہر کوچے میں سو جوانِ رعنا دیکھا۔ میر (کلیات، مرتبہ آسی، ص ۷۰۵) ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔
- داغ کے ایک شاگرد مہر گوالیاری کے دیوان "شعاعِ مہر" میں اُن کی ایک طرحی غزل کا مقطع ہے:

یہاں ہیں مہر! اہلِ لکھنو بھی، اہلِ دہلی بھی
یہ کہتے ہیں سحر ہوئی، وہ کہتے ہیں سحر ہونا
(شعاعِ مہر)

اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اس سلسلے میں جلال کا قول نقل کر کے لکھا ہے: "حضرت جلال کا یہ ادّعا بھی حقیقت سے بعید ہے کہ متاخرین فصحائے لکھنو مصدر کی شکل نہیں بدلتے۔ اُن کے ہم عصر امیر مینائی جہاں کہتے ہیں:

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کم سِن کے لیے

وہیں یہ بھی فرماتے ہیں:

بڑھا اِس قدر ہجر میں دردِ دل
مجھے سانس لینی بھی مشکل ہوئی

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے: مصدر کے بعد جو فعل آئے، اُس میں تغیر کیجیے گا یا علی حالہ رہنے دیجیے گا؟ مثلاً امیر مینائی کے مصرعے میں اگر "سانس لینا" پڑھیے گا تو اُس کے بعد "مشکل ہوا" کہیے گا یا "مشکل ہوئی"؟ ایسی جکڑ بندیاں کیوں اختیار کیجیے کہ سہولت کے بدلے پیچیدگیاں بڑھیں" (ص ۹۶)۔
امیر کے آخری شعر کے سلسلے میں یہ عرض کروں کہ یہ شعر ان کے دیوان "صنم خانۂ عشق" میں ہے (طبع اوّل ص ۲۰۴) اور دیوان میں "دردِ دل" کی جگہ "ضعفِ دل" ہے۔ پہلا شعر بھی اسی دیوان کا ہے (ص ۲۱۷) مگر دیوان میں "بھیجنا ہے" چھپا ہوا ہے۔ اسی دو غزلے میں یہ شعر بھی ہے:

جھانکتی ہے کون سے گُل کی نظر
بلبلیں پھرتی ہیں کیوں تنکے لیے
(ص ۲۱۸)

دیوانِ حالی

مولانا حالی کے دیوان کی یہ اشاعت ان لوگوں کے لیے ایک نئی بشارت کا حکم رکھتی ہے جو آج بھی یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عافیت آشوب زمانے میں غزلیہ شاعری کو حصولِ مسرت کا اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا بے مثال وسیلہ سمجھتے ہیں۔

مولانا حالی کے اس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصنافِ سخن بھی ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی ہے، اصل حیثیت غزلوں کی ہے اور یوں صحیح معنوں میں اس کو غزلوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔

دیوانِ حالی کا مقدمہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے جو حالی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور اُن کے فنی نظریات پر سیر حاصل روشنی ڈالتا ہے۔

مصنف: مولانا الطاف حسین حالی — صفحات: ۲۳۲
مقدمہ: رشید حسن خاں — قیمت: ۲۴ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

غزلیں

عنوان چشتی

ہو لہو جو مرا سر مجھے دکھائی دیا
خود اپنے ہاتھ میں پتھر مجھے دکھائی دیا

صیرتوں میں اضافہ ہوا نشاط کے بعد
شے میں رُوح کا منظر مجھے دکھائی دیا

زل سے ڈھونڈھتا ہوں، میں زمیں پر جس کو
ہ شخص خواب میں اکثر مجھے دکھائی دیا

تھیلی اُس کی ہے، لیکن لکیریں میری ہیں
کہ اُن میں اپنا مقدّر مجھے دکھائی دیا

خود اپنے دل میں چبھن سی جو کی کبھی محسوس
تو اُس کی آنکھ میں نشتر مجھے دکھائی دیا

بی۔ ۱۱۷، (اردو سماج) جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

○

گھر سے نکلا، تو سفر خاک ہوا
میں، سرِ راہگذر، خاک ہوا

فارغِ سود و زیاں ہیں اب لوگ
رشتۂ نفع و ضرر، خاک ہوا

شاخِ شعلہ تھا ہر اک دستِ دعا
سب، دعاؤں کا اثر، خاک ہوا

تھی تپش ناکیِ حالات، عجب
میں بھی سورج تھا، مگر خاک ہوا

کس قدر سخت تھا موسم، اب کے
سایہ در سایہ، شجر خاک ہوا

وہ تھا اک دشت، گزر کر اس سے
مجھ سمندر کا سفر، خاک ہوا

کس جگہ ڈالیے اب جا کے، پڑاؤ
خیمۂ شام و سحر، خاک ہوا

میری قسمت تو ہے، دشتِ ہجرت
کس کو یہ فکر، کہ گھر خاک ہوا

اے فضا بس یہ ہے روداد اپنی
حرفِ پامال، ہنر خاک ہوا

فضا ابنِ فیضی

جمال پورہ، مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

گوہر عثمانی

کبھی شعور، کبھی دل، کبھی سخن مہکے
وہ بات کہیے کہ دنیائے فکر و فن مہکے

دبی ہوئی ہے جو صدیوں سے غم کی چنگاری
بھڑک اُٹھے تو خیالوں کی انجمن مہکے

عطا ہمیں بھی جو ہو جائے میرؔ کا انداز
تو لفظ لفظ سے معنی کا پیرہن مہکے

لرزتے ہونٹوں کی وہ گفتگو تو یاد نہیں
بس اتنا یاد ہے برسوں لب و دہن مہکے

کبھی تو ایسا زمانہ بھی آئے اے گوہرؔ
محبتوں کی فضا سے مرا وطن مہکے

ماہ و انجم، نئی بستی، مرادآباد ۲۴۴۰۰۱ (یو۔پی)

اب کیا کیا جائے؟

نصر ملک

Vaerebrovej - 20/4-3, DK-2880,
Bagsvaerd, COPENHAGEN. DENMARK.

"میں کسی گاؤں سے تو اُٹھ کر نہیں آیا ہوں۔" اس کی بات میں بے شک وزن ہوتا تھا۔ تبھی تو اس کے سبھی ہموطن جو ڈنمارک میں رہتے اور اسے جانتے تھے نہ صرف اُسے "شہری بابو" کے نام سے پکارتے تھے بلکہ اس کی علمیت اور قابلیت کے بھی قائل تھے۔ عمر تو اس کی کوئی ہو گی انچاس برس لیکن اپنی جسمانی چستی، چہرے کی رومانیت اور پھر مسکرانے اور قہقہے لگانے کے انداز سے ہر کوئی اُسے تیس بتیس برس ہی کا خیال کرتا تھا اور اگر کسی جاننے والے نے کبھی اس سے اس کی عمر پوچھنے کی کوشش بھی کی تو اس کا جواب ایک ہی ہوتا تھا —— "عمر کا کیا ہے کچھ بھی ہو —— بھئی دراصل تجربہ ہوتا ہے تجربہ جو انسان کو بناتا ہے اس کی عمر نہیں!" اور پھر پوچھنے والا بالکل خاموش رہ جاتا ہے۔

دارالحکومت کوپن ہیگن کی اعلیٰ نائٹ کلبوں کی رکنیت اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس کے ہموطن جب بھی اس سے اس بارے میں پوچھتے کہ یہ اعزاز اُسے کیسے حاصل ہے اور وہ خود ان نائٹ کلبوں کے رُکن کیوں نہیں بن سکتے تو وہ ہمیشہ ہی قہقہہ لگا دیتا —— "میں کسی گاؤں سے تو اُٹھ کر نہیں آیا ہوں۔" اور پھر اس سے سوال کرنے والا اس کا ہموطن اپنا سا مُنہ لے کر سوچنے لگتا کہ یہاں ڈنمارک میں دیہاتی اور شہری ہونے کا فرق کیا مقامی لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے؟ عاصم واقعی دیہاتی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں کم از کم اس کے ایک دو جاننے والوں نے جو کچھ مجھے بتایا تھا اس کے مطابق وہ لاہور کے ایک تاجر پیشہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد نے اسے کالج کی تعلیم دلوانے کے بعد فوراً ہی لندن میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ دلوا کر لندن بھیج دیا تھا —— وہ وہاں ہوسٹل میں رہتا رہا تھا روپے پیسے کی اُسے کمی نہیں ہوتی تھی اور یوں اس کے برطانوی دوستوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اپنی تعلیم کے دوران، چھٹیوں کے دنوں میں وہ یورپ کے کئی شہروں کی سیر کر چکا تھا —— اس کے دوستوں کے مطابق وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ یہاں ڈنمارک میں ترسٹھ کے اُن دنوں میں گھوم گیا تھا جب یہاں کُھلی جنسی آزادی تھی اور عورتیں راہ چلتے غیر ملکیوں سے یوں چمٹ جایا کرتی تھیں گویا برسوں کی یاری ہو اور بعد مدت ملاقات کا موقع ملا ہو۔ عاصم سکینڈے نیویا میں اپنی پہلی "جنسی معرکہ بازی" کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا کرتا تھا: "ارے جانتے ہو ہم نے تب "ڈینش پیسٹری" کھائی جب تم ابھی یہاں کی "ڈبل روٹی" کے ذائقے سے تو کیا اس کی خوشبو سے بھی ناآشنا تھے۔" وہ کہا کرتا تھا اور پھر اس قصے کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ اپنی قمیص کے بٹن کھول دیا کرتا تھا —— "جانتے ہو کیا ہوا تھا؟" وہ خود ہی سوال کرتا اور پھر دوستوں کو خود ہی جواب بھی دینے لگتا۔

"میں اُن دنوں کیمبرج میں آخری سال کا طالب علم تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں نے یہ چھٹیاں سویڈن میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور پھر سٹاک ہالم آ گیا۔ سٹاک ہالم میں پہلی ہی شام میری ملاقات ایک ڈینش لڑکی سے ہو گئی —— شیلاٹے —— ہاں، شیلاٹے نام تھا اس کا —— واہ کیا حسن کی دیوی تھی —— شیلاٹے کارلسن۔ یہ نام تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا ہوں۔ شیلاٹے مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آ گئی تھی اور ہم دونوں رات گئے تک اِدھر اُدھر مختلف کلبوں میں آوارہ گردی کرتے رہے وہ بھی ڈنمارک سے سیر و تفریح کی غرض سے سٹاک ہالم گئی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے پاس شب گزارنے کے لیے ہوٹل وغیرہ نہیں اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ ساتھ ہی لگ گئی تھی۔ جب ہم اپنی آوارہ گردی سے ایک طرح تھک سے گئے تو میں نے اُسے اپنے ہاں مدعو کر لیا میں ینگ مین کرسچین ہوسٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ روپیہ میرے پاس کافی تھا۔ میں نے الگ ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ شیلاٹے نے پہلے تو کچھ انداز دکھائے پھر خود ہی اپنا سفری تھیلا سنبھالے میرے ساتھ

ہوں ـــــ اور پھر، دوستو! تم جانتے ہی ہو سمنا
کیسے تھا ـــــ بس مت پوچھو، سٹاک ہالم کی
رومانوی فضا، ینگ مین کرسچئین ہوسٹل کا آرام دہ
کمرہ۔ لندن سے لائی ہوئی میری شیواز ریگل وسکی کی
بوتل اور شیلاٹے کا قرب اور صبح کے تین بجے
ـــــ اس سے بہتر یوجا پاٹ کا وقت اور
کیا ہو سکتا تھا ـــــ بس دوستو میرے
دو ہفتوں کے قیام کے دوران میں اور شیلاٹے
ایک دوسرے میں سمائے رہے ـــــ اس
نے تو مجھے ڈنمارک آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن
یہاں تو میں پہلے بھی آچکا تھا ـــــ یار شیلاٹے
سے پہلے بھی میں ڈینش پیسٹری کھا چکا تھا۔ لیکن
جو مزہ شیلاٹے نے دیا واہ، کیا بتاؤں یار ـــ
وہ ایک دفتر میں ملازم تھی۔ اور چاہتی تھی کہ میں
کوپن ہیگن میں چلا آؤں اور اس سے شادی
کروں ـــــ لیکن یار تم نہیں جانتے کہ "چیز"
وہ کیا نام ہے اس کا ـــــ وہ "پنیر" ہاں، ہاں
پنیر اگر فوراً ہی کھا لیا جائے تو لذیذ اور مزیدار
ہوتا ہے لیکن کھلے بندوں اگر اُسے ہاتھ میں پکڑے
رکھیں تو بدبو دینے لگتا ہے۔ وہ لندن میں میرے
پاس آنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اور میں نے اُسے
ایک فرضی پتا لکھ کر دے دیا تھا۔ اور اُس نے بھی
کاغذ کے ایک پُرزے پر لپ اسٹک سے بھرے
اپنے حسین ہونٹوں سے ایک بوسہ دے کر اس
پر اپنا پتا لکھا اور مجھے دیتے ہوئے خط لکھنے کا وعدہ
لیا ـــــ " عاصم یہ کہتے ہوئے اپنا سینہ پھیلا دیتا
اور بالوں میں یوں انگلیاں پھیرنے لگتا جیسے
گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہا ہو ـــــ
" مجھے یاد ہے سٹاک ہالم ریلوے اسٹیشن پر جب
میں اسے خدا حافظ کہنے گیا تھا تو اس نے اپنے کیمرے
سے میری ایک دو نہیں تین تصویریں اُتاری تھیں
لیکن پتہ ہے میں نے کیا کیا؟ ـــــ گاڑی
چلتے ہی میں نے اس کے پتے والے کاغذ کے پُرزے
کو وہیں ریل گاڑی کی پٹڑی پر پھینک دیا تھا۔
میں پنیر کا یہ ٹکڑا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب
میں رکھ کر بدبو پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔" وہ کہا
کرتا تھا ـــــ " شیلاٹے مجھے خود سپینش سمجھ
بیٹھی تھی اور میں نے بھی اس کی خود اعتمادی کو
ٹھیس نہیں لگانی چاہی تھی۔ میں نے اسے بتایا
ہی نہیں تھا کہ میں پاکستان سے ہوں ـــــ
آخر یار سپین کے نام سے ہم مسلمانوں کو فائدہ
اٹھانے کا کچھ تو حق ہونا چاہیے کہ نہیں؟"
لندن میں اتنی زیادہ سہولتیں اور ایک
عالمی مالیاتی کمپنی میں اپنی اعلیٰ ملازمت چھوڑ کر
وہ ڈنمارک کیوں چلا گیا اور لاہور میں خود مختار
خاندانی کاروبار ہوتے ہوئے وہ وطن پاکستان
واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟ اس کے جاننے والے
دوست احباب اس موضوع پر جب بھی اس
سے گفتگو کرتے تو وہ اپنی دلیلوں سے انھیں
لاجواب کر دیتا ـــــ " یار لندن بے شک
کبھی لندن تھا لیکن اب تو اتنے ایشیائی آباد
ہو گئے ہیں کہ لندن، لندن نہیں رہا بلکہ لاہور
کا موچی گیٹ بن گیا ہے، لندن میں تم کسی بھی
اعلیٰ ملازمت سے منسلک کیوں نہ ہو ـــــ
گلیوں، بازاروں میں گھومتے ہوئے مقامی لوگ
تمھیں میر پور کا ویٹر ہی خیال کرتے ہیں ـــ "
وہ قہقہہ لگایا کرتا ـــــ " اور پھر یار وہاں جو
ایشیائی ہیں نا میں تو اُن کی حرکتوں سے تنگ آگیا
تھا۔ ایک مرتبہ اُن سے سرِ راہ ہی ملاقات ہو جائے
تو وہ تمھارا پورا شجرۂ نسب پوچھ لیتے ہیں اور پھر
دوسرے ہی دن وہ تمھارے گھر کے دروازے
کی گھنٹی بجا رہے ہوتے ہیں ـــــ " سلام علیکم
ادھر سے گزر رہے تھے سوچا آپ کو
سلام کر لوں ـــــ کل ملاقات ہوئی تھی آپ
سے ـــــ خوب رہی تھی۔" میں ان سلاموں
سے تنگ آچکا تھا ـــــ تبلیغی جماعت
والے جا رہے ہیں تو رفاہی چندہ اکٹھا کرنے
والے آ رہے ہیں ـــــ اور پاکستان! ـــ"
وہ آہ بھر کر رہ جاتا ـــــ " یار جس ملک میں ہر
پانچواں ترقیاتی منصوبہ پورا ہونے سے پہلے
مارشل لاء لگ جائے اور جہاں فوجی حکومت ہو
کہ عوامی راج، تین طرح کے قوانین ـــــ
مارشل لاء ـــــ شریعت، تعزیرات ہند مجریہ
ـــــ مغربی پاکستان اور انگریزی نظام
عدل ایک ساتھ عوام پر مسلط ہوں وہاں تم ہی
بتاؤ رہا جا سکتا ہے کیا؟"
عاصم کے ساتھ میری دوستی تھی اور نہ
علیک سلیک، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں
پہلی بار اُسے ندیم کے ہاں تب ملا تھا جب ندیم
نے اپنی سالگرہ منانے کے لیے اپنے گھر پر ایک
پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ عاصم اس پارٹی میں مجھے
دوسرے مہمانوں کی نسبت کچھ عجیب سا لگا تھا۔
وہ باتیں کرنے پر آتا تو بولتا چلا جاتا۔ اپنے لندن
کے دنوں کی باتیں۔ اپنے باپ کی املاک وجائیداد
کے تذکرے، لڑکیوں سے عشق و محبت کی وارداتوں
کے قصے۔ شراب کی مختلف قسموں کے نام اور
ان کے نشے کی تاثیر اور نجانے کیا کیا اور پھر
یک دم خاموش ـــــ "تکنیک ویدم" ـــــ
پہلے تو میں نے اسے محض سر پھرا جنونی سمجھا لیکن
جب اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے
اپنا ایک شناختی کارڈ نکال کر مجھے دکھایا تو مجھے
اس کی شخصیت اُس کے رویے اور کردار کے
متوازی نظر آنے لگی ـــــ وہ ایک مقامی

بنک میں شریک منیجر کے عہدے پر فائز تھا اور بے شک غیر ممالک میں کسی ایک پاکستانی کا اس عہدے پر پہنچنا بڑی بات تھی۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اس کے جاننے والوں نے اس کے متعلق جو قصے مشہور کر رکھے تھے وہ بالکل ہی غلط نہیں تھے۔ اعلیٰ نائٹ کلبوں کی رنگینیت، لڑکیوں پر بے تحاشا خرچ، گھر پر شباب و کباب اور رقص و سرود کی شبینہ محفلیں ایسے ہی تو منائی نہیں جا سکتی تھیں۔ یقیناً وہ اعلیٰ تنخواہ پاتا ہوگا۔ اور شادی شدہ تو وہ تھا نہیں جو گھریلو ضروریات اُسے فکرمند کرتیں۔ اور نہ ہی وہ ہم میں سے اکثر کی طرح گھر پاکستان میں ہر ماہ ایک چیک بھجوانے اور والدین یا بہن بھائیوں کی کفالت کرنے کا پابند تھا وہ تو ایک امیر تاجر خاندان سے تھا۔

عاصم سے میری اس پہلی ملاقات کے بعد، وہ مجھے ایک دو بار یونہی "واکنگ اسٹریٹ" میں چہل قدمی کرتا ملا۔ میں نے دیکھا کہ ہر بار اس کے ساتھ نئی لڑکی ہوتی تھی اور وہ ہر کسی سے بے خبر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے یوں گھوم رہا ہوتا تھا کہ بس وہ تو عشق کرنے کے لیے زمین پر اُتارا گیا ہو۔ اُس سے جب کہیں میرا سامنا ہوتا میں ہی اُسے ہیلو کہتا اور ہر بار مجھے ہی اُسے یاد دلانا پڑتا کہ "ہماری ملاقات ندیم کے ہاں ایک شام پارٹی میں ہوئی تھی۔" اور پھر وہ "ہاں مجھے کچھ یاد پڑتا ہے۔" کہتے ہوئے اپنی ساتھی کو بغل میں لیے "خدا حافظ ـــــ پھر ملیں گے۔" کہہ کر یوں آگے نکل جاتا گویا مجھ سے کنی کترا رہا ہو۔

پھر ایک شام اچانک میری عاصم سے ملاقات ہو گئی ـــــ میں ریلوے اسٹیشن کے کیفے ٹیریا سے نکل کر پلیٹ فارم کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے کسی نے روک لیا ـــــ "ارے میرے یار، کہاں ہوتے ہو تم؟.... کبھی دکھائی ہی نہیں دیتے" وہ میرے سامنے کھڑا ـــــ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا ـــــ نہیں وہ تو آج بغلگیری پر بھی تیار تھا ـــــ میں نے محسوس کیا کہ وہ قدرے نشے میں تھا اور اس کی نکٹائی بھی آج کچھ ڈھیلی بندھی ہوئی تھی۔ آج اس نے مجھے میرے نام سے پکارا تھا ـــــ "دیکھو شفقت! تمھیں آج کہیں اور نہیں جانا ہے ـــــ یہ دیکھو یہ شام کتنی سہانی ہے اور جب یہ رات میں ڈھلنے لگے گی تو دو آتشہ ہو جائے گی۔" وہ مسلسل بولے جا رہا تھا ـــــ "تم جانتے ہو جب زمانے میں رات ہوتی ہے تو کوپن ہیگن میں دن نکلتا ہے ـــــ یار شفقت کل "ویک اینڈ" ہے۔ تمھارے کون سے بچے ہیں یار آج تو تمھیں میرے ساتھ کلب چلنا ہوگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" عاصم ابھی تک مجھے اپنے بازوؤں میں دبائے ہوئے تھا۔ میرے لاکھ بہانوں اور انکار کے باوجود عاصم مجھے گھر جانے کے لیے چھوڑ نہیں رہا تھا اور اب تو وہ زور دینے لگا تھا کہ جس نائٹ کلب میں وہ مجھے ساتھ لیجانا چاہتا ہے وہاں اس نے ندیم کو بھی مدعو کر رکھا ہے ـــــ "وعدہ پکا تو نہیں... وہ آگیا تو آگیا۔" عاصم بولے جا رہا تھا ـــــ "تم نے "مون لائٹ کلب" کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ کسی غیر ملکی کو وہاں داخل نہیں ہونے دیا جاتا ـــــ وہاں کا منیجر اپنا یار ہے ـــــ تم چلو میرے ساتھ تمھیں مون لائٹ میں سورج کی کرن ملے گی۔" اور پھر وہ میرا بازو کھینچتا ہوا ایک طرح بڑی زبردستی سے مجھے ایک ٹیکسی کے اندر دھکیل رہا تھا۔ میں نے مزاحمت چھوڑ دی تھی اور دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ چلو اسی بہانے ندیم سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔

جب ہم دونوں کلب کے دروازے پر پہنچے تو ندیم وہاں پہلے سے کھڑا اپنی گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا ـــــ "ارے تم اسے بھی ساتھ لے آئے ہو ـــــ اچھا ہوا تمھیں معاف کرتا ہوں ورنہ تم پورا آدھ گھنٹہ دیر کر چکے ہو۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں کلب میں داخل ہونے لگے تو دروازے پر کھڑے سنہری وردی والے دربان نے کھلی مسکراہٹ سے عاصم کا استقبال کیا۔ "یہ آپ کے مہمان ہیں کیا؟" دربان نے میری اور ندیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عاصم کو آنکھ ماری اور پھر عاصم نے جب رسمی طور پر اس سے ہمارا تعارف کرایا تو اس نے بڑی عزت کے ساتھ دروازہ کھولتے ہوئے ہمارے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ـــــ "رات کی رعنائیاں آپ کی منتظر ہیں۔"

عاصم کے جلو میں ہم جب کلب کے اندر داخل ہوئے تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ واقعی اس کلب کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا وہ درست ہی تھا۔ یہ "راجا اِندر" کے محل سے کم نہیں تھا۔ رنگارنگ، نور برساتی روشنیاں اور ہاتھوں میں جام لیے مسکراتی آنکھوں اور قہقہے لگاتی، "انگ انگ سے ہم سا ہو تو سامنے آئے" کا بہ زبانِ خموشی دعوا کرتی ہوئی لڑکیاں ـــــ اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کلب کیا تھا گویا "پرستان کھل گیا" تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں فرش پر محوِ رقص تھے۔ موسیقی کی تانیں اپنے جوبن پر تھیں اور فضا طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ کچھ جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے ویسے ہی کھڑے، فرش پر رقص کرنے والوں کے انداز سے لطف اندوز ہوتے

ئے ٹانگیں ہلا رہے تھے اور کچھ تو ایک دوسرے
دیوں بوسے دے رہے تھے گویا انھوں نے ایک
دوسرے کے لبوں سے لب نہ اٹھانے کی قسم
کھا رکھی ہو۔ میں ابھی انہی نظاروں میں محو تھا کہ
ندیم اور عاصم آگے بڑھ کر ایک میز کے گرد بیٹھ
چکے تھے ــــ "آؤ یار، ادھر پہلے بیٹھو تو
سہی کیا دیدے پھاڑے دیکھ رہے ہو۔" ندیم
نے آواز دے کر مجھے چونکا دیا تھا۔

عاصم شراب لانے کے لیے اٹھا تو ــــ
ندیم نے مجھے کہنی ماری۔ "کیوں بے پارٹنر ــــ
ادھر کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"یار یہ عاصم پیچھے پڑ گیا تھا اور پھر اس نے
بتایا کہ تم بھی ہو گے اس لیے ــــ" میں ابھی
بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ عاصم شراب سے
بھرے تین گلاس ہاتھوں میں لیے واپس بھی آ گیا

"لو ــــ دوستو ــــ چیرز" اس نے
گلاس میز پر رکھ کر اپنا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے
منہ لگایا اور پھر ہمیں "چیرز" کہنے کا موقع دیے
بغیر ہی اس نے اپنا گلاس آدھا خالی کر دیا ــــ
"اور ہاں سنو! یہاں محتاط رہنا کہیں اپنا آپ نہ
بھاڑنے لگ جانا" وہ بڑی رازداری سے بولا

"تم جانتے ہی ہو ہم پاکستانیوں، ہندستانیوں
نے جو جو کرتوت یہاں کیے ہیں ــــ کوئی اب
اعتبار ہی نہیں کرتا ــــ بس ذرا محتاط رہنا
کچھ ہانکنا نہیں" وہ سرگوشی کرتے ہوئے ناصحانہ
انداز اپنائے ہوئے تھا ــــ "اور ہاں،
ندیم آج رات بس ہو جائے" وہ بولا اور میں ابھی
عاصم کے اس "ہو جائے" پر کچھ پوچھنے ہی والا تھا
کہ تین چار لڑکیاں ایک ساتھ ہماری میز کی طرف
بڑھیں اور ایک طرح سے عاصم پر آن گریں ــــ
"اے ــــ اسوم ــــ ڈانس نہیں کرو گے
کیا؟" ان میں سے ایک جو چست اسکرٹ پہنے
ہوئے تھی اس نے عاصم کے گلے میں باہیں ڈال
کر ایک طرح سے جھولنا شروع کر دیا۔ عاصم نے
ان سب کو بیٹھنے کے لیے کہا: "ہاں، ڈانس
بھی ہوگا۔ پہلے میرے دوستوں سے تو ملو" اس
نے ان میں سے ایک کی پیٹھ پر چپت لگاتے ہوئے
اسے ایک خالی کرسی پیش کر دی۔ اور اپنا گلاس
اٹھا کر خالی کر دیا ــــ "یہ سونیا ہے، سوئٹ
سونیا اور وہ نیلی آنکھوں والی بلی ــــ ماریا
اور وہ لورین ہے اور وہ ــــ عاصم چونکتی
لڑکی کو غالباً نہیں جانتا تھا یہ میرا اندازہ تھا
تبھی تو وہ سونیا کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اب وہ
کچھ جھول بھی رہا تھا ــــ "ہاں یہ . . . یہ
کارین ہے" ایک تھوڑے سے وقفے کے بعد
وہ خود ہی بول پڑا۔ جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو،
"اب تو تمھیں میرا نام بھی یاد نہیں ــــ ابھی
تو مہینہ بھی نہیں گزرا تم میرے جوتے میں شیمپین
ڈال کر پینے پر تیار ہو گئے تھے ــــ تمھیں کہ نہیں"
کارین کے اس انکشاف پر ایک بڑا قہقہہ پڑا
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ندیم ہم سب کے لیے وہسکی
خرید لایا ــــ ابھی ہم نے جام اٹھائے ہی
تھے کہ اچانک نہ جانے کدھر سے دو خوبصورت
لڑکیاں ہماری میز کے گرد آن کھڑی ہوئیں . .

"ہیلو ایوری باڈی" ان میں سے جس کے شانوں
سے نیچے کمر تک گرتے ہوتے لمبے سیاہ بال، گہری
نیلی آنکھیں تھیں، بولی۔ اس نے برائے نام
لباس پہن رکھا تھا۔ لباس کیا تھا بس بدن پر
چار گرہ کپڑے کی تہمت لگا رکھی تھی۔ اس نے
سونیا کے گال پر ایک گہرا بوسہ دیا ــــ

"اے کیلا تم ــــ پرتگال سے کب واپس
آئی ہو ــــ؟ اور یہ انیٹے تمھیں کہاں سے
مل گئی ــــ؟ آؤ ادھر بیٹھو!" اور پھر سونیا
نے ان دونوں کا ہم سب سے تعارف کرایا۔
عاصم اتنی دیر میں جا کر ہم سب کے لیے وہسکی لے
آیا تھا ــــ کیلا، عاصم کے بازو والی کرسی
پر بیٹھی تھی اور انیٹے میرے اور ندیم کے درمیان
والی کرسی پر ــــ "چیرز" سب نے اپنے اپنے
گلاس اٹھائے، لیکن میں نے دیکھا کہ کیلا نے
محض گلاس کو لبوں سے لگا کر میز پر رکھ دیا تھا۔
شاید اُسے اپنی بھڑکیلی لپ اسٹک کے اُتر جانے
کا خدشہ تھا۔ عاصم بھی اُسے تاڑ گیا تھا اور اب
ایک طرح سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ
لے رہا تھا۔ ندیم کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
ادھر کلب میں موسیقی کی ابھرتی ہوئی تانیں، فرش
پر رقص کرتی ہوئی لڑکیوں کے سینے کا ہچکولے کھانا
اور ان کی لمبی پنڈلیوں کا لپک لپک جانا اور لڑکوں
کا اپنے ہوش و حواس سے بے خبر ان لڑکیوں سے
بغلگیر ہوتے ہوئے ان میں سما جانے کی جستجو میں
ادھر اُدھر آنا جانا شروع تھا۔ اور ہماری میز پر
وہسکی کے گلاس اڑائے جا رہے تھے۔

عاصم جو ابھی تک کیلا پر نظریں جمائے
ہوئے تھا نجانے اُسے کیا سوجھی کہ اس نے کیلا کا
بازو تھامتے ہوئے اُسے کھینچ کر اپنے زانو پر بٹھا
لیا۔ وہ پہلے تو ہچکچائی اور پھر کسی مزاحمت کے بغیر
اس کی گود میں گر گئی۔ عاصم اس کے لمبے سیاہ
بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے پھیرتے اُسے اپنے
بازوؤں میں جکڑ چکا تھا۔ اور اب اس کے گالوں
پر بوسے دینے لگا تھا۔ ندیم نے میری طرف اور
میں نے ندیم کی طرف دیکھا ــــ "یہودی ہے"
ندیم نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اور پھر
بھرپور نگاہوں سے کیلا کی طرف دیکھا ــــ
"پھر تو عام زادی ہوئی" میں نے کہا۔ ندیم نے شاید

میری بات سُنی نہیں تھی اور اگر سُنی بھی تھی تو کیلا کے
حسن میں کھویا ہونے کی وجہ سے توجہ نہیں دے سکا
تھا۔

میں نے دیکھا کہ عاصم کچھ اس طرح کی
حرکتیں کرنے لگا تھا کہ ہمارے ساتھ بیٹھی ہوئی
لڑکیاں بھی ایک دوسری کو کنکھیوں سے دیکھنے
لگی تھیں ــــ "آ ــــ سُوم ــــ تم اپنی
رسم آج بھول گئے ہو کیا ــــ تمہاری وہسکی
کی پوری بوتل کدھر ہے؟ ــــ ابھی تک
نظر نہیں آئی!" کارین بولی اور پھر عاصم کی طرف
دیکھنے لگی ــــ "ارے، ہاں! وہسکی ــــ
وہسکی ملے گی اور پوری بوتل ملے گی ــــ میں
ذرا اس "کاک ٹیل" سے لطف لے رہا ہوں لیکن
تم تم سب کے لیے تو وہسکی آنی چاہیے" وہ بولا
ــــ وہ کافی بہکا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر اس
نے ویٹر کو پوری بوتل وہسکی لانے اور "لیڈیز"
کی خدمت کرنے کو کہتے ہوئے، کیلا کو اپنے ساتھ
یوں بھینچ لیا کہ بس ــــ "دیکھنا کانچ کی گڑیا
ٹوٹ نہ جائے" ندیم کہے بغیر نہ رہ سکا ــــ

کارین ــــ عاصم پر شاید نگاہ رکھے ہوئے
تھی اور اس کی حرکتوں کو گہری نگاہ سے دیکھ رہی
تھی۔ ویٹر ہماری میز پر وہسکی کی بوتل، برف
کی ڈلیاں اور سوڈا رکھ گیا تھا اور اب ہر کوئی
اپنی مدد آپ کرنے لگا تھا۔ پہلا جام عاصم ہی نے
بھرا اور پھر حلق سے یوں اندر گرایا گویا صدیوں
کا پیاسا ہو۔ لڑکیاں بھی اپنے جام اُٹھا رہی تھیں۔
اور کیلا بھی اب اس مے نوشی میں شامل ہو گئی
تھی اور، عاصم ــــ وہ تو اب شاید اپنے آپ
سے بھی بے خبر ہونے کو تھا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار
کر اپنی کرسی کی پشت پر لٹکا دیا تھا اور اب کیلا
کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا ــــ "سالا یہاں
کلب میں کیمبرج کا کوٹ پہن کر پتا نہیں لڑکیوں
کو کیا تاثر دیتا ہے" ندیم اپنے گلاس میں وہسکی
انڈیلتے ہوئے خود سے سرگوشی کے سے انداز
میں ہونٹ ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیلا تم کہاں کی ہو؟" ندیم کو جانے کیا
سوجھی کہ اس نے ایک طرح بے خودی میں کیلا
کی ایک ران پر ہاتھ مارتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"میں! ــــ میں ڈنمارک ہی کی ہوں"
وہ مشکل اپنا جام بھرتے ہوئے بولی ــــ عاصم
اسے مسلسل ہچکولے دیتا ہوا اپنے ساتھ بھینچ رہا
تھا۔

شاید وہ جاننا چاہتا ہے کہ تمہارا باپ
کہاں سے ہے؟ میں نے لقمہ دیا۔

"باپ! ــــ اُسے کیا پتا ہوگا ــــ
اپنے باپ کا ــــ جانتے نہیں ہو یہاں
ڈنمارک میں ہمارے جیسا نظام کہاں ہے جہاں
فلاں ابنِ فلاں اور فلاں بنتِ فلاں ہوتا ہے
اور ہر کوئی جانتا ہے کہ اس کا باپ ہی نہیں دادا
بلکہ پردادا بھی کون ہوتا ہے" عاصم بولے جا
رہا تھا ــــ اس پر اب نشہ اپنا اثر دکھا رہا
تھا۔ اور وہ بہت بہک بہک کر بول رہا تھا۔
اور اس کا لہجہ بھی کافی اکھڑا اکھڑا ہوا تھا۔

"ندیم یار تم بھی کیا گاؤں سے اُٹھ کر آئے ہو"
وہ ابھی تک بولے جا رہا تھا ــــ "کیا نہیں
جانتے ہو کہ یہاں ہر ڈینش کو ایک سول رجسٹریشن
نمبر الاٹ ہے۔ یہاں فرد کی شناخت اس کے
باپ سے نہیں اسی رجسٹریشن نمبر ــــ وہ کیا
ہوتا ہے شناختی کارڈ سے ہوتی ہے ــــ کیوں
کیلا؟"

کیلا شاید عاصم کی اس وضاحت پر
خوش نہیں تھی تو وہ اس کی گود سے اُٹھ کر
اپنی کرسی پر واپس بیٹھ گئی تھی ــــ

"تم نے کیا کہا تھا؟" کیلا نے اپنا پرس
میز پر رکھتے ہوئے ندیم کو متوجہ کیا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم نے
اپنے کالے لمبے بال کہاں سے چرا لئے ہیں" ندیم
اب مزاح پر اتر آیا تھا۔ لیکن کیلا شاید اب
سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"دیکھو ــــ تم عاصم کے دوست ہو،
تم مذاق بھی کرو تو کوئی بات نہیں لیکن کیلا بھی
میری سہیلی ہے ــــ کیلا کا باپ ضرور ہے
البتہ وہ جانتی نہیں کہ ہے کون؟" کارین نے کیلا
کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ترجمانی کی۔

"ہاں، ہاں! لیکن ــــ نادی م! میں
سے پوچھنا چاہوں گی کہ آخر تمہیں میرے باپ کا ہی
خیال کیوں آیا ــــ میری ماں بھی تو ہے ــــ
کیا میرے بال میری ماں کے بالوں جیسے نہیں
ہو سکتے ــــ" کیلا اب پہلو بدل کر ٹھیک
طرح سے بیٹھ چکی تھی اور اس نے عاصم کے ہاتھ
کو پرے جھٹک دیا تھا۔

"تم کرتی کیا ہو ــــ کیا ــــ؟" ندیم
اب شاید موضوع بدلنا چاہتا تھا۔

"یار دیکھتے نہیں ہو" عاصم بولا فی الحال
وہسکی پی رہی ہے رات کو شاید میرے ساتھ
رہے ــــ کیوں کیلا؟"

عاصم نے ایک بار پھر اس کے گلے میں
بازو ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے ندیم کو یوں
دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "کمبخت کام کی بات نہیں
کر سکتے ہو تو کیا خاموش بھی نہیں رہ سکتے ہو"

میں نے دیکھا کہ ہمارے ساتھ بیٹھی ہوئی
سونیا اور لورین اُٹھ کر دوسری چل دی تھیں۔
اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی

ہیں ۔۔۔ میں اُنھیں جاتا ہوا دیکھ ہی رہا تھا کہ کیلا بول پڑی ۔۔۔ "جانے دو انھیں یہاں بیٹھ کر وہ بور ہی تو ہو رہی تھیں ۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔ ندیم ۔۔۔!" وہ پھر ندیم سے مخاطب تھی۔

"میں کالج میں پڑھتی ہوں میرے ساتھ میرا ایک مسلمان ہم جماعت ہے ۔۔۔ 'مان سور' نام ہے اس کا ۔۔۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ تمھارے مذہب میں ہے کہ قیامت کے دن تمھارا خدا تمھیں ماں کے نام سے بلائے گا باپ کے نام سے نہیں پکارے گا ۔۔۔ ہے نا؟"

"ہاں، ہاں یہ تو ہے!" ندیم کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"تو پھر اس میں کیا ہے اگر مجھے میرے باپ کا پتہ نہیں کہ کون ہے۔" کیلا ترکی بہ ترکی بولی۔ "تمھارے تو خدا کو بھی پتہ نہیں کہ تم اپنی ماں کے خاوند کی ہی اولاد ہو یا کوئی اور تمھارا باپ ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے اپنا وہسکی کا گلاس خالی کیا اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ عاصم نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔۔۔ "ارے اپنی ماں کی بیٹی کہاں چلی ہو؟" وہ قدرے سنبھلا ہوا لگ رہا تھا

"ماں کی ہی نہیں میں اپنے باپ کی بھی بیٹی ہوں، کیا ہوا جو وہ میری ماں کو دھوکا دے گیا۔ وہ کچھ بھی ہے کہیں بھی ہے وہ ہے تو میرا باپ ہی نا ۔۔۔" کیلا اب جذباتی ہو رہی تھی۔ کچھ وہسکی کا اثر تھا اور کچھ شاید اس کے جذبات کہ اس کا چہرہ اب گلنار ہو رہا تھا ۔۔۔ ندیم کچھ پشیمان دکھائی دینے لگا تھا اور میں، کیلا کے اندرونی روحانی کرب کا اندازہ لگانے میں ناکامی پر وہسکی پی رہا تھا ۔۔۔ کارین، وہ اپنے ہی خیالوں میں گم صُم عاصم پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ میرے خیال میں اس پر وہسکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا ۔۔۔ عاصم ابھی تک کیلا کے گرد "پروانہ" بنا ہوا تھا۔ اور شاید مخمصے میں تھا کہ کارین اور کیلا میں سے کسے رکھے اور کسے چھوڑے ۔۔۔ اوپر سے نشہ اس پر پوری طرح چھایا ہوا تھا ۔۔۔ اب اس نے اپنی نکٹائی کی گرہ بھی کھولنی شروع کر دی تھی۔

"کیا اب گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرو گے؟" کارین، عاصم کو نکٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے دیکھ کر بولی

"ابھی مجھ پر وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی تو میری زندگی شروع ہونے والی ہے۔" عاصم نے بڑی گہری نظر سے کارین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنی نکٹائی اُتار کر میز پر رکھ دی۔

"بڑی خوبصورت ہے تمھاری نکٹائی۔" کیلا نے اُسے اُٹھا کر اپنے مرمریں بازو کے گرد لپیٹنا شروع کر دیا۔

"کیلا! یہ نکٹائی نہیں جو تم اپنے بازو کے گرد لپیٹ رہی ہو یہ سانپ ہے کالا سانپ اس سے بچنا ۔۔۔"

کارین غضبناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔ عاصم نے اس کی پروا ہی نہ کی۔ ندیم اور میں ویسے ہی خاموش اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کیلا ابھی تک نکٹائی کو اپنے بازو پر لپیٹنے میں لگی تھی۔

"ارے یہ مونوگرام کہاں کا ہے؟" وہ نکٹائی پر بنے مونوگرام پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عاصم کو متوجہ کر رہی تھی۔

"یہ ۔۔۔ یہ مونوگرام ۔۔۔ اس مونوگرام والی نکٹائی ایسے ہی نہیں مل جاتی ۔۔۔ کیا دیکھتی نہیں ہو یہ لندن کی کیمبرج یونیورسٹی کا "بیج" ہے ۔۔۔ کیمبرج یونیورسٹی کا ۔۔۔" عاصم ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا اور بات کرتے ہوئے اس کا سر میز پر جُھک جُھک جاتا تھا۔

"کیمبرج یونیورسٹی!" کیلا نے چونک کر کچھ یوں بلند آواز میں کہا کہ ندیم بھی متوجہ ہو گیا۔

"ہاں، عاصم کیمبرج سے فارغ التحصیل ہے۔ ۔۔۔ اسے کسی گاؤں سے اٹھ کر آتے ہوئے کی طرح مت سمجھو۔" ندیم نے کہا اور عاصم کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنے کیے پر داد کا طلب گار ہو لیکن عاصم، وہ تو ابھی تک ٹکٹکی لگائے کیلا کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کارین اور دوسری لڑکیوں کے چلے جانے کے بارے میں ابھی تک سوچ رہا تھا۔

"کیمبرج! او ہاں تو میرا باپ بھی پڑھتا رہا ہے۔" کیلا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی اور اپنے پرس کو کھول کر اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔

عاصم اپنی کرسی پر بمشکل اپنا توازن بحال رکھ رہا تھا اور کبھی دائیں تو کبھی بائیں طرف کو لڑھک جاتا تھا۔

"تم کیا ڈھونڈنے میں کھو گئی ہو؟" میں نے عاصم کی حالت دیکھتے ہوئے کیلا کو متوجہ کرنا چاہا۔

"ایک فوٹو ۔۔۔ اگر مل جائے تو۔" وہ بولی ۔۔۔ اس کی نیلی آنکھیں بھیگی ہوئی لگ رہی تھیں لیکن ان میں ایک طرح کی غیر مرئی چمک بھی تھی۔

"کیا تمھارے دوست کی فوٹو ہے؟" ندیم نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کیلا سے پوچھا۔

"دوست کی نہیں میرے باپ کی فوٹو ہے۔" کیلا نے یہ کہتے ہوئے ایک رنگین فوٹو پرس سے نکالی اور ندیم کی طرف بڑھا دی۔

"ارے شفقت یار، دیکھو تو سہی

یار یہ تو ہو بہو اپنا عاصم ہی لگ رہا ہے ـــــ صرف مونچھوں کی کمی ہے ـــــ شفقت!"

ندیم کی آواز میں کپکپاہٹ تھی "یار میں سچ کہہ رہا ہوں تم ـــــ دیکھو تو ـــــ" ندیم نے ابھی فوٹو میری طرف بڑھائی ہی تھی کہ عاصم نے اچانک سر اٹھا کر ہاتھ بڑھایا اور ندیم سے تصویر لے کر دیکھنے لگا ـــــ میں بھی گردن لمبی کیے تصویر پر جھکا ہوا تھا اور کیلا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا بول رہے ہیں ـــــ وہ قدرے جھنجلائی ہوئی تھی "تم کیا کر رہے ہو؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں یار عاصم یہ فوٹو تو بالکل تم سے ملتی ہے اور ارے دیکھو تو یہ کیمبرج کے بیج والا کوٹ اور نکٹائی بھی تو دکھائی دے رہی ہے ـــــ عاصم یار تمہارا کوٹ ـــــ ذرا پیچھے تو ہٹو ـــــ" ندیم نے عاصم کی کرسی کی پشت پر لٹکے ہوئے اس کے کوٹ کو اتارنا چاہا تو عاصم یک دم اپنی کرسی سے ایک طرف کو فرش پر لڑھک گیا ـــــ فوٹو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ندیم اور میں نے اُسے اٹھانا چاہا ـــــ "شاید آج زیادہ پی گیا ہے۔" ندیم نے اُسے اٹھانے کی ناکام کوشش کی۔

کیلا نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کی بجانے کونسی رگ دبائی کہ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں ایک طرح سے کھلی ہوئی تو تھیں لیکن ان میں حرکت نہیں تھی۔ ـــــ کیلا چیخ رہی تھی "ایمبولینس ـــــ ایمبولینس ـــــ ایمبولینس بلاؤ ـــــ اِسے دل کا دورہ پڑا ہے شاید ـــــ" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً کلب میں موسیقی کی تانیں خاموش ہو گئیں اور رنگ و نور کے قمقمے بجھ گئے ـــــ رقص کرتے ہوئے لڑکے لڑکیاں جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ کلب کے باہر ایمبولینس کے ہنگامی ہارن کی آواز سنائی دے رہی تھی ـــــ طبّی عملے کے دو کارکن اندر آئے اور بڑی پھرتی سے عاصم کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر باہر لے گئے۔ ـــــ ایمبولینس کے دور جاتے ہوئے ہارن کی آواز بند ہو گئی تھی۔

میں نے فرش پر پڑی ہوئی فوٹو کو اٹھا کر غور سے دیکھا تو اس میں ایک نوجوان، نیلا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جس کی بیرونی جیب پر کیمبرج کا بیج بھی تھا اس کی نکٹائی پر بھی بیج دکھائی دے رہا تھا ـــــ تصویر میں ـــــ "شاک ہام ریلوے اسٹیشن" کے نام کی تختی واضح دکھائی دے رہی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟" میں نے ندیم سے پوچھا ـــــ "یہ تصویر تو عاصم کی ہی ہے"!

"اب کیا کیا جائے!" وہ جھنجلاتے ہوئے بولا ـــــ "یہ تو اپنی ہی بیٹی ہے۔"

کیلا جو ابھی تک حیران و پریشان کھڑی تھی اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے فوٹو چھینی اور اپنا پرس سنبھالتے ہوئے کلب کے دروازے کی طرف چلدی ـــــ ندیم، عاصم کا کوٹ اور نکٹائی سنبھال رہا تھا۔

دوسرے دن صبح مجھے ندیم کا فون آیا۔ ـــــ "یار شفقت! اوہ ـــــ عاصم مر گیا ہے۔" ندیم بول رہا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی ـــــ "لیکن یار کیلا کا باپ ـــــ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اسپین سے تھا ـــــ" اب میں بھلا ندیم کو کیسے سمجھاتا کہ عاصم نے کیلا کی ماں سے جھوٹ کیوں بولا تھا ـــــ کیا ندیم نہیں جانتا تھا کہ عاصم کوئی گاؤں سے اُٹھ کر تھوڑا ہی آیا ہوا تھا۔

شاہد میر

حمد

گونجی کہیں پڑوس میں بھور کی پہلی اذان
نیند پجاری کی کھلی یاد آیا بھگوان

شبد کیرتن کر رہا چڑیوں کا اک غول
بھرا خدا کے نور سے دھرتی کا ماحول

نعت

پڑھے لتا منگیشکر جب بھی نعتِ پاک
دل میں اُبھرے روشنی آنکھوں میں ادراک

شہرِ مدینہ کی طرف جس کی اُٹھی نگاہ
صحرا دیتا ہے اُسے خود چلنے کی راہ

○

لہو کے دریا میں ہے دِل دِل میں پیار کے راگ
پانی میں پتھر چھپا پتھر میں ہے آگ

بھٹک رہے ہیں در بدر زرد نہتے لوگ
آندھی میں اُڑتے ہوئے پیلے پتے لوگ

آنسو پیتے ہیں مگر پھر بھی خوش ہیں لوگ
چہروں سے ظاہر کہاں ان کے من کے روگ

پیشانی پر درج ہے اُن کی ایک نشان
بیچ رہے بازار میں جو اپنا ایمان

ہم نے بھی سنسار سے مانگے تھے کچھ پھول
گھیرے ہیں اب جسم کو کانٹوں بھرے ببول

دریا میں ہے خامشی ساحل پر طوفان
راہوں میں آرام ہے منزل پر طوفان

ذہن چلے بس دو قدم دل دوڑے سو میل
نازک جذبوں کی بھلا کیسے ہو ترسیل

کہاں سنہری روشنی کہاں سہانی بھور
سورج سے پہلے اُگا میرے گھر میں شور

بے مصرف ثابت ہوئی اپنی ہنسی اور چیخ
سیدھے سادے لوگ ہم بن نہ سکے تاریخ

ہریالی ہے جس قدر لے جائے گا چھین
پنکھ پسارے کھڑا ہوا موسم کا شاہین

ڈوبا سورج، ہر طرف گھر آئی پھر سانجھ
گود بھری آکاش کی دھرتی ہو گئی بانجھ

فقط سلاموں سے رہا اُس کا گھر آباد
پھٹے حال جیتا رہا اک بوڑھا اُستاد

شاہد احساسات کے دھاگے بڑے مہین
بُنیے سوچ بچار کے دوہوں کا قالین

گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ ۳۲۷۰۰۱ (راجستھان)

عصمت آپا

فیّاض رفعت
آل انڈیا ریڈیو، چرچ گیٹ، بمبئی

تقسیم وطن سے قبل جن افسانہ نگاروں کے مقام اور مرتبے کا تعین ہو چکا تھا۔ ان میں سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ممتاز شیریں اور عصمت چغتائی کے نام نہایت اہم اور ممتاز ہیں۔ اور ان سبھی افسانہ نگاروں نے "انگارے" کے فنکاروں سے فیض حاصل کیا تھا۔ جن میں احمد علی، سجاد ظہیر اور رشید جہاں نے بالخصوص ترقی پسند افسانے کو ایک نئی جہت اور نئی سمت دی۔ ان کے یہاں ایک خاص طرح کی تلخی اور زہرناکی تھی۔ ان کا بنیادی مقصد سماج کی فرسودہ بناوٹی قدروں پر وار کرنا تھا۔

عصمت آپا نے اردو کہانی کے ان معماروں سے کردار نگاری اور شخصیت سازی کا فن تو سیکھا ہی ساتھ ہی ساتھ ان کی کرافٹ (CRAFT) کو بھی اپنی روح میں اُتارا۔ مگر انھوں نے اپنی فن کی چھینی سے جو بُت تراشے ان کا رنگ رُوپ جداگانہ تھا۔ زندگی کے جن کرداروں کو انھوں نے منتخب کیا۔ وہ بظاہر عمومی اور غیر اہم کردار تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کرداروں کے اندروں میں حزن و ملال محرومی و تشنہ کامی کی ایک ایسی دنیا آباد تھی جو قاری کے ذہن و دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتی ہے۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اسی محرومی اور تشنہ کامی نے عصمت آپا کی سائیکی کو بے حد متاثر کیا تھا — جہاں تک اظہار کے سانچوں کا سوال ہے عصمت آپا کی بولی ٹھولی ان کا محاورہ اپنے ہمعصر کہانی کاروں سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ کہیں کہیں بہت زیادہ بولڈ بھی تھا۔ ان کے کردار جو زبان بولتے ہیں وہ ان کی فطری زبان ہے۔ جسے تراشنے خراشنے کا کام ایک ماہر فنکار نے کیا ہے جو ان کا مزاج آشنا ہی نہیں رمز شناس بھی ہے۔ جس نے گہرائی تک ان کی روح میں جھانک کر دیکھا ہے۔

مغربی یو۔ پی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان کو عصمت آپا نے اپنے افسانے کا میڈیم بنایا۔ اس زبان کا بنیادی خمیر گنگا جمنی تہذیب سے اُٹھا تھا۔ اس زبان میں جو افسانوی مکالمہ تخلیق کیا گیا اس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا ٹھسّہ تھا۔ یہ کہا جانا اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ساقی کے شاہد احمد دہلوی نے عصمت آپا کے افسانوی محاورے کو زندگی کی تابانی اور روشنی بخشی تھی اور پھر گھر میں عظیم بیگ چغتائی تھے۔ ان کے بڑے بھائی جن کا ناول "شریر بیوی" متوسط طبقوں میں آرائشِ محفل کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

عصمت آپا کو باغی ذہن اُن کے گھر سے ملا۔ سماج میں رائج بوسیدہ قدروں نے عورت کو پیر کی جوتی سے زیادہ لائقِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ مرد کی غلامی اس کا مقدر قرار دی گئی تھی۔ اُسے ستر پردوں میں قید رکھا جاتا تھا اور اس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عہدِ وسطیٰ کی اس خام کار گندی ذہنیت کو آشکارا کرنے کے لیے عصمت آپا نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور مردوں کی بالادستی کے پرخچے اُڑا کے رکھ دیے۔ عصمت آپا نے ایسے باغی نسوانی کردار خلق کیے جو تابعداری اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے بیچ صدیوں سے جاری اس آویزش۔ اس تصادم اور ٹکراؤ کی فضا میں عصمت کی عورت مغلوب نہیں ہونا چاہتی۔ عصمت آپا کے کردار ٹائپ (TYPE) کردار نہیں۔ وہ شخصیت کے کسی ایک سانچے میں قید نہیں۔ ان کرداروں کو اپنی پیوند کاری سے بھی گریز ہے۔ یہ فطری کردار ہیں۔ جو زمانے کی آندھیوں کے باوجود کسی ایک مخصوص فریم میں ڈھلنا نہیں چاہتے۔ وہ کائنات کی آزاد فضاؤں میں اپنی ایک نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ انھیں جس جنّت کی تلاش ہے وہ ان کی شخصیت کے اندروں میں اُگی اور پروان چڑھی ہے۔ ساختیاتی اعتبار سے عصمت آپا کے کرداروں کا ڈھانچہ عمومی ہو سکتا ہے۔ مگر ان کے باطن کی تعمیر و تخلیق باغیانہ روش پر ہوئی ہے۔ یہ آئیڈیل کردار نہیں جو روایتی اردو فکشن کا مزاج رہے ہیں۔ ان کی تخریب ہی میں ان کی تعمیر

کا پہلو مضمر ہے۔ بقول وزیر آغا عصمت کے کرداروں کی بنیادی جہت کو لیجیے جو ایک طرح کی بغاوت توڑ پھوڑ یا کم از کم ایک ـــــ منضبط سماجی یا نفسیاتی پیٹرن (PATTERN) سے انحراف کی صورت ہے۔

عصمت آپا اپنی اصل زندگی میں بھی اظہار و ابلاغ کی حد تک ایک باغی خاتون تھیں۔ وہ مرد کے تابع نہیں رہنا چاہتیں۔ وہ مرد کو اپنے سے اعلا وارفع تو خیر کبھی مانتی ہی نہیں تھیں۔ موقع ملتے ہی وہ اس کی تذلیل پر بھی اُتر آتی تھیں۔

جولائی ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ راجندر سنگھ بیدی صاحب فراش تھے۔ میں نے عصمت آپا سے عرض کیا "چلیے بیدی صاحب کی طبیعت پوچھ آئیں۔ کچھ باتیں بھی کرلیں گے۔" فوراً تیار ہوگئیں۔ بیدی صاحب اپنی شدید علالت کے باوجود بے حد محبت اور گرمجوشی سے ملے۔ عصمت آپا نے بات شروع کی۔ بیدی کی کہانیوں پر بات آئی تو عصمت آپا نے ایک سوال اٹھایا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ بیدی کے افسانے میں عورت کا کردار زیادہ قوی اور طاقتور کیوں ہے۔ بیدی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا ــــــ "عورت کا استحصال ہوا ہے اُسے کچلا اور دبایا گیا ہے۔ وہ ظلم سہتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ مرد کی خوشی کے لیے اُسے اپنا جسم دیتی ہے۔ اس کے بچوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ جھڑکیاں کھا کر بھی اُس کی دلجوئی کرتی ہے۔ . . .

عصمت آپا نے بیدی کی بات کو بیچ سے لپک لیا۔

"مرد کا کردار تو ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ کوکھ ہری کرنے سے مرد بڑا کہاں ہوتا ہے۔ تخلیق کا کام تو عورت کرتی ہے۔ پیٹ میں بچہ کسی کا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بڑی بات تو بچے کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھنا ہے۔"

"عورت کو بڑا میں بھی مانتا ہوں۔ پر اس کی تکمیل مرد کے بغیر ممکن نہیں۔"

"ارے چھوڑو بیدی۔ یہ کیا لے کر بیٹھ گئے عورت ہر اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہے اور مرد کی حیثیت محض اور محض ضمنی ہے۔"

یہ مکالمہ ضبط تحریر میں لانے کا مقصد محض یہ ہے کہ عصمت آپا کی شخصیت اپنی تمامتر انفرادیتوں کے باوجود کہیں کہیں سے مجروح اور ناآسودہ شخصیت تھی۔ شاید اسی پس منظر میں اپنی تشنہ کام محروم و محزون شخصیت کے ادھورے پن کی تکمیل کے لیے متوسط طبقے کی عورت کی کچلی ہوئی شکست خوردہ شخصیت کو توانائی عطا کرنے کی خاطر ایسے ٹیڑھے میڑھے کردار تراشے جن کی بنیادی پہچان اُن کی جنوں خیزی اور ابنارملٹی (ABNORMALITY) بن جاتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر یہ کردار اپنی مفروضہ انا پسندی کی تسکین کے لیے کسی بھی ڈرامائی سچویشن کو جنم دینے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فنکار کی شخصیت کی پیچیدگی اُسے فنی تجربوں کے پُل صراط سے گزارتی ہے اور وہ مکمل حقیقت کو پانے کی جستجو میں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے کہ اس طور اس کی آدھی ادھوری شخصیت کی تکمیل بھلے نہ ہو پائے تسکین ضرور ہوتی رہتی ہے۔

عصمت آپا اپنے ڈرامے "فسادی" سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئیں۔ ان کا یہ ڈرامہ ۱۹۳۹ء میں "ساقی" دلی میں شائع ہوا تھا ۱۹۳۹ء میں جس فساد کی بنیاد انھوں نے ڈالی تھی۔ اُس کی چنگاریاں مرتے دم تک پُرتصنع سماج کی زبوں حال قدروں کو خس و خاشاک کی طرح جلاتی رہیں۔ ان کا ناولٹ "ضدی" بھی ان کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" ان کا ایک اور ناول ہے جس سے عصمت آپا کی ٹیڑھی شخصیت مترشح ہوتی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی پر ان کا خاکہ "دوزخی" اپنی بے باک شگفتگی اور سفاک بیانی کے لیے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اسی طور ان کی شہرہ بار کہانیاں "لحاف"۔ "چوتھی کا جوڑا" "ننھی کی نانی" "گیندا" "امربیل" اُردو قاری کو خواب میں بھی چونکاتی رہیں گی۔

عصمت آپا اپنے آپ میں انجمن بھی تھیں۔ اور انجمن ساز بھی۔ بے حد محبت کرنے والی خاتون جو نئے پرانے سبھی طرح کے ادیبوں، شاعروں کی دلنواز دوست اور رفیق تھیں۔ شاہد لطیف کی زندگی تک عصمت آپا کی ادبی محفلوں میں کرشن۔ بیدی۔ مجروح۔ سردار جعفری۔ کیفی۔ شیام کشن نگم۔ ساحر۔ غلام رسول رنسرو اور رام اور ننگا باد کر شامل ہوتے رہے ـــــ

ابھی گزشتہ برس تک وہ خوب چونچال تھیں۔ ادبی اجتماعات میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ ریڈیو اسٹیشن بھی چلی آتی تھیں۔

گزشتہ سال انھیں مدھیہ پردیش سرکار نے "اقبال سمان" سے نوازا تو بھوپال گئی تھیں۔ میں اُن دنوں وہیں تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے اُنھیں انٹرویو کے لیے مدعو کیا گیا۔ سلطانہ جعفری اور شفیقہ فرحت کی معیت میں تشریف لائیں ایک غیر رسمی گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ عصمت آپا اپنے اسٹائل میں ہنستی بولتی رہیں اور مُردذات کو گالیاں دیتی رہیں۔ غالباً ریڈیو پر یہ اُن کی آخری بات چیت تھی۔

بمبئی پوسٹنگ ہونے کی میں نے اُنھیں ٹیلیفون پر اطلاع دی۔ کھنک دار آواز میں بولیں۔ "میں تو گھر پر ہی رہتی ہوں کبھی بھی گھر پر آجاؤ۔ میں نے عرض کیا: "مجھے پہچانا بھی یا نہیں؟" کہنے لگیں: "لو میں اور تمھیں نہیں پہچانوں گی۔ اپنے رفعت سروش ہو نا۔" میں بھی ہنستا رہا۔ میں نے تردید نہیں کی اور فون رکھ دیا ــــــ کسے پتہ تھا کہ یہ اُن سے آخری گفتگو ہے۔ مرتے وقت عصمت آپا کی عمر تقریباً اسّی برس تھی۔ ان کی آخری وصیت کے مطابق انھیں نذرِ آتش کیا گیا کہ یہ بھی اپنے آپ میں ایک جداگانہ روش تھی۔

غزلیں

عقیل شاداب

زخم سے جب گفتگو کی
آنے لگی تازہ لہو کی

ستہ آئینے اور مسخ چہرے
، حالت ہے شہرِ آرزو کی

ے روح تک ہے پارہ پارہ
ہے اب کوئی حاجت رفو کی

ڑی دشمنی تا عمر لیکن
ک دوسرے سے بدسلو کی

اتنی بات پر تھا حشر برپا
اُس کی اُس کے روبرو کی

ں کا اور وہ میرا آئینہ تھا
س طرح کرتا عدو کی

شاداب جب دل کو کچو کا
زل تخلیق ہونے سے نہ چو کی

برج پورہ، کوٹہ، ۳۲۴۰۰۰۲ (راجستھان)

جستجوئے گوہرِ نایاب ہے اپنے لیے
زندگی اِک نامکمل خواب ہے اپنے لیے

چین سے سوتے اگر کانٹے بچھا دیتا کوئی
غیر موزوں بسترِ کمخاب ہے اپنے لیے

ہم نے جذبوں کی عقیدت میں گزاری زندگی
دل ہے کعبہ عشق اک محراب ہے اپنے لیے

ہم بھی اپنے درد کا احساس کر دیں گے رقم
آنے والی نسل کا اک باب ہے اپنے لیے

اشکؔ اتنے پُرخطر ہیں زندگی کے راستے
اِک گیا تو دوسرا سیلاب ہے اپنے لیے

ابراہیم اشکؔ

۲۴۳، سائی نواس، شانتی نگر، سی۔ ایس۔ ٹی۔ روڈ، کرلا ڈپو، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

اوم پرکاش لاغرؔ

کچھ اُدھر ان کا تکلّف درمیاں
ہیں اِدھر اپنی بھی کچھ مجبوریاں

کیوں چمن سے ہے گریزاں فصلِ گُل
ہوں گی کچھ نظمِ چمن میں خامیاں

عاشقِ گُل! تو مسافر بھی تو ہے
چھوڑنا ہے تجھ کو اِک دِن گلستاں

کم نہیں ویرانہ آبادی سے کچھ
کل یہاں تھیں، کل بھی ہوں گی بستیاں

کیا لگیں گے اس میں پھر شیریں ثمر
جس شجر کے تخم میں ہوں تلخیاں

کیا کرو ہو اب تم اس کا تذکرہ
عہدِ رفتہ کی ہے لاغرؔ داستاں

۱۷۔ بی، نہرو گراؤنڈ، نزد پنجاب نیشنل بینک، این۔ آئی۔ ٹی۔ فرید آباد ۱۲۱۰۰۱

ایک پُرانی کہانی

دیش چترکار
EA/72 - اِندرپوری نئی دہلی ۱۱۰۰۱۲

ایک وسیع اور شاندار کوٹھی کے کشادہ احاطے میں آج خوب گہما گہمی ہے۔ بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہوئے جدید ترین طریقے سے آراستہ لمبے چوڑے شامیانے کے نیچے شہر کی معزز ہستیاں ڈاکٹر، وکلا، صنعت کار، مصنفین اور جرنلسٹ سبھی یہاں آج ایک ساتھ اکٹھا ہوئے ہیں تقریب ہے جہاں شیام سُندر عادل کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرنے کی، اُن کی عمرِ دراز کے ۷۵ ویں جنم دن پر ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی کی گولڈن جوبلی منانے کی بھی۔

شیام سندر عادل ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے ایک اعلیٰ درجے کے وکیل اور انصاف پسند انسان رہے ہیں اور اس کے علاوہ ایک شہرۂ آفاق افسانہ نگار بھی ہیں۔ سرکاری عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد آج کل غریب غربا اور بے سہارا لوگوں کی بے لوث مدد کرنا اور بوقت ضرورت انھیں مفت قانونی مشورہ اور امداد بہم پہنچانا نیز ادبی خدمات کی انجام دہی ان کی روزمرّہ زندگی کی مصروفیات اور مشاغل بن چکے ہیں۔

شیام سندر عادل کی ذاتی حیثیت اور ہردلعزیزی کے علاوہ ان کا اکلوتا لڑکا ستیش چندر آئی۔ اے۔ ایس بھی مرکزی سرکار کے تحت ایک اعلیٰ عہدے پر مامور ہے۔ اسی لیے آج شام کی تقریب میں اس کے سرکاری سرکل کے عہدے داران بھی بمعہ اپنی بیگمات موجود ہیں۔ ماضی قریب اور جدید فیشن پر مبنی طرح طرح کی تراشوں کی رنگارنگ پوشاکیں اور ملبوسات زیب تن کیے ہوئے مختلف سن اور جنس کے افراد کے اجتماع نے تقریب کی فضا کو ایک دلفریب رنگینی اور رونق عطا کردی ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا رنگ و نور کا ایک سرچشمہ رواں دواں ہو۔

تقریب کا محرک بھی ستیش چندر ہے۔ والد نے بار بار یہ کہہ کر روکا بھی کہ بیٹا، اب اِن بوڑھی اور چرمراتی ہوئی ہڈیوں میں رکھا ہی کیا ہے جن کی خاطر اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کرنے پر آمادہ ہو۔ ہماری زندگی کی شام میں تم صبحِ نو کا سورج جگانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تو کہوں گا کہ یہ سب کچھ زیبا نہیں دیتا۔ لیکن ستیش تھا کہ کچھ سُننے کو تیار نہ تھا۔ بولا۔

"پتا جی! آپ کو اس میں کیا پریشانی ہے بلکہ یہ تو آپ خود ہی اکثر کہا کرتے ہیں کہ انسان اصل میں جسمانی طور پر اتنا نہیں بلکہ دل و دماغ کے اعتبار سے بوڑھا ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً عام ڈگر سے ہٹ کر خوشی اور موج منانے سے زندگی کو مزید جوش و خروش کے ساتھ جینے کی ترغیب ملتی ہے۔ پھر آج کا دن کتنے خوش نصیب بیٹوں کو نصیب ہوتا ہے۔ میں تو بھگوان سے یہی دُعا کروں گا کہ اس قسم کی تقریبات کا اہتمام ہم بار بار کرتے رہیں۔ نہ معلوم کیوں ممّی کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن میرے مسلسل اصرار پر آخر وہ رضامند ہوگئیں۔ آپ سے بھی میری درخواست ہے کہ آپ میری التجا کو قبول کرلیں۔"

بیٹے کے اس طرح کے پُراثر اصرار نے عادل صاحب کو لاجواب کردیا۔

"اچھا جیسی تمہاری مرضی۔" کہہ کر عادل صاحب چُپ ہوگئے اور بیٹے نے ایک شاندار ڈنر کا اہتمام کر ڈالا۔

○

مہمانوں کی گہما گہمی کے دوران عادل صاحب اور ان کی اہلیہ ایک خوبصورت صوفے پر براجمان ہیں۔ موقع اور تقریب کی نوعیت کے مطابق رشتے دار اور مہمان ان کے پاس آکر مبارکباد تو دیتے ہی ہیں ساتھ ساتھ خوبصورت گلدستے اور تحائف بھی پیش کرتے جا رہے ہیں۔

جبھی ستیش کے ہمراہ چند مہمانِ خصوصی عادل صاحب اور ان کی رفیقۂ حیات کو اس مقصد کے لیے خاص طور پر سجائے گئے اسٹیج نما ڈائس پر کھڑے ہونے کی دعوت دے کر پھولوں کے بڑے بڑے ہاروں سے انھیں لاد دیتے ہیں۔ جس کی تائید میں فضا حاضرین کی

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھتی ہے۔

اس پذیرائی سے متاثر ہو کر نہ معلوم کیوں عادل صاحب چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ قریب ہی رکھے ہوئے مائیکروفون کی طرف بڑھ آتے ہیں۔ اور لاغر لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہیں۔

"لیڈیز اینڈ جینٹلمین! یعنی ہمارے معزز مہمانو، عزیز و اقارب، دوستو اور ہمنواؤ! ہماری ازدواجی زندگی یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری شادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر جس پرخلوص انداز سے ہماری عزت افزائی کی گئی ہے اور مبارکباد سے ہم دونوں کو نوازا گیا ہے اس کے لیے ہم آپ کے تہ دل سے شکر گزار ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کرتے ہوئے جتنے بھی شادی شدہ جوڑے اس موقعے پر موجود ہیں ان کی زندگی بھی خوش حالی اور مسرتوں سے معمور رہے۔۔۔"

یہ کہہ کر عادل صاحب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے الفاظ کو سنتے ہی تقریب میں شریک زندگی کی منازل کے مختلف پڑاؤوں پر پہنچے ہوئے شادی شدہ جوڑے اپنے اپنے رفیق یا رفیقۂ حیات کی جانب پرامید اور مسرت خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ جونہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ مدھم ہونے لگتی ہے عادل صاحب کی آواز ایک بار پھر فضا میں ابھرتی ہے۔

"معزز حاضرین! نہ چاہتے ہوئے بھی اس موقعے کی پرخلوص حرارت سے محظوظ ہو کر میں آپ کے سامنے اپنی ذاتی زندگی سے وابستہ ایک عجیب حقیقت کا انکشاف کرنے کی اجازت چاہوں گا۔۔۔؟" ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ عادل صاحب ایک لمحہ کے لیے رک جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ بیشتر مہمانوں کی نگاہیں مزید کچھ سننے کے اشتیاق میں ان پر مرکوز ہو گئی ہیں۔

"ویسے تو مجھے اپنی زندگی کے طویل سفر سے کسی قسم کی کوئی شکایت یا گلہ نہیں ہونا چاہیے۔" اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے عادل صاحب کہتے ہیں۔ "کیونکہ میں نے اور میری اہلیہ محترمہ نے اپنی ازدواجی زندگی کو بھرپور ڈھنگ سے جیا ہے۔ ہمیں ہر طرح کی نعمتیں میسر رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں آج کے دن میں اس امر کا انکشاف بھی کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میری ازدواجی زندگی کے آغاز سے قبل کا دور حقیقی خوشیوں اور مسرتوں سے محروم رہا ہے۔ وہ دور جوانی کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تشکیل کے لحاظ سے ایک شکست خوردہ دور رہا ہے۔"

"آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میری ازدواجی زندگی کی جو پچاس بہاریں ظاہراً طور پر خوشیوں سے سرشار و شاداب دکھائی دیتی ہیں، سچے معنوں میں ان کا آغاز ایک دل شکن چبھن سے ہوا تھا۔ اسے چاہے آپ میری بزدلی کی انتہا کہیں یا والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کہ شادی طے کرنے کے معاملے میں میں اپنے والدِ محترم کے انتخاب اور فیصلے کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بطور رفیقۂ حیات جس لڑکی کا انتخاب میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے کر رکھا تھا، میں اُسے اپنا جیون ساتھی نہ بنا سکا۔" ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ جیسے ہی عادل صاحب نے قریب کھڑی اپنی بیتی کی طرف نگاہیں گھمائیں تو اس نے گردن جھکا لی۔

"لیکن اس وقت میرے ساتھ کھڑی اس وفا شعار عورت اور فراخدلانہ پیار محبت کی مجسم مورت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔" مختصر سے توقف کے بعد عادل صاحب اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں نے اپنی زندگی کا کوئی بھی راز ان سے چھپا کر نہیں رکھا۔ بلکہ میں تو اپنے اس عقیدے کو فروغ دینا چاہوں گا کہ شادی کے پاک بندھن میں بندھ کر فریقین کو اپنی کتابِ زندگی کے ہر ورق کو دوسرے کے سامنے کھول کر رکھ دینا چاہیے۔۔۔ آفریں صد آفریں ہے میری رفیقۂ حیات کی فطرت پر! ایک تلخ حقیقت کا علم ہو جانے کے باوجود اس کے خلوص، اس کے ایثار اور اس کی محبت و وفا میں رتی بھر بھی فرق رونما نہیں ہوا۔ اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پچاس سال تک ایک ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اس عظیم عورت کی پیشانی پر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی بے اعتمادی اور شک و شبہ کی شکن پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ اس قابلِ احترام عورت نے دنیا کو دکھلا دیا کہ عورت اگر چاہے تو زندگی میں اس قسم کے غیر موافق تغیر رونما ہونے کے باوجود تنگ خیالی سے الگ رہ کر زندگی کو امیدوں اور مسرتوں سے سرشار کیا جا سکتا ہے۔ یقین کیجیے، اس عورت کو مجھ پر اور میرے کردار پر بے حد بھروسا رہا ہے۔ اور اس بھروسے کی وجہ سے خود میرے قدم بھی کبھی ایک لمحے کے لیے نہ ڈگمگائے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔ اس کے باوجود ہم زندگی کا معین سفر مکمل کرتے ہیں۔ یہی بات اپنے جیون ساتھی کے انتخاب پر بھی لاگو ہونی چاہیے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شادی سے قبل دو متضاد جنس کے انسانوں کے قرب نے اخلاقی

بندشوں کی قید و بند کا خیال نہ رکھا ہو۔ دو انسانوں کی باہمی کشش کے جذبے کو ایک قدرتی کرشمہ کہا جا سکتا ہے جس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ لہٰذا بے جا شک و شبے کو ازدواجی زندگی میں کشیدگی کا باعث نہیں بننے دینا چاہیے۔ اس لیے میں تو کہوں گا کہ باہمی اعتقاد، تیاگ اور قربانی کا جذبہ ہی وہ جذبہ ہے جو ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے اور پیار محبت سے شاداب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

"دوسری طرف قربانی اور تیاگ کی مجسم مورت اور فقط ایک شخص سے روحانی پیار کی خاطر خود کو زندگی بھر کسی دوسرے مرد کے قرب سے دور رکھنے والی ایک وہ عورت بھی ہے جسے میں تو اپنا نہ بنا سکا مگر وہ بھی آج تک کسی دوسرے کی بن کر نہ رہ سکی۔ میں اس سچائی سے انکار نہیں کروں گا کہ وقتاً فوقتاً ہم دونوں آج بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ لیکن ہماری ملاقاتوں کا انداز کچھ ایسا رہا ہے کہ ان لمحوں کے دوران دلی طور پر نزدیک رہ کر بھی ہم ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ خدمتِ خلق خدا اور سوشل سروس کو اس فرشتہ سیرت عورت نے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور روزمرہ زندگی کے جن مشاغل کو میں نے گلے لگا رکھا ہے وہ تو آپ سے چھپے نہیں۔

"میری طرح وقت کی اڑان نے اس عورت کی شخصیت پر بھی درازیِ عمر کی پرت چڑھا دی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے اس سے یہ دریافت کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ اس پر اس طرح کی زندگی تھوپنے پر وہ دل ہی دل میں سہی لعن وطعن تو ضرور دیتی ہوگی؟ لیکن اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے اور میں اس کے وہی الفاظ یہاں دہرانے کی جسارت کر رہا ہوں۔۔ 'دنیاوی اور مادی طور پر پیار محبت اور بچوں کے ہمراہ ازدواجی زندگی تو ہر کوئی جی لیتا ہے، لیکن جو زندگی تمہارے ذریعے خدا نے مجھے عطا کی ہے وہ شاید ہی کسی کو میسر ہوتی ہے۔۔' اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہماری شادی کی گولڈن جوبلی کی اس تقریب میں بلا دعوت وہ نیک ہستی بذاتِ خود اس وقت ہم سب کے درمیان موجود ہے۔۔"

تبھی شامیانے میں موجود مہمانوں کی خاطر مدارت کا انتظام کرنے میں مصروف بیروں میں سے ایک بیرا ڈائس پر آ کر عادل صاحب کو کاغذ کی ایک سلپ پیش کرنے کے بعد پھر سے مہمانوں کے اجتماع میں گم ہو جاتا ہے۔

"اور جس بات کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے،" عادل صاحب اپنے خطاب کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کہتے ہیں "اس کی صحیح معنوں میں تصدیق یہ مختصر سا تہنیت نامہ کرتا ہے جس میں اس قابلِ احترام عورت نے اس موقعے پر ہمیں اپنی نیک خواہشات سے نوازا ہے۔۔۔"

یہ سنتے ہی مہمانوں میں ایک سہمی سہمی سی سرگوشی ہونے لگتی ہے۔ ہر ایک کی مشکوک نگاہیں اپنے ارد گرد کسی کو تلاش کرنے لگتی ہیں۔ تقریب میں شریک اکیلی دکیلی ادھیڑ عمر عورتوں کا تو خاص طور سے برا حال ہے۔ کون جانے قریب ہی کھڑی وہی نیک سیرت شخصیت ہو جس کا عادل صاحب نے ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی کو بھی کسی پر انگلی رکھنے کی جرأت نہیں ثبوت کی غیر موجودگی میں بلاوجہ کوئی برا مان جائے۔

"معزز حاضرین!" ایک بار پھر حاضرین پر چھائی ہوئی عارضی خاموشی سے اوپر اٹھتی ہوئی عادل صاحب کی آواز آنے لگتی ہے۔ "حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عدالت میں انصاف کی نشست پر بیٹھ کر میں نے محبت کے نام پر بھی بری سازشوں اور قتل تک کے مقدمات پر ہزاروں مرتبہ غور کیا ہے اور قانون پر مبنی فیصلے صادر کیے ہیں۔ لیکن انسان کے لافانی جذبے ——— پیار ——— کی خاطر اتنی عظیم قربانی کا ذکر کسی کی زبان سے نہیں سنا۔ وہ شاید اس لیے کہ اس قدر عظیم قربانی پیش کرنا عام انسان کے بل بوتے کا کام نہیں ہے۔ محبت کی قربان گاہ پر شہید ہو جانے والی شہرۂ آفاق ہستیوں کے قصے تو ہماری زبانوں پر عام رہتے ہیں، لیکن محبت کے پاک جذبے کے تحت جس عظیم قربانی کا انکشاف میں نے کیا ہے وہ شاید بے مثال ہے۔

"آخر میں میں اپنے عزیز بیٹے، ستیش کی طرف سے جو آج تک اس راز سے بے خبر رہا ہے اس کی والدۂ محترمہ کی طرف سے اور اپنی طرف سے اس تقریب کی رونق بڑھانے کی زحمت فرمانے پر آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا اور درخواست کروں گا کہ کوئی بھی مہمان جو کچھ بھی کھٹا میٹھا آپ کی خدمت میں ہم پیش کر رہے ہیں، اس پر اپنی زبان کا ذائقہ آزمائے بغیر نہ جائے۔"

بعد ازیں آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے مدعو مہمان بڑے شامیانے سے ملحق علیحدہ شامیانے کے نیچے میزوں کی قطاروں پر قرینے سے سجے ہوئے پکوانوں اور لوازمات پر گویا دھاوا بول دیتے ہیں۔۔۔ لیکن اس شور و غل سے بے تعلق عادل صاحب کی خاموش آنکھیں اب بھی آنسوؤں کے ایک سیلاب کو ضبط کیے ہوئے ایک عمر رسیدہ عورت کا خاص طور پر تعاقب کر رہی ہیں جو تقریب اور دعوت

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

غزلیں

مسلم شہزاد

شاخِ طلب تک آئی بھی تو کتنی دیر کو آئے گی
تتلی تو آوارہ ٹھہری چھوتے ہی اُڑ جائے گی

آج تو بس سر سبز دو پتّے لے بھاگی ہے پُروائی
کل آئی تو پھولوں کے سب زیور بھی لے جائے گی

سونپ دیا ہے دستِ ہنر میں سونے کا نایاب قلم
چاندی کے کاغذ پہ دنیا جانے کیا لکھوائے گی

اچھّا ہے لپٹی رہنے دو دُھند کی بھیگی چادر میں
دُھوپ وگرنہ عریاں ہو کر انگارے برسائے گی

سایہ تو پھر ترکِ تعلق کر بیٹھے گا شام ڈھلے
میرے آگے رات اندھیری ہی باہیں پھیلائے گی

تھپکی تو میں بھی دے دوں گا، بچّوں کو شہزاد مگر
جانے والی دادی ماں کی برسوں یاد ستائے گی

بزمِ کہکشاں، نرکٹیا گنج، ضلع مغربی چمپارن (بہار)

غارتگرِ پندارِ ہوا، پانی بہت ہے
اِک موجۂ سرکش ہے کہ طوفانی بہت ہے

ہم جسم کی سرحد پہ کھڑے سوچ رہے ہیں
یہ کونسی منزل ہے کہ انجانی بہت ہے

کیا وحشتِ گمنام سمٹ آئی نظر میں
اِن خواب دریچوں میں تو ویرانی بہت ہے

اسباب کی خواہش کسے ہوتی نہیں لیکن
ہے یوں کہ مجھے بے سر و سامانی بہت ہے

اب ابرِ گریزاں ہی مرے گھر پہ برس جائے
دریا پہ تو دشمن کی نگہبانی بہت ہے

آنکھوں کو اُداسی کے بیاباں میں نہ چھوڑ آئے
اِک ساعتِ خوش رنگ کہ امکانی بہت ہے

کیا فکر کرے کوئی غزل میں کہ اے نجمی
اس شے کی نئے دور میں ارزانی بہت ہے

کامران نجمی

شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج، سوائی مادھوپور ۳۲۲۰۲۱ (راجستھان)

گوہر زادہ منصور عثمانی

دل میں مرے قیام کسی نے نہیں کیا
اِس شاہ کو غلام کسی نے نہیں کیا

کاندھوں پہ سب خدا کو اٹھائے پھرے مگر
بندوں کا احترام کسی نے نہیں کیا

مسجد کے احترام میں گھر تو بہت جلے
سجدوں کا اہتمام کسی نے نہیں کیا

عزّت جو چاہیے تو میاں سر جھکایئے
فرعون کو سلام کسی نے نہیں کیا

بدنام کر رہے ہو مجھے تم تو غم نہیں
یاروں کو نیک نام کسی نے نہیں کیا

منصور، زندگی کی دہائی تو سب نے دی
جینے کا انتظام کسی نے نہیں کیا

ماہ و انجم، نئی بستی مرادآباد ۲۴۴۰۰۱ (یوپی)

کنڑ کا مایۂ ناز شاعر
کو، ویم، پو

سیّد منظور احمد
صدر شعبۂ اُردو، جے۔ ایس۔ ایس۔ کالج، میسور-۴

دورِ حاضر میں اگر کسی ذہن میں یہ سوال
بھرے کہ ہندستان کا وہ کون شاعر ہے، جس
و سب سے زیادہ عزت و شہرت ملی، سب
ے زیادہ انعامات و اعزازات کس کے حصّے
ں آئے تو بلا تامّل کہا جا سکتا ہے کہ وہ کنڑ
بان کے قومی شاعر ڈاکٹر کے۔ وی، پٹپّا المعروف
کو، ویم، پو ہیں۔ انھیں پانچ یونیورسٹیوں سے
عزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی گئیں۔
ا ہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ ملک کا سب
ے بڑا ادبی انعام گیان پیٹھ ایوارڈ بھی ملا۔
م شری بھی اور حال ہی میں پدم بھوشن بھی۔
۱۹۸ء میں حکومتِ کرناٹک نے ایک
ا ایوارڈ کنڑ زبان کے عظیم شاعر "پمپا"
ے نام سے قائم کیا، جو ایک لاکھ روپے پر
شتمل ہے۔ اور یہ ریاست کا سرکاری اور
ر سرکاری سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ پہلا
پا ایوارڈ بھی کو، ویم، پو، ہی کے حصّے میں آیا
۲۵۔ مارچ ۱۹۸۹ء کو شہر میسور میں ایک
گار تقریب میں اس وقت کے وزیر اعلا
ں۔ آر۔ بومائی نے انھیں پیش کیا۔
میسور یونیورسٹی میں ان کے نام سے
ے چیر قائم ہوئی تو ریاستی حکومت نے ان
نام سے ایک یونیورسٹی، شیموگہ میں قائم کر دی
ِلف شہروں میں ان کے نام سے منسوب
ولوں، کالجوں، کتب خانوں، محلّوں وغیرہ
کا تو شمار ہی نہیں۔

کنڑی زبان وادب میں کو، ویم، پو کو
ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں
نے ادب کی ہر صنف میں لکھا، شاعری بھی کی،
ڈرامے بھی تحریر کیے۔ سوانح عمریاں بھی لکھیں
اور خود نوشت بھی رقم کی، تنقیدی مضامین
بھی سپردِ قلم کیے اور مختلف رزمیہ داستانیں
اور کئی ناول بھی ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔
بے شمار لکچر بھی دیے، اپنے تخلیقی سفر کا آغاز
کنڑ (مادری زبان) سے نہیں بلکہ انگریزی
سے کیا۔ لیکن بہت جلد کنڑ ہی کو اظہارِ خیال
کا ذریعہ بنا لیا۔ ان کی تصنیفوں اور تالیفوں
کی تعداد ساٹھ ہے۔ جس میں سب سے زیادہ
مشہور "سری رامائن درشانم" ـــــ جو
۲۲،۲۸۴ اشعار پر مشتمل ایک طویل رزمیہ
نظم ہے۔

کو، ویم، پو نے ۱۹۰۴ء میں بمقام
کپیلی ایک کسان گھرانے میں آنکھ کھولی، کپیلی
سرزمین ملناڈ کا ایک چھوٹا سا قریہ ہے جو
اپنے قرب وجوار کے دل کش قدرتی مناظر
جنگلوں، باغوں، کوہساروں وغیرہ کے لیے
معروف ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان
خوبصورت مناظر نے ایک مبتدی شاعر کو
عظیم شاعر بنانے میں مدد کی۔ ان مناظر نے
کو، ویم، پو کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔
جس کا ذکر جا بجا ان کی تخلیقات میں ہوا
ہے۔

آبائی وطن میں ابتدائی تعلیم کے لیے کوئی
مدرسہ نہ تھا، اس لیے گھر ہی مدرسہ بن گیا
جہاں خاندان کے دوسرے بچے ان کے ہم سبق
تھے۔ اس خاندانی مکتب میں ہر شام اپنے والد
(وینکپے گوڈا) اور چچا (رامنا) سے والمیکی کی
رامائن اور کمار و یاس کی مہابھارت جیسی شہرۂ
آفاق رزمیہ داستانیں سننے اور پڑھنے کے موقعے
ملے۔ چند دن بعد ان کی تعلیم کے لیے منگلور کے
ایک قابل اور لائق استاد آنند راؤ کو مقرر
کیا گیا، جنھوں نے نہ صرف کنڑ بلکہ انگریزی
بھی سکھائی۔ آٹھ سال کی عمر میں تیرتھ ہلی کے
ایک اسکول میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ لوور
سیکنڈری کا امتحان پاس کرنے کے بعد
میٹرکیولیشن کے لیے شہر میسور کے مشہور ہائی
اسکول ہارڈویک میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں
نے مغربی کلاسک کا مطالعہ بھی کیا۔
WORDS WORTH ان کے پسندیدہ شاعر
تھے۔ جن کے فن اور شخصیت سے متاثر ہو کر انھوں
نے بھی انگریزی میں شعر کہنا شروع کیا۔
دوستوں کے اصرار پر ان کی پہلی انگریزی
تخلیق "BEGINNERS MUSE" کے
نام سے منظرِ عام پر آئی۔ صغر سنی میں غیر ملکی زبان
کا سیکھنا، اس پر عبور حاصل کرنا، پھر اپنے

خیالات کو منظوم شکل میں پیش کرنا ایک قابلِ قدر و قابلِ فخر کارنامہ تھا۔ ایک انگریزی نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

CLAM AND SWIFT THE CRYST-
-AL STREAM.
GLIDES THROUGH THE STILL
WOODS.
WOOD LAND OF A HAPPY DREAM.
WHERE FLOW THE DREAMY
FLOODS!

آئرلینڈ کے ایک نقاد J. H. COUSINS نے ان کی انگریزی منظومات سے متاثر ہوکر مشورہ دیا کہ غیر ملکی زبان میں طبع آزمائی کے بجائے اپنی مادری زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائیے۔ موصوف نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ مادری زبان (بنگالی) ہی نے انھیں نوبل پرائز کا مستحق بنایا۔ پھر بھی کو، ویم، پو ۱۹۲۵ء تک انگریزی ہی میں شعر کہتے رہے، جن کی اشاعت ۵۰ سال بعد "THE ALIEN HARP" کے نام سے ہوئی۔

کو، ویم، پو جب انٹرمیڈیٹ کے طالبعلم تھے تو انھوں نے سری رام کرشنا پرا ہمسا اور سوامی ویویکانند کی زندگی کا گہرا اور تفصیلی مطالعہ کیا۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے مہاراجہ کالج میں داخلہ لیا۔ فلسفہ اور نفسیات اختیاری مضامین تھے۔ اس زمانے میں اپنے رفقا کے تعاون سے ایک انجمن "LOTUS UNION" قائم کی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد میں مطالعہ، مباحثہ، نغمہ سرائی وغیرہ شامل تھے۔ اس دوران انھیں کنڑ کے معروف مزاح نگار این، کستوری سے سری رام کرشنا آشرم کے سوامی سدھیشورانند کے ذریعے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ سوامی جی کا تعلق کیرالا کے ایک شاہی گھرانے سے تھا۔ مگر وہ دنیا سے کنارا کش ہوکر سنیاسی بن گئے تھے۔ ایک طرف نوجوان شاعر، دوسری طرف ایک درویش ـــــ یہ پہلی ہی نظر میں دونوں میں ایک قلبی و روحانی رشتہ قائم ہوگیا۔

کو، ویم، پو جب بی۔ اے (سال دوم) کے طالبعلم تھے تو ایک طویل وقفے تک بیمار رہے۔ سوامی جی کو خبر ملی تو وہ ان کی عیادت کو آئے۔ اور انھیں اسپتال میں داخل کروایا اور جب وہ صحت یاب ہوئے تو سیدھے آشرم لے آئے۔ آشرم کا صاف ستھرا پرسکون ماحول کو، ویم، پو کو بہت پسند آیا اور ان کے تخلیقی سفر میں روحانی فیضان کی آمیزش ہوتی۔ تقریباً ۱۲ سال تک آشرم ہی شاعر کا گھر بنا رہا اور ان کی بہت سی نظمیں اسی آشرم کی دین ہیں۔ سوامی جی کے علاوہ ان کے ایک لائق استاد پروفیسر ٹی، ایس، وینکنپا نے بھی کو، ویم، پو کو اپنا روحانی بیٹا بنالیا۔ کو، ویم، پو بڑے خوش قسمت تھے کہ انھیں اپنے وقت کے جید علما اور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ جن میں سے پروفیسر اے، آر، واڈیا، پروفیسر بی، ایم، شری اور پروفیسر اے، آر، کرشنا شاستری کے نام خصوصیت سے اہم ہیں۔

کو، ویم، پو کی جوانی کا دور آزادی کی جدوجہد میں گزرا۔ ۱۹۲۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لیے گاندھی جی جب بلگام آئے تو انھیں اس مردِ آہن کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جس کا ذکر اس شاعر کے شاعرانہ الفاظ میں سنیے:

"....THE FLAMING SPARK OF THE COLLECTIVE SOUL OF INDIA. THAT HAD TAKEN THE PIO-US VOW OF FREEDOM AND PLUNGED INTO THE WAR OF FREEDOM HAD ENTERED INTO MY OWN POETIC SPIRIT."

مولانا محمد علی جوہر، سروجنی نائیڈو، ٹیگور اور دیگر شعرا کی طرح کو، ویم، پو بھی آزادی کے گیت گانے لگے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ اس دوران انھوں نے دو ڈرامے "جلگارا" اور "یمنا سولو" لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔

آشرم کے قیام اور سوامی جی کی معیت سے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ کو، ویم، پو بھی رہبانیت اختیار کر کے سنیاسی بن جائیں گے لیکن ان کے روحانی پیشوا نے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے پر زور دیا۔ کو، ویم، پو نے ۱۹۳۶ء میں محترمہ ہیماوتما کو اپنی شریک بنایا۔ اس محترم خاتون نے جیتے جی شاعر کے گھر کو امن و سکون کا گہوارہ بنائے رکھا اور آخر کار ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اس عظیم شاعر کو داغِ مفارقت دے گئیں۔

کو، ویم، پو کا تخلیقی سفر ایک طرف عروج و ترقی کی راہ پر گامزن تھا تو دوسری طرف ان کے عہدے اور مراتب بھی بڑھتے رہے۔ کنڑ زبان و ادب میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۶ء میں پروفیسر و صدر شعبہ

کنڑ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ میسور کے
وائس چانسلر بنائے گئے۔ اسی سال ڈاکٹریٹ
کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں
ان کی ایک کتاب "شری رامائن درشنم" کو
ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ آل
انڈیا ساہتیہ سمیلن کے صدر منتخب ہوئے۔
۱۹۵۸ء میں مرکزی حکومت نے پدما بھوشن کا
خطاب دیا۔ ۱۹۶۴ء میں حکومت کرناٹک نے
انھیں "راشٹرا کوی" (قومی شاعر) قرار دیا۔
۱۹۶۸ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔

وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں
نے قابل قدر علمی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔
جن میں سے دو کا ذکر بہت ضروری ہے۔ مانسا
گنگوتری کامپلکس کا وسیع اور خوبصورت
نقشہ انہی کی سرپرستی میں تیار ہوا۔ اس طرح
ایک پرسکون اور خوشنما خطۂ ارض پر اعلا تعلیم کے
مختلف شعبہ جات قائم ہوئے۔ اس طرح شعبۂ
طباعت و اشاعت کو ترقی دے کر "پرسارانگا"
قائم کیا، جس کے زیرِ اہتمام نہ صرف نصابی
کتابیں بلکہ دوسری اہم مطبوعات بھی پابندی
کے ساتھ چھاپی اور کم قیمت پر فروخت کی جاتی
ہیں۔ علاوہ ازیں اس ادارے کے زیرِ اہتمام
توسیعی خطبات اور دیگر تعلیمی منصوبوں پر
بھی عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔

وائس چانسلر کے اعلا تنظیمی و تعلیمی
عہدے پر فائز ہونے کے باوجود کو، ویم، پو
کے تخلیقی رجحان پر نہ جمود طاری ہوا اور نہ تعطل
پیدا ہوا۔ وہ مسلسل لکھتے رہے۔ نثر و نظم کی ہر
صنف پر انھوں نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔
مگر ان کا خصوصی وصف ان کی شاعری ہے۔
کنڑ شاعری میں ان کا نام مستند معتبر اور محترم
سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار و احترام کے پیچھے
ان کی ستر سالہ فنی ریاضت ہے۔ گویا شاعری
ان کی عبادت بنی رہی۔ ان کے مضامین میں
خیالات کا تنوع ہے اور منظومات میں موضوعات
کی فراوانی، درد، لذت، غم، خوشی، فلسفہ،
سائنس، مذہب، تہذیب، رسوم، حیات،
موت ـــــ وہ سب کچھ جس کا تعلق انسانی
زندگی سے ہے، لیکن ان کے بنیادی موضوع
تین ہیں۔ قدرت، روح، عقلیت پسندانہ
حوصلہ مندی۔ ان کے کل ۲۵ شعری مجموعے
ہیں (انگریزی دو اور کنڑ تیئیس) پہلا مجموعہ
۱۹۲۲ء میں شائع ہوا اور آخری ۱۹۸۲ء میں
منظر عام پر آیا۔ قدرتی مناظر اور ان کا حسن
ان کی نظموں میں پوری طرح جلوہ گر ہے اور
یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ وہ قدرت کے
پجاری ہیں۔ بقول ایس، ایل، سیش گری راؤ
ان کی شاعری میں ایک زبردست جذبہ ہے
جو ایک فوارے کے مانند اچھلتا ہے۔ ان کو
ہندستان یا کنڑ کا WORDS WORTH
کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ WORDS WORTH
کی شاعری کے مدّاح و معترف ہی نہیں
بلکہ عاشق تھے۔ ایک انگریزی سانیٹ میں
اس کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا
ہے۔

کو، ویم، پو نے کل ۱۴ ڈرامے لکھے، جن
میں "ناناگوپالا" "مادام نینا تما" بچوں کے لیے
ہیں۔ شیکسپیئر کے HAMLET اور "THE
TEMPEST" کی طرز پر بھی انھوں نے دو ڈرامے
لکھے۔ "بارڈ گے کورانی" ان کا سب سے اچھا
ڈراما ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی اور
ڈرامے کے نقطۂ نظر سے بھی سب سے زیادہ
شہرت اسی ڈرامے کو حاصل ہوئی۔

کو، ویم، پو نے اپنا پہلا ناول ۱۹۳۶ء
میں لکھا۔ دوسرا اور آخری ۳۱ سال بعد ۱۹۶۷ء
میں لکھا۔ دونوں ناول بہت مقبول ہوئے۔
ان دونوں ناولوں کا شمار دنیا کے بہترین ناولوں
میں کیا جا سکتا ہے اور یہ قاری کے ذہن میں
انگریزی ناول نگار تھامس ہارڈی اور
تالستائی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ افسانوں
کے تین مجموعوں کے علاوہ تنقیدی مضامین پر
مشتمل چھ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

انھوں نے دو سوانح عمریاں ایک شری
رام کرشنا پرہمسا کی اور دوسری سوامی ویویکانند
کی لکھی۔ جو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔
ان سب کے علاوہ خود نوشت "NENAP
INA DONIYALLI" کے نام سے دو جلدوں میں
قلمبند کیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری اور
آخری جلد کا انتظار ہے۔

کو، ویم، پو عمر کے چھیاسی سال پورے
کر چکے ہیں مگر ان کے قلم پر انحطاطِ عمر کا کوئی
اثر نہیں پڑا ہے۔

بقیہ: ایک پرانی کہانی

کے ہنگامے سے بے بہرہ خاموش دھیمی لڑکھڑاتی
چال سے شامیانے سے باہر جا رہی ہے۔ کون
جانے اس ضعیفہ کی آنکھوں کی پلکوں کی قید سے
چھٹکارا پانے کے لیے مضطرب آنسوؤں کی
نوعیت کیا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آنسو
خوشی کے آنسو ہیں یا دبی دبی اور گھٹی گھٹی مجبور
زندگی پر بہائے جانے والے آنسو یا پھر محبت
کی قربان گاہ پر چڑھائے جانے والے پُر ایثار
اور پُر عقیدت یادگار آنسو!

غزلیں

عمران عظیم

حادثہ کوئی بھی ہو جانا یہاں مشکل نہیں
یہ دیارِ بے دیاری شہرِ آب و گل نہیں

کچھ کمائی کر کہیں جا، شاعری بے کار ہے
دوست اب ان فالتو باتوں سے کچھ حاصل نہیں

مہرباں مجھ پر ہوتے ہیں ان دنوں صاحب بہت
دشمنوں میں نام تو میرا کہیں شامل نہیں

حال کیا لکھوں تجھے اے دوست اپنے شہر کا
جس کو جو منصب ملا ہے اُس کے وہ قابل نہیں

یہ حقیقت ہے گزارا میں نے بچپن عیش میں
کچھ نہ کر پاؤں عظیم اس درجہ بھی کاہل نہیں

سائرہ پبلی کیشنز، نیر ولا، گنگوہ، سہارنپور (یو۔پی)

اپنا سا لگے ہے نہ پرایا سا لگے ہے
وہ شخص جو کچھ جاننے والا سا لگے ہے

رفتارِ محبت کی ہوتی جاتی ہے دھیمی
نفرت کا ہے سیلاب جو بڑھتا سا لگے ہے

گم رہتا ہے ہر شخص فقط ذات میں اپنی
یہ سارا جہاں جیسے سمٹتا سا لگے ہے

اک آتشِ سیال سی بہتی ہے رگوں میں
اور شہر اُسی آگ میں جلتا سا لگے ہے

اب اس سے زیادہ بھی تماشا کوئی ہوگا
کچھ بھی نہیں اور پھر بھی تماشا سا لگے ہے

احساس غموں کا ہے نہ خوشیوں کا وصیہ
اک دل ہے جو سینے میں دھڑکتا سا لگے ہے

فاطمہ وصیہ جائسی

۳۷، ساتویں گلی، نشاط گنج، لکھنؤ (یو۔پی)

اسد رضا

سینوں میں اگر ہوتی کچھ پیار کی گنجائش
ہاتھوں میں نکلتی کیوں تلوار کی گنجائش

نفرت کی تعصب کی یوں رکھی گئیں اینٹیں
پیدا ہوئی ذہنوں میں دیوار کی گنجائش

پاکیزگی روحوں کی نیلام ہوئی جب سے
جسموں میں نکل آئی بازار کی گنجائش

بچھڑے ہوئے گاؤں کا شاید ہے وہ باشندہ
جو شہر میں ڈھونڈے ہے ایثار کی گنجائش

سمجھیں کہ نہ سمجھیں وہ ہم نے تو اسد رکھ دی
اشعار کے ہونٹوں پر اظہار کی گنجائش

ای۔ ۷/۴۳/۱۱، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

دھند اور دھویں کے درمیان

قمر قدیر ارم

قصرِ قمر، بارہ دری (ڈھنگ) مراد آباد ۲۴۴۰۰۱ (یوپی)

دیکھتے ہی دیکھتے افراتفری سی مچ گئی۔ سب کو اس وقت اپنے گھر پہنچنے کی بیقراری تھی۔ کرفیو لگنے کا وقت قریب آگیا تھا۔ چار بجنے میں کچھ ہی دیر تھی۔ دُکانوں کے لگاتار گرتے ہوئے شٹر اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کا شوروغل عجیب دہشت کا ماحول پیدا کر رہا تھا۔ رحمت بی اپنے گھر کی چوکھٹ پر کھڑی پردے کی آڑ سے سہمی سہمی باہر کی ریل پیل دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں کتنی ہی رحمت بیبیاں یوں ہی چوکھٹ پر کھڑی اپنے بیٹوں یا شوہر کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ جو کئی روز کی 'نظربندی' کے بعد آج گھر کے لیے ضروری اشیا خریدنے گئے ہوں گے۔ ہر لمحہ، ہر آہٹ انھیں چونکا رہی ہو گی۔ پاس یا دُور سے آتی ہوئی آوازیں اُنھیں کسی انہونی کے ڈر سے دہلا رہی ہوں گی۔ اور وہ مسلسل خیر کی دُعائیں مانگ رہی ہوں گی۔ لیکن رحمت بی بی کا کون تھا۔ انھیں کس کا انتظار تھا بھلا؟

ان کے ماں باپ ان کی شادی کا ارمان دل میں لیے کب کے اللہ میاں کو پیارے ہو چکے تھے۔ بھائی بھاوج جدہ جا کر بس گئے تھے اور وہ ڈھنڈار گھر کی اونچی دیواروں میں اپنی کنواری خوشبو چھپائے چھپائے سر سے پاؤں تک سفید ہو چکی تھیں۔ دن میں محلّے کی بچیاں ان سے قرآن پڑھنے آجاتیں تو ذرا دیر کو گھر بھرا بھرا لگنے لگتا۔ پڑھنے کے بعد وہی انھیں سودا سلف لادیتیں اور خالی وقت میں ان کے آنگن میں لگے امرود اور بیر کے پیڑوں پر نشانے لگاتیں ان کی جوانی کی بیری تو یونہی بے نشانہ رہ گئی تھی کسی طرف سے پتھر آنے کے دن تھے تب ماں باپ نے خاندان اور ہڈی دیکھنے کے چکر میں انھیں قابلِ اعتنا ہی نہ جانا حالانکہ بعد میں اُن کے ڈاکٹر بھائی نے نہ ہڈی دیکھی نہ بوٹی اور ایک دوسری برادری کی ڈاکٹر لڑکی سے بیاہ رچا کر جدہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔

اب تو رحمت بی بی تھیں اور یادِ الٰہی۔ کاشت کی تھوڑی سی زمین پاس کے گاؤں میں تھی اسی سے گھر کا خرچ لشتم پشتم چلتا تھا۔ ویسے ان کا تو اپنا کوئی ایسا خرچ نہ تھا۔ چار روٹیاں۔ دو اِدھر دو اُدھر۔ لیکن مرغیوں طوطوں اور بکری کے کھانے کی فکر انھیں ہاتھ روک کر خرچ کرنے پر مجبور رکھتی۔ جیسی بھی گزر رہی تھی لیکن انھوں نے کسی کے آگے اپنا دستِ طلب نہیں پھیلایا تھا کھانے کو اللہ دے ہی رہا تھا کہ وہ رزّاق ہے پہننے کے لیے کپڑے انھیں اپنی شاگردوں کی شادیوں پر یا آمین پر مِل جاتے۔ ہر سال چار پانچ لڑکیاں فارغ التحصیل ہوتیں اور انھیں نذرانے کے طور پر ان کے گھروں سے کپڑے مٹھائیاں اور روپے مِل جاتے۔ وہ منع بھی کرتیں لیکن اس معاملے میں ان کے انکار کو کوئی نہیں سنتا تھا۔ اکثر وہ اپنی بکری لالی سے باتیں کرتیں اور دِل ہلکا کر لیتیں۔ وہ بھی ایسے سر ہلاتی جیسے ان کی مجبوری کو جانتی ہو۔ اُن کا غم پہچانتی ہو۔ لیکن آج کل تو ان کا دل لالی سے بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ شہر کی گرما گرمی اور طوفان آمیز خاموشی نے انھیں بے طرح بے چین کر دیا تھا۔ نہ جانے کیسا گولا سا ان کے پیٹ میں اٹھتا اور حلق میں آپھنستا۔ اسی بے چینی کو وہ باہر کے منظر کے ساتھ بانٹنے کے لیے کب سے دروازے پر کھڑی تھیں۔ کئی پڑھنے والی چھوٹی بچیوں نے سودے کے تھیلے اور ڈبے سنبھالے سنبھالے رُک کر ان سے پوچھا بھی تھا ——— "نانی! آپ کو کچھ چاہیے تو لادیں" اور رحمت بی بی کی طرف سے نفی میں سر ہلتا دیکھ کر وہ سلام کر کے آگے بڑھ گئی تھیں۔

دروازے پر کھڑے کھڑے رحمت بی کچھ کھو گئیں۔ اُنھیں تقریباً ۲۰ برس پہلے کا زمانہ یاد آگیا۔ ایسے ہی فساد ہوا تھا شہر میں۔ اُس وقت بھی وہ ایسے ہی تنہا تھیں۔ چالیس سال کی بظاہر پختہ عمر لیکن اندر سے انتہائی معصوم عورت۔ کرفیو میں ڈھیل کے دوران وہ پردے کی آڑ سے ایسے ہی باہر سڑک پر جھانک رہی تھیں کہ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ اور اسی بھگدڑ میں ایک ڈھائی تین سال کا بچہ ان کے دروازے کے بالکل سامنے سڑک پر گر پڑا تھا۔ پہلے تو وہ شور

جاتی رہیں کہ دیکھو اس بچے کو سنبھالو۔ کس کا بچہ ہے۔ کہیں بھیڑ میں کچل نہ جائے۔ دب کر مر نہ جائے، لیکن جب کسی نے ان کی کمزور آواز کو نہیں سُنا تو ان سے رہا نہیں گیا۔ اور وہ خود چادر لپیٹ کر باہر نکلی تھیں اور اُس بے ہوش پڑے بچے کو اُٹھا کر اندر لے آئی تھیں۔ گرنے سے اس کے ماتھے پر کوئی نوکیلی چیز لگی تھی۔ خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔ ہونٹ بھی خون سے بھرے تھے۔

انھوں نے جلدی سے کواڑ بند کیے اور چند منٹ تک وہ یونہی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُسے لپٹائے رہیں۔ پھر جب بچے کی بے ہوشی کا خیال آیا تو جلدی سے اُسے بستر پر لٹا کر پانی لینے دوڑی تھیں۔ خون لگاتار بہہ رہا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ جب انھیں اور کچھ نہیں سوجھا تو انھوں نے جلدی سے ماتھے کے خون کو اپنے سفید ململ کے دوپٹے سے پونچھ ڈالا۔ اور زخم میں سرمہ بھر دیا۔ اوپر سے ایک پتلی پٹی پھاڑ کر اور اس کو پانی میں بھگو کر زخم پر باندھ دیا تھا۔

بچہ ہوش میں آنے کے بعد رونے لگا تو وہ ایسے تڑپ اٹھیں جیسے ان کا اپنا جایا ہو۔ وہ نہیں جانتی تھیں یہ کس کی ہڈی ہے۔ کس کا خون ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ اس وقت اس بچے کو فوری علاج اور تیمارداری کی ضرورت ہے۔ اس کو سینے سے لگائے لگائے باورچی خانے میں گئیں اور پسا ہوا سہاگہ اس کے زخمی ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ بچہ بلبلا کر رو دیا تو ان کی ممتا پھر تڑپ اٹھی۔ انھوں نے جھٹ شکر کا ڈبہ کھول کر تھوڑی شکر اس کے منہ میں ڈال دی۔ بچہ چپ ہو گیا اور کچھ کچھ شکر چباتا ہوا رحمت بی کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

اُس رات بچے کو تیز بخار رہا اور رحمت بی بی یونہی رات بھر اس کے قریب بیٹھی رہیں ایک بار تو انھیں خیال بھی آیا کہ چھت پر جا کر موکھلے میں سے حجن پڑوسن کو آواز دیں اور ان سے معلوم کریں شاید اُن کے پاس کوئی دوائی پڑی ہو۔ لیکن پھر اس خیال کو انھوں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ۲۰،۲۵ دن پہلے ہی تو انھی کے شہر کے ایک بچے کو چلتی ٹرین سے دوسرے فرقے کے لوگوں نے باہر پھینک دیا تھا۔ اگر یہ بچہ اُسی دوسرے فرقے کا ہوا تو۔ ۔ ۔ ؟ کہیں انتقام کی آگ اسی بچے کے خون سے سرد کرنے کا دیوانہ پن لوگوں کے سر پر سوار ہو گیا تو۔ ۔ ۔ ؟

رات بھر وہ سورۂ ابراہیم پڑھ کر بچے پر دم کرتی رہیں۔ صبح ہونے پر انھوں نے اُٹھ کر نماز پڑھی۔ مگر دھیان نماز میں کہاں تھا۔ ہر لمحہ اسی بچے کا خیال تھا۔ ابھی تسبیح ہی پڑھ رہی تھیں کہ اچانک انھیں جوشاندے کی اس بچی ہوئی پڑیا کا دھیان آگیا جو کچھ دنوں پہلے انھوں نے سنبھال کر طاق میں رکھے مرتبان میں رکھ دی تھی۔

"یا مولا ـــــ تو بڑا کارساز ہے۔ بڑا کریم ہے۔" بے اختیار انھیں اپنے مولا پر پیار آگیا۔ "کیسا مسبب الاسباب ہے تو۔ کہ بے سرو سامانی میں بھی زندگی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔"

ـــــ اور پھر انھوں نے جوشاندہ اوٹا کر بچے کو اللہ کا نام لے کر پلا ہی دیا۔ جانے کیوں دل اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ بچہ اب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ بے سدھ سا تھا۔ اسی حالت میں وہ گہری نیند سو گیا۔ دل تو ان کا بھی چاہتا تھا کہ کمر سیدھی کرلیں لیکن اب وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ایک ننھی سی جان اور بھی تھی اسی وجہ سے وہ گھر کے کام کاج میں لگ گئیں ـــــ

لالی کو امرود کے پتے کھلائے طوطوں کو کچے امرود ڈالے اور چند پکے ہوئے امرود انھوں نے سنبھال کر رکھ لیے۔ لالی کا دودھ دوہا اور مرغیوں کو چُگنے کے لیے چھوڑ کر وہ پھر اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ کمبل ہٹا کر دیکھا وہ پسینے میں شرابور تھا۔ دوپٹے کے پلّو سے اس کا پسینہ خشک کرنے لگیں۔ بخار اب بہت معمولی سا تھا۔ خوشی سے وہ بے حال ہو گئیں اور بے اختیار بچے کو چوم لیا۔ دل چاہا اُسے جگا دیں۔ اس سے ڈھیر ساری باتیں کریں۔ عجیب سی کسک ان کے تن بدن میں تیرنے لگی۔ دوپہر تک وہ سوتا رہا اور رحمت بی بھی بغیر کچھ کھائے پیے اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ اور جب نیند سے بوجھل ان کی آنکھیں مچی مچی سی ہونے لگیں تب اچانک انھیں بچے کے جاگ جانے کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف لپکیں اور گرم دودھ کا پیالہ لے آئیں۔ بچے نے بے چوں وچرا دودھ پی لیا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹے؟"

انھوں نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"راجو۔"

سُن کر وہ ایسے سٹپٹائیں کہ جھٹ اسے انھوں نے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔ دیواروں کے بھی تو کان ہوتے ہیں۔ انھوں نے گھبرا کر دیواروں کو دیکھا۔

"ہم اپنے پاپا کے پاس جائیں گے۔" بچے نے دوپٹے کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ گھبرا گئیں۔

"کس کے بیٹے ہو؟"

"اپنے پاپا کے۔"

"کون ہیں تمہارے پاپا؟"

"پولیس والے ہیں۔ وہ سب کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ گولی چلاتے ہیں۔ ٹھائیں۔ ۔ ۔ ٹھائیں

تمھیں بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔"

بچے کی معصومیت پر وہ مسکرا اٹھیں۔

"اچھا ۔۔۔ تو کیا تم ہمیں پولیس سے پکڑوا دو گے؟" بچے نے غور سے انھیں دیکھا ۔۔۔ "ہاں۔۔۔ تم نے ہمیں کڑوی دوائی کیوں پلائی تھی؟"

"ارے وہ تو اس لیے کہ تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ تمھارے چوٹ لگی تھا نا۔۔ کیا تمھاری ماں تمھیں کڑوی دوا نہیں پلاتی کبھی؟"

"میری ماں تو ہیں نہیں۔"

سُن کر رحمت بی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"وہ تو پاپا کے ساتھ بہت دور رہتی ہیں۔"

"اوہ!" رحمت بی کی رُکی رُکی سانسیں بحال ہو گئیں۔

"تو تم یہاں کس کے پاس رہتے ہو؟"

"دادی کے پاس۔"

"کہاں رہتی ہیں دادی تمھاری؟"

"بہت دور۔"

"تم اپنی ماں کے پاس کیوں نہیں رہتے؟"

"میری ممی نے بازار سے دو چھوٹی چھوٹی گڑیا نکالی ہیں نا۔ بہت روتی ہیں دونوں۔"

"اوہ! مگر تم گھر سے باہر کیوں نکلے تھے؟"

"میں آئس کریم والے کو ڈھونڈ رہا تھا۔"

"اب تو نہیں نکلو گے نا کبھی؟ دیکھو تمھارے نی چوٹ لگی ہے۔" بچہ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر اُٹھ کر لالی کے بچے کے ساتھ کھیلنے لگا۔

کرفیو میں ڈھیل جیسے جیسے بڑھتی جا رہی ن رحمت بی کی پریشانیوں میں بھی اضافہ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہیں محلے والوں کو و کے بارے میں پتہ چل گیا تو انھوں نے اُسے تاکید کر دی تھی کہ چھت پر دروازے پر ہرگز نہ جائے۔ خود بھی پوری طرح چوکس رہتیں۔ لیکن دوسری فکر یہ تھی کہ راجو کو اس کے گھر کیسے پہنچایا جائے۔ انھوں نے تو کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالا تھا۔ کس سے پوچھیں۔ کہاں جائیں اور پھر جب کرفیو پوری طرح اٹھا لیا جائے گا تب تو پڑھنے والی لڑکیاں بھی آنے لگیں گی۔ کیا ہوگا پھر۔ بچہ بھی ان سے بے حد مانوس ہو گیا تھا۔

ان چند دنوں میں اُن کی بھوکی ممتا نے وہ پیار دیا تھا اُسے کہ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ دادی دادی کہہ کر دن رات ان کا طواف کرتا۔ نیند آتی تو ان کی گود میں چڑھ جاتا اور گلے میں باہیں ڈال کر سو جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتیں کہ اس کے بغیر وہ اب کیسے جئیں گی۔ اُس نے تو رحمت بی کی زندگی کو نئے لمس، نئی مسرتوں سے ہمکنار کیا تھا۔ نئے جذبوں کا احساس کرایا تھا۔ کاش! وہ ہمیشہ کے لیے ان کے پاس رہ جاتا۔ وہ جس قدر اس کے متعلق سوچتیں اسی قدر پریشان ہوتیں۔ جو تھوڑے بہت پیسے پڑے تھے ان میں سے کافی اُس کی ضروریات پر خرچ کر چکی تھیں۔ اکٹھا ہی ساری چیزیں اس کے لیے منگالی تھیں۔ ڈبل روٹی، مکھن بسکٹ، ٹافیاں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بار بار پڑھنے والی لڑکیوں کو بلائیں۔ کہیں کسی نے راجو کو دیکھ لیا تو پورے محلے میں یہ بات پھیلتے دیر نہ لگے گی۔ وہ راجو کو بھی ان چیزوں سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن آخر کب تک۔ کب تک وہ راجو کو دوسری نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتی تھیں؟ ماحول کسی آتش فشاں کی طرح بظاہر شانت تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کب اندر کا کھولتا ہوا لاوا باہر آ جائے اور اچھی بھلی سرسبز دھرتی کی تمام شادابی چوس لے۔ سب کچھ جلا ڈالے۔ راجو سے انھیں بے پناہ محبت ہو جانا فطری تھا۔ لیکن اس کے گھر کے لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اُسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ سوچتے سوچتے رحمت بی کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ راجو تو کھیل کھا کر سو جاتا۔ لیکن وہ ساری ساری رات جاگتیں اور صبح دم جب فجر کی اذانیں ہونے والی ہوتیں شیطان ان کی آنکھوں میں نیند بن کر گھسنے لگتا۔ لیکن جلد ہی وہ لاحول پڑھ کر اُٹھ بیٹھتیں۔ اب واقعی ان کے لیے بڑی دشواری ہو گئی تھی۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ راجو کو ہر حال میں اُس کے عزیزوں کے حوالے کر دیں گی۔ اور یہ کام وہ خود ہی انجام دیں گی۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب انھیں اپنی ہمت اپنی جرأت کا امتحان لینا تھا۔ اُس روز انھوں نے راجو کو صبح ہی نہلا دھلا کر تیار کر دیا تھا لیکن وہ ضد کر رہا تھا کہ کہیں نہیں جائے گا۔ اپنی دادی کے پاس بھی نہیں۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ وہ بازار لے کر جا رہی ہیں۔ آئس کریم اور کھلونے دلائیں گی۔ دادی کے پاس نہیں لے جا رہی ہیں۔ تب جا کر وہ راضی ہوا تھا۔ رحمت بی نے بُرقع اوڑھ کر راجو کو ساتھ لیا اور گھر کی کنڈی لگا کر ایک پُرانا زنگ آلود تالا اس میں ڈال دیا۔

وہ گھر سے نکل تو پڑی تھیں لیکن قدم ان کے من من بھر کے ہو رہے تھے۔ بہ مشکل تمام وہ پاس ہی کے تھانے پہنچی تھیں۔ سپاہیوں کی تنی ہوئی مونچھیں اور تیار رائفلیں مصرعہ اولیٰ اور مصرعہ ثانی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ تھانے تو وہ ضرور پہنچ گئیں لیکن انھیں خبر نہیں تھی کہ تھانیدار صاحب کون سے ہیں؟ کہاں ملیں گے؟ انھوں نے ڈرتے ڈرتے ایک سپاہی سے پوچھا تھا

"سنو بیٹا! یہ تھانیدار صاحب کہاں بیٹھتے ہیں؟"

سپاہی نے پہلے تو انھیں سر سے پاؤں تک بغور
دیکھا تھا۔ وہ سرتاپا لرز گئیں۔ پھر اس نے راجو
کو گھورا تھا ——— "کیا کام ہے ان سے؟"

"بہت ضروری بات ہے بیٹا" نہ جانے کیسے
یہ الفاظ اُن کے مُنہ سے نکل گئے تھے۔ شاید اللہ کی
مدد بھی شاملِ حال تھی۔ ورنہ وہ تو اس جگہ کا تصوّر
تک نہیں کر سکتی تھیں۔ سپاہی پر تھوڑا اثر پڑ گیا تھا۔
"بالکل سیدھی چلی جاؤ۔ سامنے جو وہ کھو ہے اسی میں
ملیں گے تھانیدار صاحب!" اور وہ جلدی سے
آگے بڑھ گئی تھیں۔ اس لچھمن ریکھا کو پار کرنے
کے بعد اُن کے رگ و پے میں ہمت اور حوصلے کی
ایک تیز لہر سی دوڑ گئی تھی۔ تیز قدموں سے چلتی
ہوئی وہ سیدھی تھانیدار صاحب کے سامنے جا
پہنچیں۔ راجو ان کے برقعے کا کونہ پکڑے چُپ
چاپ ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

"تھانیدار صاحب آپ ہی ہیں؟" انھوں
نے مضبوط سی آواز میں پوچھا تھا ——— اس تبدیلی
پر وہ خود بھی حیران تھیں۔

"ہاں کہیے ——— میں ہی تھانیدار جگت پال
سنگھ ہوں۔"

"خدا تمھیں خوش رکھے۔ میں کسی کی امانت
تمھیں سونپنے آئی ہوں۔ یہ بچہ پتہ نہیں کس کا ہے،
کرفیو کے زمانے میں میرے دروازے کے سامنے
بے ہوش پڑا تھا۔ کسی نے بھی آگے بڑھ کر اس کو
نہیں اُٹھایا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگی تھی۔ خون
بہہ رہا تھا۔ مجھ سے دیکھا نہیں گیا اور اٹھا کر اندر
لے گئی۔ یہ اپنے ماں باپ کا نام نہیں بتا سکتا۔ نہ
محلّے کا نام اس کو معلوم ہے۔ میں ایک پردہ نشین
عورت۔ اس کے ماں باپ کو کہاں ڈھونڈتی پھروں
گی۔ آپ کے پاس لے آئی ہوں۔ اس کے والدین
کے سُپرد کر دیں۔ نہ جانے کتنے پریشان ہوں گے
وہ لوگ" رحمت بی بی نے ایک ہی سانس میں
سب کچھ کہہ دیا۔ پہلی بار تھانیدار نے نظریں
رحمت بی سے ہٹائیں اور بچے پر مرکوز کر دیں۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" انھوں نے راجو
سے پوچھا تھا مگر وہ ٹکر ٹکر تھانیدار صاحب
کو دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا یہ بچہ گونگا ہے؟"

انھوں نے رحمت بی سے پوچھا تو وہ تلملا
اٹھیں "اے اللہ نہ کرے جو گونگا ہو۔ بیٹا بتا
دے اپنا نام صاحب کو۔"

"راجو" بچے نے ہونٹ کھولے لیکن رحمت
بی کا برقع اور کس کر پکڑ لیا تھا اس نے۔

"تمھارے پتا جی کا کیا نام ہے؟" بچہ پھر
خاموش تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم رہتے کہاں ہو؟" مگر بچے
کی خاموشی قائم رہی۔

"صاحب یہ اپنے والدین کا اتہ پتہ اگر بتا
سکتا تو میں اس کو یہاں کیوں لاتی۔ خود سونپ
دیتی لے جا کر۔"

"تو ایسا کرو اس بچے کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ہم
اس کے ماں باپ کا اتا پتا معلوم کر کے اُن کے
حوالے کر دیں گے۔"

رحمت بی نے چاہا کہ وہ جھٹ اس کے
ہاتھوں سے اپنا برقع چھڑا کر باہر نکل جائیں لیکن
ایک قدم ہل بھی نہ سکیں۔ جو کام وہ آسان سمجھ رہی
تھیں سچ مچ کتنا مشکل تھا۔ ایک معصوم بچے کو
اجنبی لوگوں کے درمیان کیا اتنی آسانی سے چھوڑ
جائیں؟ کیا وہ اس کے بغیر رہ سکیں گی۔ پتا نہیں
کب تک اس کے والدین کا پتا چلے تب تک بچہ
کیا اسی پولیس تھانے میں قید رہے گا؟ اس کے
کھانے پینے کا خیال کون رکھے گا؟ رات کو وہ
کہاں سوئے گا؟ اگر سوتے سوتے گر گیا یا ڈر گیا تو
کون اس کی ناز برداری کرے گا؟ اسے کہانیاں
سنائے گا ——— ؟ اس کے ساتھ کھیلے گا ——— ؟
اس طرح کے خیالات نے ان کے ذہن پر یورش
سی کر دی تھی۔ لیکن اب تو بات گھر کی چہار دیواری
سے نکل چکی تھی۔ اب تو تیر واپس کمان میں جانے
سے رہا۔ اور پھر کوئی اور طریقہ کوئی اور ذریعہ
بھی تو نہیں کہ وہ واپس اپنے گھر پہنچ جائے۔ راجو
پر بس بھی کیا ہے ان کا۔ صرف چند دن رکھ لیا تو
اتنا پیار اُمڈ آیا۔ جن کی اولاد ہے جنھوں نے
ڈھائی تین سال تک مسلسل اس کی دیکھ بھال
کی ہے ان کا کیا حال ہوگا۔ . . ؟

رحمت بی بی ابھی اپنے دل کو سمجھا رہی تھیں
کہ تھانیدار کے اشارے پر ایک سپاہی نے بڑھ
کر راجو کا ہاتھ رحمت بی کے برقعے سے جُدا کر دیا۔
جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ راجو نے سپاہی کے ہاتھ
سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا اور چیختا ہوا مڑ کر واپس
جاتی ہوئی رحمت بی سے جا چپٹا تھا۔ "دادی ———
دادی مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ . . ." رحمت بی کا
دل بڑی زور سے دھڑکا۔ لیکن دل پر پتھر رکھ کر
انھوں نے راجو کو اپنے آپ سے الگ کر دیا۔ "نہیں
دادی۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ دادی میری
پیاری دادی مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ ———"
وہ بری طرح رو رہا تھا۔ مچل رہا تھا ——— آخر
رحمت بی لاکھ دل پر پتھر رکھیں لیکن پتھر کا دل تو
نہ رکھتی تھیں۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ بے اختیار اس
کو گود میں اُٹھا لیا۔

"میرے چاند! تھانیدار صاحب بہت
اچھے آدمی ہیں یہ تمھیں میری ہی طرح پیار کریں گے
اور بہت جلدی تمھارے پاپا کے پاس پہنچا دیں
گے۔" انھوں نے ایک بار پھر آہستہ سے اُسے الگ

کرنا چاہا مگر تب اس نے اپنی ننھی ننھی باہوں
سے ان کی گردن جکڑ لی تھی اور یہ جکڑ اتنی سخت
تھی کہ رحمت بی کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنے کانپتے
ہاتھوں سے اس سے آزادی پانے کی بے سود
کوشش کرنے لگیں۔ تھانیدار صاحب غور سے
یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اور حیران ہو رہے تھے۔
انھوں نے پھر سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی لپک
کر پھر راجو کو رحمت بی سے الگ کرنے لگا۔ اس
نے سختی سے ایک جھٹکا دیا اور راجو کے ہاتھ رحمت بی
کی گردن سے جدا ہو گئے۔ لیکن وہ بری طرح مچل
رہا تھا۔ مدد کے لیے ایک سپاہی اور آ گیا۔ لیکن
پھر بھی وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک
دوسرے سپاہی نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر
اُسے اندر کی کوٹھری کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔
راجو کی حالت اور بُری ہو گئی۔ رحمت بی ایک
استقلال کے ساتھ آگے بڑھیں اور مچلتے ہوئے
راجو کو سپاہی کی گرفت سے جھپٹ لیا۔

" چھوڑ دو میرے بچے کو۔ ایسے رکھو گے تم
اسے یہاں۔ یوں تو تم اس کی جان ہی لے لو گے —
ارے کیسے ظالم ہو تم — ایک ذرا سی محبت
نے اس کو میرا بنا دیا۔ تم بچے کے ساتھ بھی مجرموں
والا سلوک کرو گے تو کیا وہ مر نہ جائے گا؟" راجو
اُن کے سینے سے لگا سِسک رہا تھا۔ برقعے کے
اندر ہی اندر اُن کی آنکھیں بھی رو رو کر لال ہوئی
جا رہی تھیں... اب انھیں کسی کا ڈر نہ تھا...
راجو کے لیے وہ تمام دنیا کے آگے سینہ سپر ہو سکتی
تھیں۔ کمزور سی ہستی آہنی دیوار بن سکتی تھی . . .

"یا اللہ! یہ کیسا امتحان ہے میرا؟" ان کا رُواں رُواں
کانپ اٹھا۔ راجو اُن کے سینے کی شفیق نرمی اور تحفظ
کے احساس سے اب خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا
پورا وجود مدھم سسکیوں کی زد پر کسی زرد پتے کی
طرح لرز رہا تھا۔ بے آواز سسکیاں اُسے بالآخر
نیند کی آغوش میں لے گئیں۔

" بچہ سو گیا ہے۔ اب آپ جاؤ بڑی بی اور
اسے اندر والے کمرے میں لٹا دو۔" تھانیدار کی
گمبھیر آواز نے رحمت بی کو چونکا دیا۔

" نہیں، میں بھی اس کے ساتھ تب تک
یہیں رہوں گی جب تک اس کے گھر کے لوگ
نہیں آ جاتے۔"

تھانیدار صاحب سٹپٹا گئے۔ ایک برقع
پوش عورت تھانے میں بیٹھی رہے گی تو پتا نہیں
ایسے فساد زدہ ماحول میں اور کیا نیا فتنہ اٹھ کھڑا
ہو۔ "نہیں بڑی بی یہ غیر قانونی ہے۔ ہم آپ کو
بلاوجہ تھانے میں روکیں گے تو ہم سے پوچھ تاچھ
ہو جائے گی۔ کرفیو دوبارہ لگنے کا وقت ہونے والا
ہے۔ میری مانیے اور اس کو یہیں چھوڑ کر آپ
جائیے۔" اس کے لہجے میں نرمی تھی لیکن رحمت
بی ہمدردی کی کوئی اُمید اُن لوگوں سے کیسے کر سکتی
تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ایک دلخراش منظر
دیکھ چکی تھیں۔

" اور یہ بچہ جب جاگے گا تو کیا آپ کے
تھانے میں کہرام نہیں مچے گا؟ نہیں میں اس کو
چھوڑ کر نہیں جانے والی۔ میں قانون وانون نہیں
جانتی اور نہ یہ بچہ جانتا ہے۔ تم لوگ میرے ساتھ
جو سلوک چاہو کرو۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

رحمت بی کا یہ استقلال تھانیدار کو بھی
چکرا گیا۔ اُس نے فوراً کچھ سپاہیوں کو دوسرے
تھانوں سے گمشدہ لوگوں کی فائلیں لانے کا حکم
جاری کر دیا۔ اور رحمت بی کو بچے کے ساتھ
ہی اندر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ چپ چاپ
راجو کو گود میں لیے بیٹھی رہیں۔ دوپہر میں بچے نے
کچھ نہ کھایا تو انھوں نے بھی نہ کھایا گیا — بچہ
بار بار گھر چلنے کی ضد کرتا رہا اور وہ اُسے بہلاتی رہیں۔
انھوں نے سپاہی سے کہہ کر کچھ بسکٹ وغیرہ راجو
کے لیے منگوا لیے تھے — مگر اس نے وہ بھی
نہ کھائے۔ عجیب طرح سے سہما سہما تھا۔ ان کی گود
سے اُترتا ہی نہ تھا۔ ذرا سا چہرہ نکل آیا تھا غریب
کا۔ اور رحمت بی کا دل کٹا جا رہا تھا۔ بے سُدھ
سوتے راجو کو ایک طرف لٹا کر انھوں نے بہ مشکل
عشا کی نماز ادا کی۔ اور پھر ساری رات جاگتے ہی
جاگتے گزری۔

صبح ہی تھانیدار صاحب نے انھیں اپنے
کمرے میں طلب کر لیا۔ ان کے برابر والی کرسی پر
ایک فوجی جوان بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ راجو کو
لے کر پہنچیں اس جوان نے اپنے دونوں بازو راجو
کی طرف بڑھا دیے۔ راجو بھی مسکرایا تھا۔ لیکن
رحمت بی کی گود سے نہیں اُترا تھا۔

" آپ نے بڑا اُپکار کیا ہے ہم پر۔ ہم اس احسان
کا بدلہ کیسے چکائیں گے۔" میجر کھنہ کا سر احترام اور
عقیدت سے رحمت بی کے آگے جھک گیا۔ "مجھے
تمام باتوں کا وورن مل گیا ہے۔ میں واستو میں
بہت آبھاری ہوں آپ کا۔" میجر کھنہ کی آنکھوں
میں تشکر کے آنسو تھے۔

" جاؤ بیٹا تمہارے پاپا لینے آ گئے ہیں۔ . ."
تھانیدار صاحب نے راجو کو سمجھایا لیکن وہ ٹس سے
مس نہ ہوا۔ "میں اپنی دادی کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"
اس کی یہ معصوم محبت وہاں موجود سب لوگوں کو متاثر
کر گئی تھی۔ رحمت بی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ بمشکل
انھوں نے خود پر قابو پایا۔ "لے میرے چندا بڑا
بھولا ہے۔ اگر میں تیرے ساتھ چلی گئی تو لالی کو
اور طوطے کو، مرغیوں کو کھانا کون کھلائے گا؟"

" میں سب کو لے جاؤں گا۔"
رحمت بی نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا

کر میجر صاحب کے سُپرد کیا۔ راجو سے ان کا لگاؤ اور خود راجو کی انسیت نے میجر صاحب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اکثر راجو کو رحمت بی بی کے گھر چھوڑ آتے۔ شہر میں جب تک ٹینشن رہا وہ خود اسے لے کر رحمت بی بی کے گھر جاتے رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ان کا نوکر اُسے پہنچا کر لانے اور لے جانے کا فرض نبھانے لگا تھا۔ چند ماہ بعد ایک اسکول میں راجو کا داخلہ ہو گیا۔ اب وہ صرف چھٹیوں میں اپنی مُنہ بولی دادی سے ملنے آپاتا۔ وہ اس کے لیے نمک پارے بنا کر رکھتیں۔ شکر قند کی کھیر، شکر پارے، چنے کی دال کا حلوہ۔ جو پکنے کو ہوتے ایسے امرودوں پر کپڑا باندھتیں کہ کہیں گلہریاں نہ کتر دیں۔ راجو کو سب سے زیادہ تو اس پیڑ کے امرود پسند تھے۔ وہ آتے ہی سب سے پہلے پیڑ کا جائزہ لیتا تھا۔ محلّے کے تمام لوگ راجو کو پہچانتے تھے اور غیر ارادی طور پر اُس کے منتظر رہتے۔ پھر یوں ہوا کہ راجو کو فوجی تعلیم و تربیت کے لیے فوجی درسگاہ بھیج دیا گیا۔ اب امرودوں پر کوئی کپڑا نہ بندھتا ــــــ باورچی خانہ سُونا پڑا رہتا ــــ چار روٹیاں جو دو اِدھر اور دو اُدھر کھاتی بھی تھیں وہ بھی پڑی سوکھتی رہتی تھیں۔ اور یوں ہی ایک لمبا عرصہ گزر گیا۔ اگر اُن کی پڑوسن حمّن بی ضد کر کے خوشامدیں کر کے کھانا کھانے پر مجبور نہ کرتیں تو شاید رزق تو ان کا اس زمین سے کب کا اُٹھ گیا ہوتا۔ اِدھر اتنے برس انھوں نے راجو کی یاد میں اس کے انتظار میں کیسے کاٹے تھے یہ تو کچھ وہی جانتی تھیں۔ آج پھر ویسا ہی ماحول تھا ــــ راجو کچھ اور بھی زیادہ یاد آ رہا تھا۔ فساد زدہ شہر کی رونق کرفیو میں ڈھیل ملتے ہی لوٹ آئی تھی۔ مگر اس وقت تو افراتفری مچی تھی۔ کچھ ہی منٹوں میں سپاہیوں کی سیٹیاں گونجیں گی اور سڑکیں سنسان ہو جائیں گی۔ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ اور اسی بھگدڑ میں ایک بچّہ بالکل اُن کے دروازے کے آگے اوندھے مُنہ آگرا۔ خوف اور گھبراہٹ کے مارے وہ گُنگ رہ گئیں ــــــ سپاہی لاٹھیاں بجاتے بہت قریب آچکے تھے اور لوگوں کی بھیڑ اسی بچّے کی طرف لپکی آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ اب نہیں بچے گا۔ ان لاتعداد قدموں کے نیچے آکر کُچل جائے گا ــــــ مارے خوف کے انھوں نے آنکھیں کس کے میچ لیں۔ بچّے کی خون میں لت پت لاش انھیں اپنی بند آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لاش بھی غائب ہو چکی تھی۔ اب صرف گوشت کے ناقابلِ شناخت لوتھڑے تھے جو ان کے گھر کے آگے بکھرے تھے۔ خون کی چھینٹیں تھیں جو دُور تک پھیلی تھیں۔ رحمت بی بی کی ٹانگیں بے جان ہونے لگیں۔ سہارے کے لیے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے کرم خوردہ چوکھٹ کو تمام طاقت سے پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ گر ہی پڑتیں۔ گوشت کے لوتھڑوں میں انھیں اچانک جانی پہچانی دھڑکن محسوس ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوتھڑے جانے پہچانے چہرے میں سمٹنے لگے ــــ راجو کا چہرہ ــــ "ارے کوئی بچاؤ اسے ــــ میرا بچّہ ــــ میرا راجو۔ . ." وہ بے اختیار چلّا اُٹھیں۔

" دادی آنکھیں کھولو دادی ــــ مجھے دیکھو . . ."

" کون . . . ؟"

" میں ہوں تمھارا راجو ــــ سرحدوں کی حفاظت چھوڑ کر اس شہر کی حفاظت کرنے آیا ہوں ــــ دیکھو میری طرف ــــ" رحمت بی کے کان ایک اجنبی آواز سُن رہے تھے لیکن لہجہ اجنبی نہ تھا۔

" تم نے ہمیں کڑوی دوائی کیوں پلائی تھی۔ آج تمھیں گرفتار کر کے لے جائیں گے۔" رحمت بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ایک بلند قامت خوبصورت فوجی کھڑا تھا۔ اس کے نقوش میں ۲۰ برس پرانا چہرہ موجود تھا۔

" راجو . . . !"

" ہاں دادی! سب کا راجکمار کھنہ! مگر تمھارا وہی چھوٹا سا راجو۔"

" لیکن وہ بچّہ . . . وہ بچّہ کہاں گیا؟ بھیڑ میں کُچل گیا کیا . . . ؟" رحمت بی بے یقینی کی حالت میں زمین کا وہ ٹکڑا حیرت سے دیکھ رہی تھیں جہاں اُن کی آنکھوں نے ایک بچّے کو گرتے دیکھا تھا۔

" اُسے تو تم نے بیس برس پہلے ہی کچلنے سے بچا لیا تھا۔" اور رحمت بی بی نے بے اختیار اپنی بوڑھی باہیں پھیلا دیں اور پھر ایک چھوٹا سا راجو اُن کے سینے سے لگا سسک رہا تھا۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

دسمبر ۱۹۹۱ء کے "ایوانِ اردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ـــــ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

سارے ماہی گیر اپنے جال بھر لے جائیں گے
اور زور آور سمندر دیکھتا رہ جائے گا (باقر نقوی)

مرسلہ: قاضی انور، ہیرا پور ۵۸۵۱۰۲، گلبرگہ (کرناٹک)

اب تو موجوں میں رہ کر ہی ملتا ہے دل کو آرام
جس دن پانی میں اترے تھے اس دن جی گھبرایا تھا (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: قدیر علی، معرفت لقمان پان والا، نزد بھائی رونا تھ، احباب نگر، احمد آباد

زندگی دی ہے مجھے آگ کے دریا کی طرح
پار اترنے کے لیے موم کی کشتی دی ہے (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: خالد اختر، بمبئی

ہیں زیر آب گوہر نایاب بے شمار
کیا کیا سمیٹ لائیں گے چھوٹی سی ناؤ میں (سحر فریدی)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے (نامعلوم)

مرسلہ: ناصر حسین، برہانپور

کہاں خود داریاں اپنی ڈبوئیں
سمندر بھی بہت گہرا نہیں ہے (نامعلوم)

مرسلہ: نسرین کوثر، گلبرگہ

الجھنوں کے دریا میں بے جھجک اتر جانا
وقت آپ کو خود ہی تیرنا سکھا دے گا (عقیل نعمانی)

مرسلہ: محمد شکیل میاں، دہلی

سعی و تدبیر ہیں تائید مشیت کے قریب
اک نہ اک دن مرا ساحل پہ سفینہ ہوگا (عروج زیدی)

مرسلہ: عمار ابن چکی، بھیلون

ان گنت لوگ سمندر میں اترتے ہیں مگر
کس کی تقدیر میں لکھا ہے گہر کیا معلوم (نامعلوم)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدرآباد

جن کو روٹی ملے مصیبت سے
خاک وہ سائباں بنائیں گے (نامعلوم)

مرسلہ: ارشاد ساگر، سہارنپور

کچھ ایسے کم نصیب بھی ہیں اس جہان میں
پیاسے کھڑے ہوتے ہیں سمندر کے آس پاس (شاذ تمکنت)

مرسلہ: معید مرزا، حیدرآباد

کشتیاں سب کی کنارے پہ پہنچ جاتی ہیں
ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے (نامعلوم)

مرسلہ: نور سیدہ، مئو

تو نے لکھا ہے سمندر ہی اگر قسمت میں
پھر تو یا رب مری کشتی بھی سلامت رکھنا (پرویز ملاش)

مرسلہ: مظہر الحق خاں، علی گڑھ

پچھلے ماہ کی تصویر

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقموں پہ شاد ہے
صیاد خوش ادھر ہے کہ کانٹا نگل گئی (اکبر الہ آبادی)

مرسلہ: طفیل احمد انصاری، جونپور

راہ میں اپنی سمندر ہے تو اس کا غم نہیں
عزم کی پتوار منزل تک ہمیں لے جائے گی (نامعلوم)

مرسلہ: قمر الحسن، بھیونڈی

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا (انس معین)

مرسلہ: محمد نہال اختر واحد، بھاگلپور

ہم ہواؤں سے مل کر خود فضا بنائیں گے
موسموں کے در پہ اب نوکری نہیں کرنی (شجاع خاور)

مرسلہ: فرح نسیم، نوادہ

تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بنتے
ہم پیکرِ تدبیر و عمل بن کے جیتے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ: محمد ارشاد صدری، شاہ پور بگھونی

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر
ہم فرض کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا (نامعلوم)

مرسلہ: تشنہ نگینوی، علی گڑھ

ذہن میں رکھتے ہیں یہ پہچان سمجھ لیتے ہیں
کشتیاں کس کی ہیں طوفان سمجھ لیتے ہیں (عقیل نعمانی)

مرسلہ: نفاست سیماب، رامپور

کبھی طوفاں کی خاموشی یہ منظر بھی دکھاتی ہے
سمندر پرسکوں ہوتا ہے کشتی ڈوب جاتی ہے (علیق)

مرسلہ: منصور حسین، برہان پور

یہاں تو ہر طرف آباد نفرت کے جزیرے ہیں
سمندر کی ہمارے نام اب گہرائیاں لکھ دو (اظہر نیّر)

مرسلہ: فرخندہ نازیہ، ررگ

ارجن سی ہے نظر مری مچھلی کی آنکھ پر
لیکن یہ اور بات کہ ٹوٹی کمان ہوں (حبیب عدل)

مرسلہ: زرخشندہ خانم، صاحب گنج

خوابِ فردا کے ہیں مظہر آج کے یہ مشغلے
کل کی تیاری میں گویا آج ہیں یہ منہمک (جلال)

مرسلہ: محمد امتیاز صدری، شاہ پور بگھونی

قسمت کی ہر لکیر ہے کالی تو کیا ہوا
محنت کی دھوپ بھی تو مری مٹھیوں میں ہے

مرسلہ: محمد طفیل صدری، شاہ پور بگھونی

اس بحرِ محبت میں اے دل بس ڈوبنے والے بچتے ہیں
پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کے بیڑا پار بھی ہے (فراق)

مرسلہ: قریش حسین، برہانپور

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے (اقبال)

مرسلہ: مسعود اختر انصاری، فیض آباد

نثری عنوانات

"سمندر کا بلاوا" (مصور سبزواری کا ڈراما)
مرسلہ: محمد خالد عمران، معرفت محمد جلال الدین صاحب، رکاب گنج، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲

"پانیوں کا سفر" (جیلانی صبا کی نظم)
مرسلہ: نوشابہ پروین، بھاگلپور

"پانی میں زندگی کی تلاش" (ناوک حمزہ پوری کی نظم)
مرسلہ: اعجاز احمد، حمزہ پور

"جینے کے لیے" (مستور جہاں کا ناول)
مرسلہ: حافظ اسعد اللہ انصاری، گورکھپور

"حال بنام ماضی" (خورشید ملک کا افسانہ)
مرسلہ: محمد آدم گردش، صاحب گنج

"تین چہرے ایک سوال" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

"شکاری" (کرشن چندر کا ناول)
مرسلہ: محمد حاذق صدری، شاہ پور بگھونی

"جہلم میں ناؤ پر" (کرشن چندر کا افسانہ)
مرسلہ: محمد رضوان پرویز، بھاگلپور

"روزی کا سوال" (واجدہ تبسم کا ناول)
مرسلہ: محمد صادق صدری، شاہ پور بگھونی

"مچھلی کا شکار" (ضیاء علی خاں اشرفی کا افسانہ)
مرسلہ: محمد یحییٰ خاں دانش، ہزاری باغ

"بند مٹھی کا نوحہ" (حسین الحق کی کہانی)
مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، بھاگلپور

"سفرزاد" (اجمل اجملی کے شعری مجموعے کا عنوان)
مرسلہ: بی۔این۔ایس، بھاگلپور

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلان ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔
امید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پہ محمول کیا جائے گا۔

ـــــــ ادارہ

نئی مطبوعات

سہ ماہی ذہنِ جدید

قیمت، فی شمارہ : بیس روپے
سالانہ قیمت، مع ڈاک خرچ : سو روپے
رابطہ : ذہنِ جدید، پوسٹ بکس نمبر ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جمشید جہاں کی ادارت اور زبیر رضوی کی نگرانی میں شائع ہونے والے اس سہ ماہی جریدے نے اردو کی ادبی صحافت کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ہمارے ادبی رسائل کا دامن بالعموم ان موضوعات سے خالی رہتا ہے جو بادی النظر میں غیر ادبی ہوتے ہوئے بھی اپنے دور رس مضمرات کے ساتھ ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی سے نہ صرف یہ کہ متعلق ہوتے ہیں بلکہ اس پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ "ذہنِ جدید" نے اسی کمی کو بدرجۂ اتم پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور مصوری، موسیقی، رقص، فلم، سیاست کسی کو اپنے لیے شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیا ہے۔

ہمارے ادبی رسائل کی ایک اور روش بھی رہی ہے، انھوں نے اردو سے آگے دیکھنے کی جب بھی کوشش کی، ان کی نظر بالعموم انگریزی زبان و ادب تک جا کر ٹھہر گئی۔ "ذہنِ جدید" نے اپنے قارئین کو پورے عالمی ادبی منظرنامے کی سیر کرانے کا حوصلہ کیا ہے اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے معاصر ادب پر نہ صرف تعارفی مضامین شائع کیے ہیں بلکہ منتخب اور نمائندہ ادب پاروں کے اردو تراجم بھی پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے مباحثوں، مصاحبوں اور تراجم کے وسیلے سے یہ سعی بھی کی ہے کہ اردو قاری کو ہندستان کی دوسری زبانوں کی ادبی صورت حال کو بہتر طور پر سمجھنے کا اہل بنا سکے۔ اشاعت میں باقاعدگی بھی اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے جو اسے دوسرے سہ ماہی جرائد سے ممتاز کرتی ہے جو اکثر بے قاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ اس کا پانچواں شمارہ ہے۔ جس میں ہندستانی ادب اور عالمی ادب پر خصوصی گوشے شامل کیے گئے ہیں۔ ہندستانی ادب کے ذیل میں ہندی کے پچھلے ۵۰ سال کے ادب پر نامور سنگھ، شانی، وشوناتھ ترپاٹھی اور کاشی ناتھ سنگھ نے گفتگو کی ہے۔ عالمی ادب کے ذیل میں معاصر افریقی ادب پر انٹرویوز، مونگین ولے سرنے، گیبرئل اوکارا اور کوفی اونور کی بات چیت کے علاوہ افریقی شاعری پر ایک مضمون اور معاصر افریقی نظموں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ ترجمے چندر بھان خیال نے کیے ہیں۔ اس گوشے میں چینی اور فلسطینی ادب کے تراجم بھی شامل ہیں۔

رسالے کا آغاز غزل پر بحث سے ہوا ہے جس میں بشیر نواز اور شہزاد احمد نے خیال انگیز باتیں کہی ہیں۔ عابد سہیل (افسانے کی تنقید: چند مباحث) اور جیلانی کامران (فکر اقبال میں وجدان اور عرفان کا رشتہ) کے مضامین بھی توجہ طلب ہیں۔ عابد سہیل نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ان مضامین کو موضوعِ بحث بنایا ہے جو انھوں نے افسانے پر لکھے ہیں۔ افسانوی حصے میں انور عظیم، جیلانی بانو، اور دیوندر اسر کی نئی کہانیوں کے ساتھ کرتار سنگھ دگل اور راجیت کور کی پنجابی کہانیوں اور موہن درپن کی ہندی کہانی کا ترجمہ شامل ہے۔ کچھ صفحات عزیز حامد مدنی کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ اسلم فرخی اور جمیل جالبی کے مضامین مطبوعہ ہیں مگر پاکستان میں چھپے ہیں، شاید بیشتر ہندستانی قارئین کے لیے نئے ہوں گے۔

اس شمارے کے دوسرے عنوانات ہیں: شاعری (نظمیں، غزلیں) مزاح (انشائیہ، یوسف ناظم) ترسیل (انگریزی صحافت، فوٹو گرافی) موسیقی (غلام علی اور مہدی حسن کا انٹرویو، روی شنکر کا مضمون: میرا سنگیت) کینوس (مصوری پر مضامین) تھیٹر، فلم، کتابوں کی باتیں، ردعمل (خطوط) ہم قلم (قلم کاروں کا مختصر تعارف)

—— محمود سعیدی

تاریخی مثنویاں

مصنف : ڈاکٹر کندن لال کندن
صفحات : ۲۳۶
قیمت : اسی روپے
تقسیم کار : سیمانت پرکاشن، کوچہ روہیلا، ترلا بہرام خاں، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جب اردو شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہمارے سامنے غزل آ جاتی ہے۔ غزل وہ کافر صنف ہے جس کے سامنے کسی دوسری صنف سخن کا سکہ

رائج نہ ہو سکا۔ ایسے میں اگر کوئی صنفِ سخن اپنا مقام بنالے تو یہ اس کی انفرادیت بھی ہے اور عظمت بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کے بعد اگر کوئی صنفِ سخن اپنی جامعیت کے اعتبار سے معتبر کہی جاسکتی ہے تو وہ مثنوی ہے۔ شاید یہی سبب ہے جس کی وجہ سے حالی نے مثنوی کے بارے میں کہا تھا:

"الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔"

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جن لوگوں نے مثنوی پر کام کیا ان کا دائرہ چند مخصوص اور معروف مثنویوں کے گرد محدود رہا۔ مثنوی کی جس وسعت کی طرف حالی نے اشارہ کیا ہے اس کی طرف سے عام طور سے بے نیازی برتی گئی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ جمود ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اور مثنوی کے فکر و فن پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ اسی سلسلے کا ایک کام کندن لال کندن کی یہ تصنیف ہے۔ جنھوں نے اردو کی تاریخی مثنویوں پر سیر حاصل مقالہ پیش کر کے ایک بڑے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑے گا کہ تاریخی اور غیر تاریخی مثنویوں میں فرق ہوتا ہے۔ تاریخی مثنویوں کا تعلق چونکہ حقائق سے ہے اس لیے شاعر مبالغے سے کام نہیں لے سکتا۔ اور یہی حقیقت نگاری تاریخ کے مرتب کرنے والے کے لیے معاون بھی بن جاتی ہے۔ کندن لال نے اس حقیقت نگاری کے سہارے اس دور کے سماجی اقتصادی اور سیاسی ماحول کو بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ "علم تاریخ سے مراد انسانی معاشرہ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا تذکرہ ہے۔" اس لیے یہ ادبی دستاویز سماجی اور سیاسی تاریخ کی داستان بھی بن گئی ہے۔

کندن لال نے پچپن (۵۵) معروف اور غیر معروف مثنوی نگاروں کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض غیر معروف مثنوی نگاروں کے حالات فراہم نہ ہو سکے مگر ان کو دریافت کر کے آئندہ کام کرنے والوں کے لیے راستہ کھول دیا ہے۔ یہ تمام مثنوی نگار صفِ اوّل کے شعرا میں نہیں ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ معروف مثنوی نگاروں کی تمام تخلیقات بھی ادب کا اعلیٰ نمونہ نہیں ہیں۔ مگر تاریخ ادب کے تسلسل میں ان غیر معروف مثنوی نگاروں اور مثنویوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ مصنف نے دکنی قدیم زبان کی اجنبیت کے باوجود اپنے اسلوب کو سادہ اور عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے مشکل اور اجنبی شاہراہ بھی سہل اور آسان ہو گئی ہے۔

کندن لال کا یہ مقالہ "قطرہ سے گہر ہونے تک" کی داستان ہے۔ ملازمت کی ذمے داریوں کے سبب مدتوں اپنے اس ادبی ذوق کی تکمیل نہ کر سکے۔ مگر اس غم کو سینے سے لگائے رہے۔ ان کی اس چاہ نے راہ پیدا کر دی۔

——ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مصنف: ڈاکٹر منصور عمر
صفحات: ۱۸۲
قیمت: ۵۰ روپے

ملنے کے پتے: (۱) کریسنٹ بکس، اردو بازار، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴۔
(۲) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۴

سات ابواب پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر منصور عمر کی پہلی تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے۔ منصور عمر نے نہ صرف مخدوم محی الدین کی شاعری کی مختلف جہات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے بلکہ مخدوم کی شخصیت اور مخدوم کے دور کے سماجی تہذیبی اور سیاسی پس منظر نیز اس پس منظر کے سبب مخدوم کی شخصیت و شاعری پر پڑنے والے اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چوں کہ مصنف کو ایام طالب علمی سے ہی مخدوم سے دلچسپی رہی، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقالہ مصنف کی طالب علمی سے لے کر اس کتاب کے شائع ہونے تک (۱۹۹۰ء) کے مطالعے اور تلاش و جستجو کا حاصل ہے۔ تحقیق کے ساتھ تنقید کرنا اور پھر اپنا جچا تلا فیصلہ پیش کرنا مصنف کی علمی معلومات اور فکری بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

مخدوم کے سوانح حیات میں سردار جعفری، ظفر محی الدین اور روی نارائن ریڈی کے حوالے سے چند واقعات کا ذکر کر کے مخدوم کی بے لوث غریب پروری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مخدوم کی غریب پروری کا یہی جذبہ تھا جس کے زیر اثر وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ اس ضمن میں مخدوم کی ممنوعہ کتاب "حیدرآباد" کا نام لیا جاسکتا ہے جس کی طرف مصنف نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ مخدوم کی مذکورہ کتاب جنوری، ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اس کی قیمت صرف چھ آنے تھی۔ اس کتاب کے علاوہ مخدوم محی الدین کے دیگر

نثری مضامین یا کتب شائع ہوئیں یا نہیں، یہ بھی تشنۂ تحقیق ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس کتاب کی اشاعت کو وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل سے تعبیر کیا ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو دنیا اس کتاب کی پذیرائی میں کسی بخل سے کام نہ لے گی۔

—— عطا عابدی

ماہنامہ اُکادمی، 22-5/133 ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵

دلّی کے مشاعرے

مرتب: سرور تونسوی
قیمت: ایک سو پچاس روپے
تقسیم کار: ماہنامہ شانِ ہند، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

سرور تونسوی ایک تجربے کار مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے نباض بھی ہیں۔ دیارِ ادب و صحافت کی خاک چھانتے ہوئے وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہو گئے ہیں اور اسی واقفیت کے طفیل انھوں نے دلّی کے مشاعرے جیسی کتاب ترتیب دی ہے۔ ایسی دستاویزی کتاب کے لیے مواد فراہم کرنا اور اُسے تیکھے اور دلچسپ انداز میں پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے کئی برس اَن گنت راتوں کی نیند حرام کر کے دلّی میں جا بجا ہونے والے مشاعروں میں اوّل سے آخر تک شرکت کی اور ان کی روداد کو بڑے دلچسپ اور مؤثر پیرائے میں قلم بند کر کے اردو شاعری کی جو خدمت انجام دی ہے وہ معمولی نہیں۔

کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے ایک بار پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بلکہ لوٹ کر گزرے ہوئے مشاعرے میں جا بیٹھنے کے لیے دل بے چین ہو اٹھتا ہے۔ اس کتاب کا قاری اردو شاعری کے تنوّع، اس کی غنایت اور اس کے تلذذ میں کچھ اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے سارے سامان موجود ہونے کے باوجود اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

'دلّی کے مشاعرے' ایک رواں دواں ادبی عہد کی متحرک اور مستند کہانی سے عبارت ہے کہ اس میں بیخود دہلوی، جوش، یگانہ، فراق، منوّر لکھنوی، گوپال متل، دتاتریہ کیفی، ہری چند اختر، شعری بھوپالی اور دیگر بزرگ شاعروں کے ساتھ ساتھ مضطر کوکڑوی، نریش کمار شاد، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، عدم، احسان دانش اور ان کے بعد اُبھر کر آنے والے شاعروں میں بشیر بدر، مخمور سعیدی اور راج نرائن راز کے علاوہ بہت سارے شاعر اپنی خوش فکری کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی کتاب میں ہماری ملاقات عہد ساز شاعروں کے ساتھ ان کے تمام تر تیوروں کی جھلک دیکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم بذاتِ خود مشاعروں میں بیٹھے انھیں ایک دوسرے پر چھینٹے پھینکتے، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے، ایک دوسرے پر فقرے کستے، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے اور ایک دوسرے کو بیک وقت داد دیتے اور استہزا کا شکار بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

سرور تونسوی نے جوش ملیح آبادی کی گھن گرج، فراق کی جمالیات اور جوش ملسیانی کے زبان و بیان پر استادانہ عبور، گوپال متل کی رجائیت اور جگر کے والہانہ پن کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہر اچھے شعر کو اچھا اور کم زور شعر کو کم زور کہنے سے چنداں گریز نہیں کیا۔ شعر پڑھتے وقت شاعر کی شکل، موڈ اور اطوار اور اُس پر شراب کے اثر کا بھی بھرپور ذکر کرتے ہوئے سرور تونسوی نے ہر شاعر کے ماحول کو ہمارے سامنے ایک تصویر کی طرح پیش کر دیا ہے۔

زمانہ بدلتا ہے شاعری کے دستور بدلتے ہیں۔ والہانہ پن کی جگہ کھردرا احساس اپنی حقیقت منوانے پر تُل جاتا ہے۔ سپاٹ شاعری اپنے نثری انداز کے ساتھ ہماری توجہ کی متقاضی بننے پر بضد نظر آتی ہے۔ ایسے میں غزل اپنے تغزل کی حفاظت کرتے ہوئے 'دلّی کے مشاعرے' میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور ایک تاریخی عہد نامہ مرتب ہوتا ہے۔

کتاب پورے اہتمام سے شائع کی گئی ہے اور شاعروں اور شاعری سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے۔ اردو اکادمی نے مالی اعانت دے کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

—— کنور سین

74 'E'، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۸

آدم زاد

شاعر: اقبال انصاری
قیمت: ۲۰ روپے
ناشر: محمد شیراز F/176، پانڈو نگر، دہلی ۹۲

آدم زاد —— طویل نظم پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب ہے۔ "تعارف" کے تحت رضی بدایونی نے لکھا ہے:

"اقبال انصاری صاحب شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی، ناقد بھی ہیں اور محقق بھی، قسامِ ازل نے انھیں دردمند حساس دل بھی ودیعت فرمایا ہے اور ملک و ملت کی محبت اور انسانی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ بھی، آپ کے دو مجموعۂ کلام "پتھریلی آوازیں" اور "خارستان" کے

عنوان سے شائع ہو کر اربابِ ذوق سے خراجِ
تحسین حاصل کر چکے ہیں"۔
یعنی آدم زاد ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔
آدم زاد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ
سلجھے ہوئے، سنجیدہ اور تعمیر پسند انسان ہیں
زندگی کے متعلق ان کا نظریہ OPTIMISTIC
ہے۔ وہ انسان کو کسی اعتبار سے کمزور تصور نہیں
کرتے بلکہ ان قوتوں اور اوصاف کا ذکر کرتے
ہیں جن کی بنا پر اسے "اشرف المخلوقات" کہا گیا
ہے۔ ان کے الفاظ ہیں ـــــ "انسان کمزور
ہے۔ پر اتنا بھی نہیں کہ کبھی مزاحمت (RESIST)
ہی نہ کرے۔ انسان جامد کردار نہیں ہے...،
متحرک کردار ہے DYNAMIC ہے۔ وہ
مزاحمت کرتا ہے، مزاحمت اس کی فطرت میں
ہے۔ یہ مزاحمت ہی اسے انسان بناتی ہے"۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں انھوں نے انسان
کے اسی وصف کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انسانی
ارتقا کے ایک تصور کے مطابق تشکیلِ کائنات
میں حضرت آدمؑ اور ابلیس کے واقعے کو بڑا دخل
ہے۔ یہ طویل نظم اسی پس منظر میں شروع ہوتی ہے
اور آہستہ آہستہ عروج و ارتقا کی منزلوں سے
گزرتی ہوئی جہاں اختتام پر پہنچتی ہے وہاں
قاری ایک نئے جہانِ معنی میں کھو جاتا ہے۔ طویل
نظم کو ابتدا تا آخر فنی طور پر سنبھالے رکھنا
بڑا اہم کام ہوتا ہے۔ ارتقائے خیال کے ساتھ
نظم کی تعمیر ہوتی چلی جاتی ہے اور انجام کار
ایک خیال سامنے آتا ہے۔ مقامِ مسرت ہے
کہ اقبال انصاری آدم زاد ـــــ جیسی طویل
نظم میں فنکارانہ اعتبار سے کامیاب رہے ہیں۔
زبان میں روانی اور برجستگی ہے، پوری نظم میں
ایک FLOW ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو :

پابوس ہو کے جینا توہینِ زندگی ہے،
سرخیل ہو کے اُٹھنا معراجِ بندگی ہے،
بے نی تو میسولینی، اٹلی کا وہ غضنفر،
وہ حوصلوں کا پربت طاقت کا وہ سمندر،
آہنگری سے اُٹھ کر آہن میں ڈھل گیا تھا
کتنی ہی قسمتوں کی قسمت بدل گیا تھا
بلبن غلام ہو کر آقا بنا تھا اِک دن،
بھیڑیں چرانے والا چاکا بنا تھا اِک دن،
تیمور تھا اپاہج، پر صف شکن بنا تھا
اک پستہ قد بھی اک دن نپولین بنا تھا
تم بھی اک آمرانہ طوفان بن کے اٹھو،
گر مرد ہو تو تم بھی خاقان بن کے اٹھو...

یہ نظم آزاد بھی ہے اور پابند بھی مگر اس
میں ایک موسیقیت اور ترنم ہے جو پڑھنے والوں
کو گرفت میں لیتی ہے۔

ـــــ ارتضیٰ کریم
شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

طلسمِ خیال

شاعر : مشتاق احمد قریشی
سائز : ڈیمائی، صفحات : ۱۹۲
قیمت : آٹھ ہزار پیسے
ناشر : نئے اُفق گروپ آف پبلیکیشنز،
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۷، ناظم آباد
کراچی (پاکستان)

جناب مشتاق احمد قریشی کی آزاد اور پابند
نظموں کا مجموعہ ہے جو بڑے اہتمام سے شائع کیا
گیا ہے۔ سرورق پاکستانی آرٹسٹ ذاکر کے
موقلم کی گلکاریوں سے مزین ہے اور کئی رنگوں
میں چھاپا گیا ہے۔ اندرونی صفحات میں بھی ہر
نظم کے ساتھ ایک اسکیچ شامل کیا گیا ہے جو نظم
کی معنوی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ صفحات کی
تزئین سلیم اختر نے کی ہے اور ہر صفحے کو خوشنما
جدول سے آراستہ کیا ہے۔ متن سیاہ روشنائی میں
اور جدول گولڈن کلر میں چھاپی گئی ہے۔ یہ
امتزاج آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔
ٹائٹل کے علاوہ متن میں بھی ولایتی آرٹ پیپر
استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں قریشی
صاحب کی شخصیت اور شاعری پر لگ بھگ
دو درجن ممتاز ادبی شخصیتوں نے اظہارِ خیال
کیا ہے، ان میں محقق اور ناقد بھی ہیں، شاعر اور
افسانہ نگار بھی اور صحافی اور ادب کے اساتذہ
بھی۔ سبھی نے قریشی صاحب کے شخصی اوصاف اور
شاعرانہ خوبیوں کی تعریف و توصیف کی ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک مشتاق احمد
صاحب قریشی کی نظموں کی نمایاں ترین خصوصیت
ان کا اختصار اور ان میں پائی جانے والی وضاحت
خیال ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے سوچتے یا محسوس
کرتے ہیں اسے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر زبان پر
لے آتے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے :

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

قریشی صاحب کی زبان سے نالہ سرزد ہو یا نغمہ، اس
میں ان کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی
ہیں اور ان کے کلام کو پُر اثر بناتی ہیں۔ قریشی صاحب
کی نظموں کی ایک اور خصوصیت، ان کے لہجے کی
غنائیت ہے اور بعض نظموں میں اس کا اتنا
وفور ہے کہ وہ گیت کے قریب جا پہنچی ہیں۔

جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اُردو میں
کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کوئی اہتمام
نہیں برتا جاتا، اُن تک یہ کتاب ضرور پہنچنی
چاہیے۔

ـــــ محمود سعیدی

اُردو خبر نامہ

انتظار حسین کے ساتھ ایک شام

نومبر ۹۱ء کے پہلے ہفتے میں پاکستان کے مشہور افسانہ نگار اور کالم نویس جناب انتظار حسین ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ دہلی آئے تو اُردو اکادمی نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں انتظار حسین کے ادبی کارناموں کو دہلی کی کئی ممتاز ادبی شخصیتوں نے خراجِ تحسین پیش کیا اور خود انتظار حسین نے بھی اپنے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ مہمانِ محترم کو اکادمی کی کچھ تازہ مطبوعات تحفتہً پیش کی گئیں۔

جناب انتظار حسین اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی کی کوئی بات توجہ سے سن رہے ہیں۔ درمیان میں مخمور سعیدی اور عقب میں پروفیسر شمیم حنفی کو دیکھا جاسکتا ہے۔
دائیں جانب کھڑے ہیں سید شریف الحسن نقوی اور جناب شمس الزماں

اردو تعلیمی میلہ

دہلی اُردو اکادمی نے ۱۳، نومبر سے
بر ۱۹۹۱ء تک، پرانے ذاکر حسین کالج کے
ں بہ یادِ پنڈت جواہر لال نہرو، ایک
رہ تعلیمی میلے کا اہتمام کیا۔ میلے کا افتتاح
رو پولیٹن کونسل کے چیرمین جناب
گوئل نے کیا اور ایسے بارونق میلے کے
ا اور انعقاد کے لیے دہلی اُردو اکادمی نیز
ں شرکت کرنے والے اُردو میڈیم اسکولوں
یف کی۔ وہ اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر
ق عابدی، مشیر سیّد شریف الحسن نقوی
پٹی سیکریٹری جناب بی۔ ایس۔ گیرا کے
سبھی دکانوں پر گئے۔ یہ دکانیں اردو میڈیم
ں کے بچّوں اور بچیوں نے اساتذہ کی مدد
گائی تھیں اور ان پر نمائش یا فروخت کے
ھی جانے والی چیزیں بھی انھی کی تیار کردہ
ں۔ گوئل صاحب نے دہلی سے متعلق تصویروں
تابوں کی نمائش بھی دیکھی یہ دونوں نمائشیں
ے کے دو بڑے کمروں میں لگائی گئیں تھیں۔
موقعے پر پروفیسر عابدی نے گوئل صاحب
درخواست کی کہ وہ اکادمی کے کاموں میں تعاون
ئیں۔ اُردو میڈیم اسکولوں میں ٹیچروں کی جو
ہیں خالی ہیں، اکادمی چاہتی ہے کہ وہ جلد از جلد
ی جائیں۔ تین سو سے زائد ٹرینڈ ٹیچر جو
دمی کی طرف سے مختلف اسکولوں میں جزوقتی
دمت انجام دے رہے ہیں اور پڑھانے کا
ن سے پانچ سال تک کا تجربہ رکھتے ہیں، دہلی
نتظامیہ کو انھیں مستقل کر دینا چاہیے، نیز
کادمی کو یہ اختیار حاصل رہنا چاہیے کہ حسب

پروفیسر اشتیاق عابدی اور جناب بی۔ ایس گیرا، جناب پرشوتم گوئل کے ساتھ

دائیں سے: ڈاکٹر خلیق انجم، جناب کشمیری لال ذاکر، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر خوشحال زیدی اور جناب م۔ افضل

جوائنٹ سیکریٹری ایجوکیشن جناب ایم۔ کے بشرا، پروفیسر اشتیاق عابدی اور ڈاکٹر اسلم پرویز وظائف اور انعامات تقسیم کرتے ہوئے

ضرورت وہ آئندہ بھی جز وقتی ٹیچروں کا تقرر کر سکے۔ گوئل صاحب نے سبھی باتیں توجہ سے سُنیں۔

میلے کے دوران میں بچوں کے ادب پر ایک سیمینار کیا گیا جس میں ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد علی خاں، ڈاکٹر خوشحال زیدی، سید غلام حیدر نقوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کشمیری لال ذاکر، شیخ سلیم احمد اور راجیہ سبھا کے ممبر جناب م۔ افضل نے حصہ لیا۔ نظامت پروفیسر اشتیاق عابدی نے کی۔ ان کے توجہ دلانے پر م۔ افضل صاحب نے کہا کہ وہ اکادمی کے مندرجہ بالا مطالبات سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے اپنے طور پر بھی کوشش کریں گے۔

میلے کے دوران میں پرائمری سے سیکنڈری سطح تک ان طلبہ اور طالبات کو وظائف اور انعامات دیے گئے جو اُردو میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ کل ایک ۱۵۲ وظائف کا اعلان کیا گیا۔

ایک تقریب میں نہرو لٹریسی ایوارڈ ملنے پر جناب کشمیری لال ذاکر کو سپاسنامہ پیش کیا گیا اور شال اڑھائی گئی۔

زبانوں کے ذریعے اتحاد

دہلی کی سنسکرت، ہندی، پنجابی اکادمیوں اور دہلی انتظامیہ کے شعبۂ زبان و ثقافت کے اشتراک سے اُردو اکادمی نے ایک دو روزہ سیمینار منعقد کیا جس میں اُردو کے پروفیسر علی محمد خسرو، ہندی کے پروفیسر نامور سنگھ، پنجابی کے پروفیسر ایس۔ ایس۔ نور اور سنسکرت کے پروفیسر واچاسپتی اپادھیائے شریک ہوئے۔ دوسرے دن کے اجلاس کو پروفیسر اشتیاق عابدی نے بھی خطاب کیا۔ مقررین نے اس

ایک اُردو میڈیم اسکول کی بچیاں قومی گیت پیش کر رہی ہیں

امر پر زور دیا کہ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے اور زبان کو نفرت نہیں محبت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ وطن دوستی اور انسان دوستی دونوں کا یہی تقاضا ہے۔

اُردو ڈراما فسٹیول

پچھلے برسوں کی طرح اس برس بھی دہلی اُردو اکادمی نے ۱۸ر نومبر ۹۱ء سے ۲۳ر نومبر ۹۱ء تک اُردو ڈراما فسٹیول منعقد کیا۔ فسٹیول کا افتتاح نیشنل اسکول آف ڈراما کے سینیئر فیکلٹی ممبر جناب جے۔ این۔ کوشل نے کیا۔ افتتاحی تقریب میں مشہور صحافی جناب شمس الزماں نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ ڈراما، خاص طور سے اُردو ڈراما ملک میں پھیلی ہوئی نفرتوں کی فضا کو ختم کرنے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں بے حد مددگار ہوسکتا ہے۔ اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے کہا کہ اس سال کا ڈراما فسٹیول دو بنیادوں پر گزشتہ تین برسوں کے ڈراما فسٹیول سے مختلف ہے۔ اولاً یہ کہ اس پورے فسٹیول کو اتحاد، یک جہتی، بقائے باہم اور ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی نذر کیا گیا ہے۔ ثانیاً اس بار فسٹیول میں پانچ ایسی ڈراما ٹیمیں شریک ہو رہی ہیں جن کا انتخاب اس میدان میں ان کے نووارد ہونے کے باوجود ان کی بہترین صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے کیا گیا ہے اور ایک ڈراما خود اکادمی کی ورکشاپ کا تیار کردہ ہے جسے اُردو میڈیم اسکولوں کے بچے پیش کریں گے۔

فسٹیول بہت کامیاب رہا اور چھ کے چھ ڈرامے ناظرین نے بہت پسند کیے۔

ڈراما "خانہ جنگی" کا ایک منظر

(تصاویر: سید فدا علی)
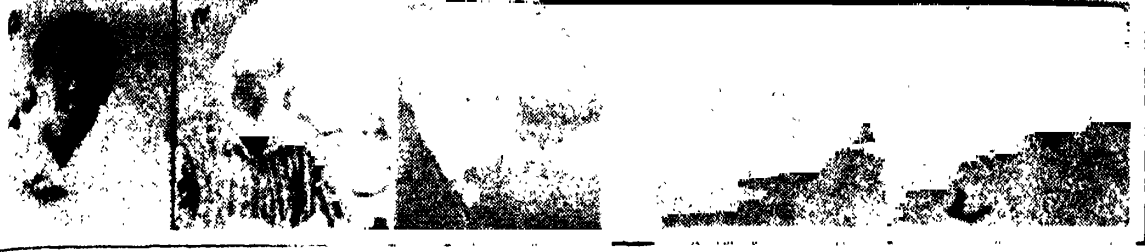
انجمن ترقّی اُردو گلبرگہ کے زیرِ اہتمام ۱۰ نومبر ۹۱ء کو منعقدہ محفلِ افسانہ ـــــ (۱) محمد عبدالعظیم (صدر انجمن)
(۲) انور خاں (۳) سریندر پرکاش (۴) امجد جاوید (۵) جبّار جمیل

سمینار اور مشاعرہ

جواز رائٹرز گروپ، مالیگاؤں کی جانب سے مرحوم احمد نسیم میناگری کے مجموعۂ کلام "خاک رنگ" اور شبّیر آصف کے شعری مجموعے "مٹی کے حوالے" کی رسم اجرا کے سلسلے میں سمینار اور مشاعرہ ہوا۔ اس موقع کی ایک تصویر ـــــ مائیک پر پروفیسر امان اللہ خاں، سیّد عارف (مدیر جواز) اختر الایمان (ابن احمد نسیم میناگری) انجم رومانی، عزیز قیسی، حسن کمال، فضیل جعفری، شبّیر آصف، مصطفٰی ماہر۔

مدھیہ پردیش یوتھ کانگریس کی جانب سے سرونج میں قومی یک جہتی پر آل انڈیا مشاعرہ کیا گیا۔ اس موقعے پر دلکش ساگری مرحوم کی کتاب "خرامِ حرف" کا اجرا بھی ہوا ــــــ تصویر میں: دانش مانوی، ساجد علی، افتخار امام صدیقی، مخمور سعیدی، ظفر صہبائی، رجب بھائی، محمد طاہر، محمد ناصر اور "خرامِ حرف" کا اجرا کرتے ہوئے مکیش نایک (صدر ایم. پی یوتھ کانگریس)۔

آپ کی رائے

▲ نومبر ۹۱ء کے "ایوانِ اُردو" میں عظیم اختر کا خط کسی حد تک سچائی پر مبنی ہے۔ آپ نے خط کے ایک حصّے کا جواب اپنے اداریے میں دے دیا لیکن دیگر باتوں کا جواب ابھی باقی ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں مَیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ پرائیویٹ اُردو اسکول ٹرسٹیوں کے قبضے میں سسک رہے ہیں۔ ٹرسٹی اپنی جیبیں گرم کرنے کے لیے جدّوجہد تو کرتے ہیں لیکن تعلیمی معیار کو اوپر اُٹھانے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ان لوگوں میں نظم و ضبط پیدا کرنا اُردو کے فروغ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ اُردو اسکولوں کا غیر معیاری تعلیمی نظام لوگوں کو اُردو سے متنفّر کر رہا ہے۔

۲۔ عام طور پر اُردو گریجویٹ اور اسکالر کو اوروں کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کا ماہر، مدبّر اور دانشور اگر انگریزی سے ناواقف ہے تو اس کی قابلیت پہ شک کیا جاتا ہے۔

۳۔ اُردو کا تنقیدی ادب مغربی حوالہ جات سے پُر ہوتا ہے۔ غیر محسوساتی طور پر دانشور حضرات اپنی تحریروں سے عوامی طبقے کو اُردو سے، اُردو اخبارات و رسائل کے ذریعے ہی دور لے جا رہے ہیں۔ ان کی تحریر لوگوں کے اندر انگریزی نہ جاننے کا احساس تو پیدا کرتی ہے لیکن اُردو سے محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ صاحبانِ علم و فن اُردو کے قارئین کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے یا پھر شاید اپنا احساسِ برتری دکھانے کے لیے ہی مضامین لکھتے ہیں۔

۴۔ متموّل اور متوسّط طبقے میں اُردو اخبارات و رسائل کا چلن ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ انگریزی اخبارات و رسائل خرید کر ایک احساسِ برتری محسوس کرتے ہیں۔ غریب طبقہ ان کے احساسِ برتری سے متاثر ہو کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

۵۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستان میں آزادی کے بعد اُردو کا سیاسی، سماجی اور معاشی مستقبل بُری طرح تباہ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ تباہی ہمارے اپنے ہاتھوں آئی ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما، مدبر اور دانشور حضرات اپنا سیاسی اثر و رسوخ صرف اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ اُردو کے تعلیمی مسائل سے واقف ہوتے ہوئے بھی صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔

۶۔ نوکریوں میں اُردو کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے۔ تجارتی شعبوں میں بھی اُردو کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا جس زبان کی سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت نہ ہو اسے بھلا کوئی کیوں اختیار کرے گا۔

—— محمود شیخ، جبل پور

▲ نومبر ۹۱ء کا شمارہ تاخیر سے ملا۔ "حرفِ آغاز" کے تحت عظیم اختر صاحب کے مراسلے پر تبصرہ کرتے ہوئے اُردو زبان سے متعلق آپ نے جو کچھ کہا ہے اسے پڑھا اور پھر فاضل مراسلہ نگار کی رائے بھی پڑھی۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان ہندستان کے سماجی، تہذیبی اور لسانی اشتراک کی پیداوار ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ یہ زبان تب وجود میں آئی جب عربی، فارسی اور تُرکی زبان جاننے والے مسلمان ہندستان آئے۔ اُردو کے جو حروفِ تہجی ہیں وہ صرف اور صرف عربی اور فارسی حروفِ تہجی سے ماخوذ ہیں*۔ یہ اس بات کی حتمی دلیل ہے کہ اُردو زبان کی تشکیل و ترویج میں مسلمانوں نے کلیدی رول ادا کیا ہے اور آج بھی زیادہ تر مسلمان ہی اس کے لیے کوشاں ہیں۔ یورپین ممالک میں بھی پاکستانی تارکینِ وطن (مراد ہیں مسلمان) اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں جب کہ ہندستانی تارکینِ وطن (مراد ہیں غیر مسلم) اُردو کے تئیں عدم دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔

آپ نے اپنے موقف کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اُردو زبان میں غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور کر رہے ہیں اس میں کوئی

---

* یہ دعویٰ درست نہیں۔ اُردو میں غیر عربی اور غیر فارسی آوازیں بھی موجود ہیں۔ کیا ٹ، ڈ، ڑ، جیسے حروف اُردو کے حروفِ تہجی میں شامل نہیں؟ —— م۔ن

تک نہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد خورد بینی ہے۔

اُردو زبان کس کی ہے؟ یہ سوال اگر آپ ایک سَو غیر مسلموں سے کریں گے تو کم از کم اسّی غیر مسلم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ ایک طرف تو غیر مسلم کہہ رہے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور دوسری طرف مسلمان اسے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے مسائل پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔

میں نے ایک اُردو اخبار میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے"۔ اس مقالے میں میں نے جس مرکزی خیال کا اظہار کیا تھا، وہ یہی تھا کہ "اُردو اگرچہ ایک مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے اور ایک مشترکہ سماج میں ہی پروان بھی چڑھی ہے لیکن اس کے باوجود عام بول چال سے لے کر تصنیف و تالیف تک یہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اُردو زبان کو جب جب بھی سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا ساتھ مسلمانوں نے پورے خلوص اور جوانمردی کے ساتھ دیا ہے۔ آج بھی اُردو کا مستقبل مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لیے اب اُردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے۔ مسلمانوں کو اسے اپنی تحویل میں لے لینا چاہیے۔ اگر مسلمانوں نے اُردو کو اپنی زبان قرار دے دیا تو باوجودیکہ مسلمان خود بھی نت نئے مسائل سے دوچار ہیں، اس کا آدھا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔"

ممکن ہے میرے اس خیال سے کچھ لوگ اختلاف کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اُردو زبان کی ملکیت واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہی اُردو اس قدر مسائل سے دوچار ہے۔

——— محمد فاروق اعظم، بھاگلپور

▲ نومبر کے اداریے میں آپ نے اُردو کے معروف قلم کار جناب عظیم اختر کے خط کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ آپ کا اداریہ پڑھنے کے بعد جناب عظیم اختر کا خط پڑھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُردو ہمیشہ سے ایک مخصوص طبقے کی زبان رہی ہے۔ دوسری طرف 'کتاب نما' (نومبر ۹۱ء) کے مہمان مدیر اجمل اجملی اپنے اداریے میں تاشقند یونیورسٹی کے اُردو کے اُستاد ڈاکٹر تاش مرزا خاں مرزا تیف کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ اُردو اب صرف مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے۔ مجھے ان ہر دو حضرات سے اختلاف ہے۔

اُردو ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ اُردو کی پیدائش مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے میل جول سے ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس زبان کا خمیر ہی مشترک ہو اسے مشترکہ زبان کیوں نہ کہا جائے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی کے بھی بے شمار الفاظ ہیں۔ اگر یہ صرف ایک مخصوص طبقے کی زبان ہوتی تو اس میں کئی زبانوں کے الفاظ اس کثرت سے شامل نہ ہوتے پھر اُردو زبان کی پیدائش سے لے کر آج تک اس میں بے شمار ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں جو ایک "مخصوص طبقے" سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر تقسیم ہند سے قبل غیر مسلموں کے لیے اُردو پڑھنا ایک مجبوری تھی تو آج کون سی مجبوری ہے جو غیر مسلموں کو اُردو پڑھنے اور لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ تو اُردو زبان کی شیرینی اور لطافت ہے کہ جو ایک دفعہ اس کے ذائقے سے آشنا ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اُردو صرف ایک مخصوص طبقے کی زبان کبھی نہیں رہی اور نہ ہی یہ صرف قرآن اور حدیث کی تفسیر کی زبان ہے۔ قرآن اور حدیث کی تفسیر تو ہر اس زبان میں ملے گی جس کے جاننے والے مسلمان ہیں۔ اُردو صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے بیشتر ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جس کا ثبوت دُنیا بھر سے نشر ہونے والے اُردو پروگرام ہیں اور دُنیا کی ہر بڑی یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ بھی قائم ہے۔

اب آئیے ذرا اس سوال پر غور کریں کہ اُردو کو ایک مخصوص طبقے کی زبان کیوں کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے اپنے اداریے میں کہا ہے کہ تقسیم ہند نے اس زبان کو بڑا صدمہ پہنچایا مگر اس سے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو جہاں ایک طرف اس سے اُردو زبان کو فائدہ پہنچا وہیں دوسری طرف نقصان بھی پہنچا۔ یہاں اُردو اور ہندی کو دو شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ انگریزوں کی ایک چال تھی جس کے نتیجے میں اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جانے لگا اور جب تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا تو کچھ موقع پرست سیاسی لیڈروں نے ذاتی مفاد کی خاطر اُردو کو ایک مخصوص طبقے سے جوڑ دیا۔ ایسے مفاد پرست سیاسی لیڈر آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اب اُردو والا طبقہ ہی اس نظریے کو اُچھال رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس زبان کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوا بلکہ میرے خیال میں اُردو کا عہدِ زرّیں تو اب شروع ہوا ہے۔ جیسا کہ جناب عظیم اختر نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ اُردو کے عوامی ذوق کے رسالے ہزاروں کی تعداد میں

صرف دہلی کے گلی کوچوں میں فروخت ہوتے
ہیں۔ یہ رسالے خواہ معیاری ہوں یا غیر معیاری
ہیں تو اُردو کے ہی اور آپ کی تحریر سے یہ
جاننے کے بعد کہ دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے
چلائے جانے والے اُردو کوچنگ مراکز کے طلبہ میں
۹۰ فی صد تعداد غیر مسلموں کی ہوتی ہے میرا یقین
اور پختہ ہوگیا ہے۔

——— اقبال حسن آزاد، مونگیر

▲ نومبر کا "حرفِ آغاز" پڑھ کر ایک واقعہ
یاد آگیا آپ بھی سُن لیجیے :
اپریل ۱۹۹۱ء میں ہم لوگ تفریح کے لیے
شملہ گئے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کے لیے کچھ
برتنوں کی ضرورت تھی۔ میں ایک برتن کی دُکان
میں گیا۔ دُکان پر ایک ۱۸ سال کا لڑکا اُردو
کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ
مسلمان ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ جہاں تک مجھے
یاد پڑتا ہے اُس نے اپنا نام اشوک کمار بتایا
تھا۔ میں نے کہا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ اُردو کو
ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور بار بار اس زبان کے
خلاف آواز اُٹھاتے ہیں۔ یہاں ہماچل پردیش
میں بھی ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو اُردو کو ختم
کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لڑکے نے برجستہ
جواب دیا "وہ خود ختم ہو جائیں گے اُردو کو
کیا ختم کریں گے۔"
مظہر الزماں خاں کا افسانہ "آخری تماشا"
حاصلِ شمارہ ہے۔ بہت دِنوں کے بعد اتنا اچھا
افسانہ پڑھنے کو ملا۔ انور خاں نے اچھا ترجمہ
کیا ہے۔

——— حسرت مونگیری، مونگیر

▲ "زبان کسی خاص تہذیب کی ترجمان
ہوسکتی ہے کسی مخصوص مذہب کی نہیں" حرفِ آغاز
کے تحت آپ نے بالکل سچ بات کہی ہے
اور اس سچ کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔
"یونہی تو نہیں جینا" افسانہ بہت ہی
اچھا لگا اور یہ احساس ہوا کہ انور خاں اچھے
افسانہ نگار تو ہیں ہی اچھے ترجمہ کار بھی ہیں۔
جمشید مسرور صاحب کی غزل بطور خاص
پسند آئی۔ اُن کا یہ شعر تو مجھے بہت ہی پیارا لگا :

آندھیاں سی چلتی ہیں ذہن کے دریچوں میں
آج کتنی شدت سے پھر کسی کی یاد آئی

——— شہاب اختر شہاب، جھریا

▲ ادبی رسائل کی روایات میں سے ایک
روایت یہ بھی ہے کہ ان میں عموماً غیر مطبوعہ
تخلیقات ہی خواہ وہ نثری ہوں یا شعری،
شائع کی جاتی ہیں۔ "ایوانِ اُردو" کے نومبر ۱۹۹۱ء
کے شمارے میں جناب تابش مہدی کی جو غزل
شائع ہوئی ہے وہی غزل پنجاب سے شائع ہونے
والے ادبی جریدے "پروازِ ادب" کے تازہ شمارے
برائے مارچ/اپریل ۹۱ء میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔
یہ ایک غیر ذمّے دارانہ فعل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ
دیگر مُدیران کی طرح آپ نے بھی موصوف سے
تصدیق نامہ حاصل کیا ہوگا کہ ان کی ارسال کردہ
تخلیق غیر مطبوعہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایسے
تخلیق کاروں کی جو متذکرہ بالا حرکتوں سے باز
نہیں آتے ایک سیاہ فہرست مرتب کی جائے اور
ان کی تخلیقات کو شاملِ اشاعت نہ کیا جائے۔
امید ہے آپ اپنے موقف سے آگاہ کریں گے۔*

——— محمد توحید الحق، کامٹی

* آپ کا یہ خیال درست ہے کہ مصنفین کو اس معاملے میں
احتیاط برتنی چاہیے۔ تابش مہدی صاحب کی غزل کے
بارے میں اور بھی کئی خط ہمیں ملے ہیں۔

——— ادارہ

▲ "ایوانِ اُردو" نومبر ۱۹۹۱ء دیکھا۔ کاشی ناتھ
پنڈت کا مضمون تو تبصرہ ہے۔ شاید انھیں کوئی
مبصّر نہیں ملا اسی لیے انھوں نے اپنی کتابوں پر
خود ہی تبصرہ لکھ بھیجا ہے۔ خورشید ملک نے
افسانے میں دورِ جدید اور دورِ قدیم کا اچھا ام
کیا ہے۔ شبیہہ عبّاس کا افسانہ "اَن کہی" ش
کرکے آپ نے "ایوانِ اُردو" کے صفحات ضائع
ہیں۔ "آخری تماشا" اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ افسا
میں صرف "یونہی تو نہیں جینا" پسند آیا۔ پرو
ید اللہ مہدی) اگرچہ ایک منفرد شخصیت کا نام
مگر "زمینی اڑن طشتریاں" ہوائی اُڑان
سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جناب رفعت سروش
نظم پڑھ کر ایک بار میں بھی ماضی کی وادیوں
کھو گیا۔

——— آفاق عالم صدیقی، دربھ

▲ نومبر کے شمارے میں جناب عبد القو
دسنوی کا مضمون "مصاحبہ نگاری" پڑھا۔ گذ
ماہ اسی موضوع پر جناب عزیز الحسن جعفر
کا مضمون بھی دیکھا تھا۔ یہ آپ نے اچھا کی
قارئین کو تقابلی مطالعے کے لیے مواد فراہم کر
میرے خیال میں جعفری صاحب کے مضمون میں
تنظیم و ترتیب اور انوکھا پن پایا جاتا ہے جبکہ
دسنوی صاحب کے مضمون میں کچھ باتیں تو اہم
ہیں اور کچھ تحصیل حاصل۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ دسنوی صاح
نے بھی مضمون تیار کرنے میں کافی محنت و مشقت
کی ہے۔ ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے انٹر
کا ذکر صرف دسنوی صاحب نے ہی کیا ہے
جعفری صاحب اس تک نہیں پہنچ پاتے ہیں
مگر اس میں دسنوی صاحب نے اس نکتے کو
نظر انداز کر دیا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے
انٹرویو نشر کرنے سے پہلے ریکارڈ کر لیے جاتے
ہیں اور ایڈیٹنگ کے بعد ہی انھیں براڈکاسٹ
کیا جاتا ہے۔

——— محمد یٰسین، دہلی

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر :

پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد : ۵ —— شمارہ : ۱۰ | فی کاپی ۲/۵۰ روپے / سالانہ قیمت ۲۵ روپے | فروری ۱۹۹۲ء

فون نمبر

۳۲۷۶۲۱۱

۳۲۶۳۴۴۸

ماہنامہ "ایوانِ اردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔
مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس : تنویر احمد
سرورق، عمل : ارشد علی خاں

پروفیسر اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا
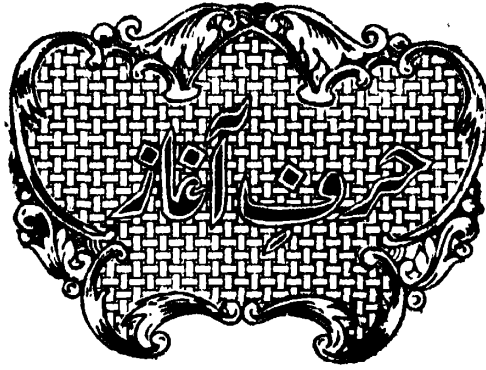
ادب میں طرفداری اگر سخن فہمی کی بنیاد پر ہو تو نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے، اس سے صحیح ادبی سمتوں کے تعیّن میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً غزل گوئی میں اگر غالب کو ذوق پر اور قصیدہ نگاری میں ذوق کو غالب پر ترجیح دی جائے تو یہ ان دونوں شاعروں کے تئیں ایک درست رائے کا اظہار ہوگا اور اس رائے کی روشنی میں ہم انھیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ لیکن اگر دونوں میں سے کسی کا طرفدار یہ کہے کہ ایک کو دوسرے پر بہر اعتبار فضیلت حاصل ہے تو اس کی یہ رائے ایسی طرفداری پر مبنی ہوگی جس میں سخن فہمی کا کوئی دخل نہ ہوگا اور انصاف پسند لوگ اسے ردّ کردیں گے۔

شعر و ادب کی قدر شناسی میں ذاتی پسند اور ناپسند سے یکسر صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی اساس کیا ہے؟ پُرانے زمانے میں پسند اور ناپسند کی بنیاد بالعموم مروّجہ ادبی اور شعری میلانات اور شعر و ادب سے وابستہ افراد کے ذہنی اور جذباتی رویّے ہوا کرتے تھے اور ان رویّوں کو معاشرے میں ایک عمومی اعتبار بھی حاصل تھا۔ جس معاشرے نے خواجہ میر دردؔ کا اعتراف اور احترام ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے کیا، اسی معاشرے نے ان کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ کی مثنوی "خواب و خیال" کی پذیرائی بھی کی جو ایک جنسی عشقیہ واردات کا بیان ہے۔ خواجہ میر دردؔ کی شاعری کو پسند کرنے والوں نے شاید مثنوی خواب و خیال کا مطالعہ زیادہ ذوق و شوق سے نہ کیا ہو اور مثنوی کے قارئین کے لیے غالباً میر دردؔ کی شاعری زیادہ پُرکشش نہ رہی ہو لیکن ان دونوں ہی گروہوں کے اخلاص و اعتبار پر شک نہ اُن کے زمانے میں کیا گیا ہوگا نہ آج کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کی ترجیحات کسی مصلحت پر نہیں، شاعری کے ساتھ ایک بے لوث تعلقِ خاطر پر مبنی تھیں اور اس تعلقِ خاطر میں سخن فہمی کے ایک معیار کو بھی دخل تھا۔

ایک زمانے تک نقدِ سخن کا پیمانہ فنّی محاسن یا معائب رہے۔ 'کس نے کہا؟' یا 'کیا کہا؟' سے زیادہ سروکار نہ رکھتے ہوئے اصل توجہ 'کیسے کہا؟' پر صرف کی جاتی تھی۔ اقبالؔ یا سیمابؔ کی کیفیاتِ مزاج داغؔ سے یکسر مختلف تھیں لیکن دونوں نے داغؔ کی شاگردی قبول کی کیوں کہ داغؔ سے یہ گُر سیکھا جاسکتا تھا کہ جو کچھ کہا جائے، کیسے کہا جائے! فنّی محاسن اور معائب پر مبنی نقدِ سخن کی کسوٹی کتنی معتبر تھی، اس کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ جو ادیب اور شاعر کل اس کسوٹی پر پورے اترے تھے، ان کی ادبی اور شعری حیثیت نہ صرف یہ کہ آج بھی مسلّم اور مستحکم ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مستحکم اور زیادہ روشن ہوتی جارہی ہے۔

ہمارے ہاں غیر ادبی بنیادوں پر ادبی فیصلے صادر کرنے کا سلسلہ ترقّی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا۔ انجمن ترقّی

پسند مصنّفین عالمی اشتراکی تحریک کا ایک محاذی ادارہ تھی اور یہ ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ترقی پسند ناقدوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو آگے بڑھایا جو اپنی فنکارانہ ذمّے داریاں بھلاکر ان کے ہمنوا ہو گئے۔ فنّی پیمانے پسِ پشت ڈال دیے گئے اور سیاسی نعرہ زنی کو شعر و ادب کی کسوٹی قرار دے دیا گیا۔ اب 'کیسے کہا؟' پر کسی کی توجہ نہیں تھی، صرف 'کیا کہا؟' سے سروکار تھا۔ ردِّ آزادی میں فیضؔ کی نظم جس کا یہ شعر بعد میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا :

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس لیے قابلِ ردّ ٹھہری کہ فیضؔ نے براہِ راست اندازِ بیان اختیار نہ کر کے تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کی تھی جس سے شاعر کی 'بورژوا' ذہنیت ظاہر ہوتی تھی۔ دوسری طرف مظفرؔ شاہجہانپوری جیسے شاعروں پر اس قسم کے اشعار کے لیے داد و تحسین کے پھول برسائے گئے :

اُس طرف روس، اِدھر چین، ملایا، برما
اب اجالے مری دیوار تک آ پہنچے ہیں

سوال یہ ہے کہ اب، کہ ان اُجالوں کا بھرم پاش پاش ہو گیا ہے، ان اُجالوں کی نقیب شاعری کو، جو فنّی قدر و قیمت سے عاری ہے، ایوانِ شعر و ادب کے کس گوشے میں جگہ دی جائے گی؟

جیسا کہ سطورِ بالا سے ظاہر ہے، ترقی پسندوں نے ادبی قدر شناسی کی جس روش کو فروغ دیا ہم اُس کے موّید نہیں لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ان کا طریق کار سیاسی مفادات کا تابع تو تھا لیکن اس میں ذاتی مفادات زیادہ دخیل نہیں تھے۔ اب انجمن ترقی پسند مصنّفین کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ترقی پسند ناقدوں کا دبدبہ بھی باقی نہیں رہا —— اس کا سہرا جدید ادیبوں اور شاعروں کے سر بندھنا چاہیے جو اپنے پیشروؤں کے برعکس فکر و خیال کی آزادی سے دستبردار نہیں ہوتے اور اپنی تخلیقی اپج سے کسی 'ہادیِ برحق' کی رہ نمائی کے بغیر احساس و اظہار کی نئی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ لیکن موجودہ ادبی صورتِ حال کا ایک پہلو نہایت افسوسناک ہے۔ کچھ لوگوں نے جدید شعر و ادب کی قدر شناسی کا قرعہ خود اپنے نام نکال لیا اور اس قدر شناسی کی کسوٹی بنایا 'کس نے کہا؟' کو۔ ان لوگوں کو نہ اس سے کچھ غرض ہے کہ کہنے والے یا لکھنے والے نے کیا کہا یا کیا لکھا، نہ اس سے کچھ سروکار کہ کیسے کہا یا لکھا؟ ان کی نظر صرف اس پر رہتی ہے کہ کہنے والا یا لکھنے والا کون ہے؟ اور کسی کہنے والے یا لکھنے والے کی خوشنودی حاصل کر کے یا کسی کو ناخوش کر کے ہم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟ جی ہاں کچھ فائدے اگر کسی کو خوش کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں تو کچھ فائدے کسی کے ایما پر کسی کو ناخوش کر کے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کیجیے کہ یہ فائدے علمی یا ادبی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کاروبار کے پیچھے خالصاً مادّی اغراض کارفرما ہوتی ہیں اور اس سے محض منصب خواہی اور زر طلبی کی دنیاوی خواہش کی تسکین کا سروسامان فراہم کیا جاتا ہے۔ نتیجتہً پچھلے چند برس میں ایسے کئی قلمکاروں کے سروں پر عظمت و فضیلت کے تاج رکھے گئے ہیں جن کی بہ طور ادیب یا شاعر فرومایگی اور بے بضاعتی اظہر من الشمس سہی لیکن جو صاحبِ ثروت یا صاحبِ اقتدار ہیں اور اپنے کاسہ لیسوں کو ان کی کاسہ لیسی کی مُنہ مانگی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ ادب کے نام پر اس غیر ادبی کاروبار اور اس میں ملوث لوگوں کو اگر جلد ہی بے نقاب اور بے وقار نہیں کیا گیا تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے :

وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

—— مخمور سعیدی

مظفر حنفی

یادوں کے جگنو اُڑتے ہیں، شامِ غم ہے
زخموں کی اک فصل اُگالے، مٹی نم ہے

پل میں راون، پل میں رام، نہ جانے کیا ہوں
میرے اندر نور و ظلمت کا سنگم ہے

جھوٹے موتی ہنستے ہیں سچے موتی پر
شہرت میں فردوسی سے آگے رستم ہے

یوں ہی بیٹھے رہیے پھولوں کے جھرمٹ میں
غالب کی مانند ابھی آنکھوں میں دم ہے

نیزے پر آویزاں ہو کر دیکھ رہا ہوں
میری سرافرازی پر دنیا برہم ہے

پیروں سے لپٹی ہیں زنجیریں مٹی کی
ہاتھوں میں منہ زور ہواؤں کا پرچم ہے

اور مظفر دنیا سے کیا لینا دینا
اب تو غزلیں کہنے کی بھی فرصت کم ہے

مظفر حنفی
اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

لطف الرحمٰن

دیوار و در بھی، چھت بھی، مرا گھر بھی لے گئے
جھونکے ستم کے مسجد و منبر بھی لے گئے

شائستگیِ عشق کا زیور بھی لے گئے
یعنی خیال و خواب کا دفتر بھی لے گئے

اب میں ہوں اور دھوپ کا صحرا ہے سامنے
ظالم ترے خیال کی چادر بھی لے گئے

ٹھہرا ہوا ہے ایک ہی موسم نگاہ میں
وہ اپنے ساتھ وقت کا محور بھی لے گئے

ہر چیز اپنے آپ میں خالی ہے ان دنوں
یا وہ نواحِ چشم سے منظر بھی لے گئے

اب کوئی گھاٹ ہے، نہ کنارہ کوئی مرا
دریا کے ساتھ ساتھ وہ پتھر بھی لے گئے

پروفیسر آف اردو، بھاگلپور یونیورسٹی ۸۱۲۰۰۷ (بہار)

ساجدہ زیدی

رات گہری ہے تو پھر غم بھی فراواں ہوں گے
شعلہ زن سرخ شرارے سرِ مژگاں ہوں گے

یوں ہی گر لٹتے رہے قافلے ان راہوں میں
بستیاں، شہر، سبھی شہرِ خموشاں ہوں گے

ناخداؤں کی خدائی کا فسوں ٹوٹ گیا
کشتیاں ڈوبیں گی، ساحل پہ بھی طوفاں ہوں گے

کیسے اس شہرِ خرابی میں بسر کی ہم نے
کل جو آئیں گے وہ انگشت بدنداں ہوں گے

شام سے دل میں ترازو ہے کوئی تیرِ ستم
رات گزرے گی نہ خوابوں کے شبستاں ہوں گے

دید کا بارِ امانت نہ اٹھے گا اس شب
خونچکاں صبح تلک دیدۂ حیراں ہوں گے

ساجدہ زیدی
گلبرگ، دودھ پور، سول لائن، علی گڑھ (یو۔پی)

ماریشس عالمی اُردو کانفرنس

ایک عہد آفریں تجربہ

اشتیاق عابدی

فلیٹ نمبر ۱۰۵، بلاک ۲، ساتویں منزل، قطب اپارٹمنٹس،
کٹوریا سرائے، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

"اچھا لگتا ہے"، "سب کچھ اچھا لگتا ہے"، "یہ بھی اچھا لگتا ہے"، یہ ہیں وہ لفظ جو ۹، دسمبر سے ۱۱، دسمبر ۱۹۹۱ء کی رات دیر گئے تک چلنے والی پہلی سرکاری عالمی اُردو کانفرنس ماریشس کے مشاعرے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقریر اور پاکستانی مندوب اور شاعر سُلطان سکون کی نظموں میں ماریشس کے تعلق سے بار بار۔ اور ہر بار ایک نئے ثقافتی، سماجی، شعوری معنی کے ساتھ استعمال ہوئے۔ اور جن پر آٹھ مُلکوں سے آئے ہوئے ساٹھ سے زیادہ مندوبین نے جھُوم جھُوم کر خراجِ تحسین اس لیے ادا کیا کیوں کہ یہ سچ ہے کہ پورا جزیرہ ماریشس بے حد حسین ہے۔ وہاں کے لوگ اچھے ہیں۔ اُن کے دِل میں مُحبّت اور دوستی اور یگانگت کا ویسا ہی اتھاہ سمندر موجزن ہے جیسے اتھاہ سمندر بحرِ ہند میں ہندستان کے مغربی ساحلوں سے کم از کم ۵ ہزار کیلو میٹر کے فاصلے پر یہ چھوٹا سا مُلک واقع ہے۔

دراصل "اچھا لگتا ہے" وہ خوبصورت، حادثاتی مگر تاریخی فِقرہ تھا جو ۶، دسمبر کو ہندستانی وفد کے اعزاز میں ہونے والی پہلی ہی تقریب میں صدر قومی آرگنائزنگ کمیٹی جناب مُکیشور چنی (وزیرِ آرٹ، کلچر، اصلاح اور تفریح) نے اپنی افتتاحی تقریر میں استعمال کیا۔ پھر تو یہ فِقرہ ایسا رائج ہوا کہ ۶، دسمبر سے ۱۲، دسمبر تک پورے ایک ہفتے میں ہر مجلس میں عام ہوگیا اور بار بار جس کا استعمال تقریباً ہر ڈیلیگیٹ نے موقعوں اور جگہوں کی تبدیلی کے باوجود تہ در تہ معنی کے ساتھ کیا یہاں تک کہ انتہائی نیک اور اچھے معنوں میں وزیرِ موصوف کا نام ہی "اچھا لگتا ہے منسٹر" پڑ گیا۔ جو آئندہ شاید ہمیشہ ہی ان کے نام سے جُڑا رہے گا۔ جب ہندستانی وفد کے لیڈر عزّت مآب جناب محمد شفیع قریشی گورنر بہار نے دوسری ہی نشست میں انھیں یہ خطاب دے دیا تو صرف اپنے ہی جذبات کی نہیں بلکہ ہندستان، پاکستان، روس، ناروے، سعودی عرب، فرانس، کناڈا اور جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے ہر ڈیلیگیٹ کے واقعی دِلی جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

کُل ۱۸۶۰ مُربّع کلومیٹر میں واقع جزیرہ ماریشس اور اُس میں شامل رودریکس، اگالیگا اور سینٹ بریندون جزیروں کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت نے اپنے ساری فطری حُسن کا خزانہ خالی کر دیا ہو۔ وہاں کے بے حد حسین مناظر، چھوٹی چھوٹی بے حد سبز و شاداب پہاڑیاں، دامانِ کوہ میں بنے کھلونوں جیسے رنگا رنگ پُرسکون مکان، انتہائی عمدہ سڑکیں، کسی قسم کے شور کے بغیر خاموشی کے ساتھ چلی جا رہی ٹریفک۔ پھل، بے حد خوبصورت پھول۔ چاروں طرف یا تو عقبی سمندروں کی نیلاہٹ یا ہرے بھرے سبزہ زار، منظم، آپس میں اور دوسروں سے محبّت کرنے والے عام لوگ۔ وہاں کی حکومت کے گورنر جنرل، وزیرِ اعظم اور وزرا سے لے کر انتہائی نچلی سطح کے کارکن تک تمام طبقوں میں نمایاں یک جہتی، سادگی، جمہوری طرزِ عمل۔ اور دوسروں کے کہنے پر نہیں۔ مہمانوں کو کب، کہاں اور کیا کیا چاہیے کا احساس اور اُسے فراہم کرنے کی کوشش۔ بھرے پرے پُر رونق بازار۔ ہر جگہ، ہر چیز سلیقے اور انتہائی صفائی اور ستھرائی کے ساتھ موجود۔ اِن تمام عناصر کا مجموعی تاثر صرف اور صرف یہی ہو سکتا تھا۔ ہُوا اور باقی رہے گا کہ ماریشس واقعی اِس دُنیا میں جنّت کا ایک جیتا جاگتا ٹکڑا ہے جس کی ہر بات کی، ہر چیز کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔

یہ احساسات صرف راقم کے نہیں، بلکہ ہندستانی وفد کے لیڈر قُریشی صاحب، پاکستان کی بلند قامت علمی شخصیت جنابِ جمیل جالبی، ناروے کے ہر چرن چاولہ، مسحور کُن رُوسی مندوب لدمیلا واسلی وا، کناڈا کے ولی عالم شاہین، فرانس کے پروفیسر الین دِی سویتِرز، جنوبی افریقہ کے پروفیسر حمید الحق ندوی، سعودی عربیہ کے جنابِ احمد نسیم ہجمی کے تھے جن کو اُنھوں نے مختلف

مواقعے پر تقریباً انھی الفاظ میں دوہرایا۔
ایسے ماحول میں کانفرنس کو کامیاب ہونا ہی تھا۔ قیام وطعام، مہمان نوازی، ادبی مذاکرات اور بحثوں میں کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں کسی کمی کا احساس ہوا ہو۔ کمی کا احساس اور شدید احساس ہوا تو یہی کہ ایسی کانفرنس اب تک اُردو کے گہوارے ہندستان میں کیوں نہیں ہوئی؟ اُردو سرکاری زبان والے ملک پاکستان میں کیوں نہیں ہوئی؟ انگلینڈ، شمالی امریکہ اور کناڈا میں کیوں نہیں ہوئی جہاں اُردو والے اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں؟ یہ راہ دکھانے کا تاریخ ساز کام ہوا بھی تو سرزمینِ ماریشس پر ہوا اور ہر لحاظ سے مکمل طور پر ہوا۔ ماریشس نے ایک ایسی مثال پیش کی ہے، قائم کی ہے، جس سے بہتر تو ممکن نہیں لیکن جس کی تقلید کرکے اُردو کے اس محبت اور دلوں کو جوڑنے والے سفر کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور بڑھانا چاہیے۔ آج اُردو دُنیا کے مُلکوں کی حکومتیں جو کر رہی ہیں یا اُن علاقوں میں نفرتوں، غلط فہمیوں، غلبہ گیری اور تشدد کا جو ماحول پایا جاتا ہے، ماریشس کی اس ۷ روزہ تحریک نے انھیں رد کرکے عوامی سطح پر، ادبی اور دانش ورانہ سطح پر محبتوں اور باہم افہام وتفہیم وہم زیستی کی ایک نئی روشنی دکھائی ہے۔ صرف زبان سے نہیں عمل سے۔ اور بقول پاکستانی پروفیسر جمیل جالبی اور ہندستانی اعلیٰ سطحی وفد کے اراکین جناب شفیع قریشی، مہاراشٹر کے وزیر جاوید خاں، راجیہ سبھا ممبر جناب بیکل اُتساہی اور ہندستانی نائب وزیر اطلاعات ونشریات محترمہ گرجا ویاس کے، اس نئی روشنی سے صرف برّصغیر کو ہی نہیں پوری اُردو دُنیا اور پورے عالمِ انسانیت کو ایک نئی توانائی اور ایک نئی سمت ملے گی۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جب ماریشس میں اس قابلِ تقلید اتحاد کی بنا مہاتما گاندھی نے ۱۹۱۴ء میں اُس وقت ڈالی جب وہ جنوبی افریقہ سے ہمیشہ کے لیے ہندستان آتے وقت ۲۰ دن کے لیے ماریشس میں ایک مسلمان گھر میں رُکے، اور ہر شام اپنی پرارتھنا سبھا میں انھوں نے ماریشس کی مشترکہ تہذیب کی مثال دی۔ بھائی ویرسنگھ، جناب محمد سودن اور بشنو دیال جی نے اُس پودے کو ایک تناور درخت بنادیا۔

کُل دس لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو (۱۰،۸۸،۲۰۰) آبادی والے ماریشس کی تاریخ اور نسلی و ثقافتی مسافت اور اُن کا سیاسی تجربہ اس کا گواہ ہے۔ انگریزی سرکاری زبان ہے لیکن فرنچ زیادہ مقبول ہے۔ عوامی زبان کری یول ہے جسے ۹۵-۹۶ فیصد لوگ بولتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں افریقی، اور برّصغیر کی زبانوں بھوج پوری، ہندی، اُردو، تامل، مراٹھی کا چلن بھی الگ الگ نسلی و تہذیبی گروہوں میں ہے۔ تاریخ سنیے۔ ۱۶۳۸ء میں اسے ڈچ لوگوں نے دریافت کیا۔

افتتاحی اجلاس کا منظر (دائیں سے بائیں) ہندستانی سفیر کے۔ کے۔ رانا، وزیر صنعت ماریشس قاسم اُتیم، وزیر اعظم ماریشس، بولتے ہوئے جناب شفیع قریشی، ڈاکٹر خلیق انجم، وزیر مہاراشٹر جاوید خاں، پروفیسر اشتیاق عابدی، ماریشس کے وزرا شوکت سودن اور ملکیشور چونی۔

پھر فرانسیسیوں نے ۱۷۱۵ء میں اُس کو اپنی نوآبادی بنایا۔ ۱۸۱۴ء میں معاہدۂ پیرس کے تحت یہ جزیرہ انگریزوں کو دے دیا گیا سوائے ری یونین کے جو آج بھی فرانسیسی ہے۔ ۱۲؍مارچ ۱۹۶۸ء کو یہ ایک آزاد مُلک بنا۔ تب سے چلا آرہا آئینی بادشاہت کا نظام بھی اسی کانفرنس کے دوران بلکہ اُس کے پہلے ہی دن ۹؍دسمبر ۱۹۹۱ء کو ریپبلکن طرز کی جمہوریت میں بدلا گیا۔ ہندستانی وفد کے اراکین جناب شفیع قریشی، جاوید خاں، بیگم حامدہ حبیب اللہ بیکل اُتساہی، لکھنؤ کے میئر داؤجی گپتا اور اشتیاق عابدی کی موجودگی میں ستّر نفری قومی اسمبلی میں بڑے وزیر انرودھ جگناتھ نے نیا جمہوری نظام لانے کے لیے اپنی تاریخی تقریر کے ساتھ یہ آئینی بل سکنڈ ریڈنگ کے لیے پیش کیا جو ۱۲؍مارچ ۹۲ء سے نافذ ہو جائے گا۔

نسلی اور تہذیبی و ثقافتی گنگا جمنی رنگ دیکھنا ہو تو مُلاحظہ فرمائیں کہ کُل آبادی میں ۶۸ر۳ فیصد ہندی نژاد ہیں جس میں ۵۱ر۸ فیصد ہندو ہیں (بیشتر مغربی بہار اور مشرقی اُترپردیش سے آئے ہیں)۔ ۱۶ر۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ۲۸ر۵ فیصد دوسری نسلی آبادیوں میں ۲۷ر۵ فیصد کریول (جنوبی افریقی نژاد)۔ ۳ فیصد چینی اور ایک فیصد فرانسیسی ماریشسین نژاد ہیں۔ یہ سب صرف ۲۷۵ سال میں کیسے ایک دوسرے سے گھل مل گئے کہ آج اُن میں اپنے اپنے نسلی تشخص کے باوجود (مثلاً آج بھی یہاں بھوجپوری اور ہندی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جیسے مراٹھی اور اُردو۔ بیکل اُتساہی کے بھوجپوری گیتوں اور اشتیاق عابدی کی کبھی کبھار پوربی لہجے میں بھوجپوری کو یہاں خوب سمجھا گیا۔ اُس پر خوشی کا اظہار کیا گیا)۔ اتنی ہمہ گیر قومی یک جہتی اور ہم زیستی و ہم آہنگی کو شعارِ زندگی بنا لینے کی اتحادی طاقت پیدا ہو گئی۔ اسے یہاں رہ کر اور بَرت کر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ فی کس سالانہ آمدنی ۲ ہزار چھ سو امریکی ڈالر کے برابر ہے اسی سے یہاں کی خوشحالی اور برآمد و درآمد کے ذریعے دُنیا پر اپنا نشان چھوڑنے کی ماریشس کی قوتِ ارادی کا اندازہ لگتا ہے۔

کُل ۷۰ میں ۶۶ ارکان پارلیامنٹ ہندستانی اور اُن میں سے ۳۴ بھوجپوری نژاد ہیں۔ سَو فیصدی ماریشسین ہوتے ہوئے بھی اپنے وطن اور زبان سے اُن کا جذباتی لگاؤ بہت گہرا ہے۔

قدرت کے عطا کردہ حُسن، گنّے اور چائے کی زبردست پیداوار کے لیے انتہائی مُناسب مٹّی، آم کو چھوڑ کر ہر طرح کے پھل اور پھول کے لیے مُناسب آب و ہوا وغیرہ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے اپنی نجی اور ملکی خوشحالی کو فروغ دینے کے اُن کے زبردست جذبے نے صرف اُنھیں ایک قومی و سیاسی مالا میں پرویا ہی نہیں ہے، اُنھیں آئے دن فضول کے سیاسی و فرقہ وارانہ ہنگاموں، ہڑتالوں، بندوں اور ٹکراؤ سے دُور بہت دُور رکھا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ وہ اُردو زبان ہی کی طرح مزاجاً جمہوری اور مساواتی ہیں۔ ۶ دنوں میں ۶ عصرانوں، ۶ عشائیوں، تین شہری استقبالیوں اور چار کلچرل پروگراموں، افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں یعنی کُل ۲۱ (اکیس) پروگراموں میں اُن کے گورنر جنرل، وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم، گورنمنٹ چیف وہپ، تمام وزرا اور نمائندوں کے علاوہ اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن اور ڈرائیور تک اس طرح گھل مل کر اُٹھتے، بیٹھتے، کھاتے اور پیتے تھے کہ ہندستان کے سیکیورٹی زدہ اور فراقِ مراتب کے احساس والے ذہنوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ کیسی دُنیا ہے؟

ادبی اجلاس

۹؍دسمبر کو افتتاحی اجلاس میں گورنر جنرل سر ویراسامی رنگاڈو کے علاوہ وزیر اعظم سَر اینرود جگناتھ، وزیرِ تعلیم و سائنس ارموگم پرسورمن، ہندستانی وفد کے لیڈر محمد شفیع قریشی، وزیر آرٹس، کلچر، تفریحات اور اصلاحی امور اور چیئرمین نیشنل آرگنائزنگ کمیٹی مکیشور چونی، اسلام بھوگن (سکریٹری عالمی اُردو کانفرنس) اے۔ قاسم ہیرا (چیئرمین اجلاس کمیٹی)، ڈاکٹر ہاشم مہدی (ڈائرکٹر اسلامی کلچرل سنٹر)، جناب عبداللہ احمد (چیئرمین نیشنل اُردو انسٹی ٹیوٹ)، اوتم بسونڈیال (ڈائرکٹر مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ) اور پروفیسر جمیل جالبی (ڈائرکٹر نیشنل لینگویج اتھارٹی پاکستان) نے اسی ترتیب سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر عنایت حسین عیدن ناظم تقریبات تھے۔

کتابوں اور فنِ خطاطی کی بہت اچھی نمائشوں کا افتتاح انتہائی ہر دلعزیز اور جواں سال وزیر جناب مکیشور چُونی نے کیا۔ ہندستان کے مشہور خطاطوں رضا زیدی، انیس صدیقی اور خلیق ٹونکی کے کُل ۱۴۱ نمونوں کو کُھل کر سراہا گیا۔ کتابوں کی نمائش میں اُردو اکادمی دہلی، مرکزی انجمن ترقی اُردو، بیورو فار پروموشن آف اُردو سمیت دیگر ہندستانی اداروں کی کُل آٹھ سَو سے زیادہ کتابوں کے چار سیٹ حکومت ماریشس کو اور وہاں کے اُردو، اسلامی اور مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کو تہذیبی رابطوں کی

انڈین کونسل (I.E.C.R.) کی طرف سے بطور ہدیہ دیے گئے۔

۹؍ دسمبر کو پہلے ادبی اجلاس کا موضوع تھا "اُردو کا سماجی، لسانی اور ثقافتی تناظر"۔ صدارت پروفیسر جمیل جالبی نے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، داؤ جی گپتا، صغیر حسن خاں (ہندستان) پروفیسر الین دِسکولیرس (فرانس) اور سُلطان سکّون (پاکستان) نے مقالے پیش کیے جن پر اچھی بحث بھی ہوئی۔

۱۰؍ دسمبر کو دوسرے ادبی اجلاس کا موضوع تھا "حالیہ اُردو ادب برِّصغیر کے باہر" صدارت علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سیّد حامد نے کی۔ پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، پروفیسر اشتیاق عابدی، ڈاکٹر مسز فہمیدہ بیگم (ہندستان) اور حسن عسکری (پاکستان) نے مقالے پیش کیے۔

اُسی صبح چائے کے وقفے کے بعد اُسی موضوع کے تحت تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر وہاب اشرفی، جامعہ ملّیہ کی پروفیسر صغرا مہدی، علی گڑھ کے ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، کناڈا کے ولی عالم شاہین اور ماریشس کے صُوابر گدور نے اپنے مقالات پیش کیے۔

چوتھے اجلاس کا موضوع تھا "اُردو اور اسٹیج کے فنون"۔ صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ بھوپال کے ڈاکٹر اخلاق اثر اور دہلی کے پروفیسر ایس شکلا نے تقریریں کیں اور عملی نمونے دکھائے۔

۱۱؍ دسمبر کی صبح پانچویں اجلاس کا موضوع تھا "سرحد پار علاقوں میں اُردو کا مطالعہ"۔ صدارت ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے کی۔ پروفیسر حمید الحق ندوی (جنوبی افریقہ)، ہرچرن چاؤلہ (ناروے) ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا (سوویت رُوس) انور نسیم (سعودی عرب) نے مقالات پڑھے اور تقریریں کیں۔

اُسی صبح کے دوسرے یعنی سلسلے وار چھٹے اجلاس کی صدارت پروفیسر رئیس احمد نے کی۔ موضوع تھا "تعلیم اور سماج"۔ مہاراشٹر کے وزیر پروفیسر جاوید خاں، سیّد حامد، بیگم حامدہ حبیب اللہ چیئرپرسن انڈین کونسل فار چائلڈ ویلفیئر اور ماریشس کے عنایت عیدن اور رابطۂ عالمِ اسلامی کے محترم کسترن نے مقالے پیش کیے اور تقریریں کیں۔

آخری اجلاس کی صدارت انجمن ترقّی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کی جس میں اتّفاق رائے سے پوری کانفرنس کی اُس اجمالی رپورٹ کو دو ایک معمولی ترمیموں کے ساتھ منظور کر لیا گیا جس میں ساتوں ادبی اجلاسوں میں پڑھے گئے تمام مقالوں یا تقریروں کی تلخیص شامل تھی۔ پاکستان کے ادیب اور شاعر شاہ نواز خاں سواتی نے اُسے واقعی بڑی محنت سے اختصار کے ساتھ مگر جامع طور پر تیار کیا تھا۔ اسی لیے تالیوں کے درمیان اظہارِ تشکّر کرنا واجب تھا۔

اُس کے بعد مندوبین نے کھڑے ہو کر اور دیر تک تالیاں بجا کر اتنی شاندار اور کامیاب کانفرنس کرنے کے لیے ماریشس کے میزبانوں کا پُر خلوص شکریہ ادا کیا۔ اچانک کھچا کھچ بھرے ہال کے تمام مقامی سامعین نے جن میں بیشتر اُس مُلک کے اُردو اداروں اور مدرسوں کے ٹیچر تھے کھڑے ہو کر مندوبین شرکا کی شرکت اور تین روز تک پوری دلچسپی کے ساتھ ان کی اتنی پُر مغز اور متنوّع تقریروں اور مقالوں کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

رسمی افتتاحی اجلاس میں نظم گوئی، نعت خوانی، قرات اور خطاطی کے مقابلوں میں پہلی تین پوزیشن پانے والے مقامی طلبہ کو انعامات تقسیم کیے گئے۔

یہ رپورٹ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک ماریشس کے بے حد متموّل مگر اُسی کے ساتھ بے حد منکسر، عالی ظرف اور انتہائی درجہ مخلص اور محنتی جناب عبداللہ احمد (سی۔ بی۔ ای) چیئرمین اور بانی نیشنل اُردو انسٹی ٹیوٹ کی مساعی کا بھرپور اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ سَو فیصدی سچ ہے کہ اُنھوں نے اور اُن کی دِلکش اور قابلِ احترام بیگم عزیزہ نے اپنے قصرِ ناز کے تمام وسائل کو اُردو کی خدمت اور فروغ کے لیے اور اِس کانفرنس کو انتہائی درجہ کامیاب بنانے کے لیے وقف کر دیا۔ اُن کی اور اُن کے ساتھیوں اور متعلقہ وزرا کی کوششیں بار آور ہوئیں یہ اطمینان کی بات ہے۔ کاش خداوند کریم ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی چند ایسے خاموش اور مخلص مجاہدینِ اُردو کو پیدا کر دے تاکہ ان مُلکوں میں بھی اُردو زبان و اَدب کا فروغ ہو اور ہماری پیاری اور اپنی زبان اُردو کا مقام و مستقبل تابناک بنے۔ آمین!

ماریشس کے وزرا خاص طور سے مسٹر ٹکیشور مچونی، مسٹر شوکت علی سُودن (گورنمنٹ چیف وہپ)، وزیرِ صنعت و تکنالوجی مسٹر قاسم اُتّیم، وزیر ماحولیات مسٹر صالح کاسن علی اور اُن کے عملے کے لوگوں کی کتنی بھی تعریف کی جائے وہ کافی نہیں ہوگی۔ محاورتاً نہیں حقیقتاً اوّل الذکر دونوں جواں سال وزیر معہ اپنی بیویوں کے صبح ۹ بجے سے رات گیارہ بجے تک چھ دن رات ایک

پاؤں پر کھڑے رہے اور کہیں کوئی کمی یا کوتاہی نہیں آنے دی۔

اسی طرح ہندستانی ہائی کمشنر عزت مآب کے۔ کے۔ رانا اور پاکستانی قائم مقام سفیر عالی جناب تصوّر خاں اور اُن کے عملے کا بھی شکریہ ادا کرنا پڑے گا جنھوں نے اُردو کی اِس تاریخی عالمی کانفرنس کو ہر لحاظ سے کامیاب بنانے کے لیے اپنے مُلکوں کے تعلقات میں کشیدگی کو بالکل بُھلا کر ہر طرح کا تعاون دیا۔ انھی کی کوششوں سے ہندستان کے مشہور گلوکار طلعت عزیز اور پاکستان کے ساز و آواز کے جادوگر اُستاد حامد خاں کے موسیقی پروگراموں نے کانفرنس کو تازگی اور فرحت بخشی۔ اور جیسے غزل اور قوّالی صرف ہندستان و پاکستان ہی کی نہیں بلکہ ماریشس کی بھی ہے اسی لیے وہاں کے بلال لال محمّد اور ادریس لال محمّد نے برابر معیار کا پروگرام پیش کیا۔ شاید اسی لیے "اچھا لگتا ہے" وزیر بسٹر چونی کی روایت کے مطابق ماریشس کے سابق چیف جسٹس سَر قاسم مُولان نے فیصلہ صادر کر دیا کہ "اگر لوگ اُردو میں لڑیں تو وہ لڑائی بھی بہت شیریں ہوگی۔"

آخری شب کے پُر وقار مشاعرے کی صدارت ہندستان کی نائب مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات ڈاکٹر مِس گرجا ویاس نے کی جس میں ہندستان کے بیکل اُتساہی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی پاکستان کے شاہنواز سواتی اور سُلطان سکون، کناڈا کے ولی عالم شاہین اور ماریشس کے قاسم ہیرا سعید میاں جان اور صابر گودڑ کی تازہ تخلیقات کو بہت سراہا گیا۔ صدر صاحبہ بھی اتنی خوش تھیں کہ انھوں نے اپنے آپ ہی دو غزلیں، ایک گیت اور ایک راجستھانی گوپتا اچھے ترنّم کے ساتھ سُنائیں۔

اور چونکہ ادب کو سماج سے اور سماج کو سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اِس لیے یہ تذکرہ بھی بر محل ہوگا کہ کانفرنس کے پہلے دن دوشنبہ بروز ۹، دسمبر ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے افتتاحیہ اجلاس خاتمے کے بعد ماریشس کی پارلیامنٹ کے اسپیکر عزت مآب ایشور دیو سیتارام "گرو" کی مخصوص دعوت پر ہندستانی وفد کے لیڈر عالی جناب محمد شفیع قریشی کے ساتھ پروفیسر جاوید خاں، جناب بیکل اُتساہی (ایم۔ پی) پروفیسر اشتیاق عابدی، بیگم حامدہ حبیب اللہ، میترا دُجی گپتا اور ہندستانی سفیر کے۔ کے۔ رانا نے پارلیامنٹ کے اس تاریخی اجلاس میں بھی شرکت کی جس میں وزیرِ اعظم نے ماریشس کو وفاقی جمہوریہ بنانے کے لیے آئینی ترمیم پیش کی اور اپنی اہم تقریر کی۔ ماریشس آئندہ ۱۲، مارچ ۱۹۹۲ء کو مکمل جمہوری مُلک بن جائے گا۔

ہندستانی وفد کے اہم کردار کا اندازہ اِس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۶، دسمبر سے ۱۱، دسمبر تک ہر روز شام چھ بجے کے بعد ٹی۔ وی خبروں میں کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہندستانی وفد کے اراکین کو بھی فوکس میں رکھا گیا۔ اور جناب شفیع قریشی، پروفیسر جاوید خاں، بیکل اُتساہی، اشتیاق عابدی اور گوپی چند نارنگ کے ۱۵، ۱۵ منٹ کے خصوصی انٹرویو بھی پیش کیے گئے۔ ہندستان کے اِس اعلیٰ سطحی وفد کو بھجوانے اور دہلی سے ماریشس اور وہاں سے واپسی کے سارے انتظامات ۴ ہزار سے زیادہ کتابوں کو وہاں پہنچانے، فنِ خطّاطی کے ماہرین اور غزل گائکی کے گلوکاروں کے انتخاب میں آئی۔ سی۔ سی۔ آر کے لائبریرین جناب گلزار نقوی اور وہاں کے ڈائرکٹر شری باسو اور ڈائرکٹر جنرل مسز ویناسیکری نے کم وقت میں جتنی مستعدی اور دلچسپی دکھائی وہ قابلِ تعریف ہے۔ پورا ہندستانی وفد جناب گلزار نقوی کی محنت کشی اور فعالیت سے متاثر ہے۔

ہندستان میں ایک دو اخبارات میں اس طرح کی رپورٹ آئی ہے کہ کسی کی مخالفت سے کانفرنس میں دو ایک رزولیوشن پاس نہیں ہوئے یا یہ کہ کسی ہندستانی مندوب نے اُردو محاذ پر سب ٹھیک ہے کا سرٹیفکٹ دیا۔ یہ دونوں باتیں سراسر بے بنیاد ہیں۔ سو فیصدی غلط۔ وہاں ۹ ملکوں کے سرکاری یا غیر سرکاری مندوبین موجود تھے جو بیشتر ممالک میں اُردو زبان و اَدب کے تعلق سے کہاں، کیا، کتنا ہو رہا ہے سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا کسی نے کسی کو سرٹیفکٹ نہیں دیا۔ جہاں تک اور دو رزولیوشنوں کی بات ہے کہ (۱) اُردو کو بھی اقوامِ متحدہ کی ایک زبان قرار دیا جائے اور (۲) اُردو کا ایک عالمی رابطے کا مرکز کہیں قائم ہو تو اِن بنیادی باتوں پر نہ اختلاف تھا، نہ ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ جن مندوبین کی سرکاری حیثیت تھی اُن کو اپنی اپنی سرکاروں سے مشورہ کیے بغیر ایسا رزولیوشن پاس کرنے یا نہ پاس کرنے کا حق نہیں تھا۔ دوسرے جو مندوبین حکومتِ ماریشس کی اپنی دعوت پر نجی حیثیت میں آئے تھے وہ ظاہر ہے اس کا استحقاق نہیں رکھتے تھے۔ خود حکومتِ ماریشس کا نظریہ اُردو اور اسلام کے تعلق سے بے حد صاف اور مضبوط ہے لیکن آئندہ ۱۲، مارچ ۹۲ء کو جمہوریہ بن جانے کے بعد جب وہاں نئی تعلیمی، لسانی اور تہذیبی و سماجی پالیسی کا تعیّن ہوگا تبھی وہاں کے مقامی

مندوب کچھ کہہ پا کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہاں
شکریے کی تجویز کو کھڑے ہوکر اور پورے خلوص
کے ساتھ پاس کرنے کے سوا ہندستانی سرکاری
وفد کے کُل ۱۶ ممبران ایسی کوئی بات نہیں کرنا
چاہتے تھے کہ کبھی آئندہ چل کر وہاں کے بے حد
خوشحال اور سکون کے ساتھ رہ رہے اُردو نواز
مسلمانوں یا دیگر طبقوں کے لیے کوئی نزاعی
بات پیدا ہو۔ ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش
اور سری لنکا کے اُردو کے تئیں تجربات کا تقاضہ
بھی یہی تھا کہ اُردو کی قبولیتِ عام کے لیے
موافقانہ ماحول قائم رہے اور مضبوط ہو۔
ماریشس عالمی اُردو کانفرنس نے یقیناً
اُردو دُنیا کو اتحاد، یک جہتی اور مشترکہ جدوجہد
کے علاوہ اُردو زبان کے تہذیبی ورثے اور اس
کی قبولیتِ عام کو فروغ دینے کے لیے ایک
نئی راہ دِکھائی ہے۔

نظمیں

سالِ نو

یونھی اِک سال بیتا اور اب بھی
مری سانسوں کے تہہ خانے میں جیسے
سُلگتی ہے چِتا بیتے دنوں کی

زباں تلخابۂ ماضی سے تر ہے
پلیٹوں میں سجی ہیں آرزوئیں
دہن میں کانچ کے ٹکڑے گڑے ہیں

ہر اک جانب
پُرانی کرسیوں پر
سلگتی خوشبوؤں کے گھونسلے ہیں
ہر اک ٹیبل کے ہونٹوں پر ہے روشن
بہکتی رات کی آنکھوں سے ٹپکا
جواں لمحوں کا پگھلایا ہوا جھاگ

درخشندہ ہے آوازوں کا جنگل
کہ جیسے رقص ہے گونگی صدا کا
کہ جیسے دائرہ در دائرہ ہے
لرزتی، ٹوٹتی یادوں کا ماتم

کہ جیسے اِک طلسماتی فضا کے
فریبوں کے طلائی مقبروں میں
کئی زر پوش تابوتوں کے چہرے
کسی کی آمدِ معجز نما سے
مثالِ برق روشن ہو گئے ہوں

پھر اس کے بعد
وہ سب کچھ
جو پچھلے سال دوہرایا گیا تھا
پُرانے کھوکھلے لفظوں پہ جیسے
نئے لہجوں کے پالش کی اذیّت
مبارکباد کی مُردہ صدائیں
اور اس کے ساتھ ہی
وقتِ زبوں کے
دریدہ پیرہن کی آستیں سے
سرکتا، جھانکتا، سر کو اُٹھاتا
یہ سالِ نو
یہ سالِ نو مبارک

مرتضیٰ علی شاد

۴/اے، بی۔ڈی۔اے۔کالونی، کوہِ فزا، بھوپال

یکجہتی

میں اِک کورے کاغذ پر
رنگ برنگے رنگ بھروں
پھر اُس کو دیوار پہ کر دوں آویزاں
پہروں اُس کو تکتا جاؤں
اپنے لمحے کھوتا جاؤں
پھر سوچوں
یہ تو سارے رنگ جدا ہیں
ان کے اپنے رشتے ناطے الگ الگ
ان میں اتنا روپ نکھر کر
کیوں آیا ہے؟

خلفشار

کوئی نعمت اگر مل جائے
اور مل کر وہ کھو جائے
تو ہم سب ماننے والوں کی صورت مان لیتے ہیں
یہی قسمت میں لکھّا تھا
مگر جب سوچتے ہیں ہم
کہ یہ تحریر کیسی تھی
یہ سب الفاظ کس کے تھے
عجب احساس ہوتا ہے
میں اس کا نام کیا رکھّوں
بڑی دشواریوں میں ہوں

حیاتؔ لکھنوی

۵۔ امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مہدی ٹونکی

مبارک منزل، پانچ بتی، ٹونک ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)

منچندانی کو دیکھتے ہی میرا سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

حسبِ عادت کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے کہا" ہیلو ڈیئر" پھر زور سے آواز لگائی:

"ارے رام داس اخبار۔"

لیکن ٹیبل پر رکھے اخبار پر نظر پڑتے ہی اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تیزی سے بڑھ کر اخبار اُٹھا لیا۔

"اور سُناؤ یار کیا حال چال ہیں"؟ حالانکہ وہ مخاطب مجھ سے تھا لیکن اُسے میرے جواب کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی نظریں پھڑکتی' تڑپتی خبروں کی مچھلیوں کو تلاش کرنے لگیں۔

عادت کے مطابق اُس نے اپنا بھاری بھرکم ایک کولھا میری ٹیبل کے کونے پر ٹکایا۔ اور اخبار کو ٹیبل پر پھیلا دیا۔

منچندانی میرا ماتحت ہے۔ اور میں اس کا افسر۔ صرف دو سیڑھیوں کا فرق ہے وہ اکاؤنٹ کلرک ہے۔ اور میں اکاؤنٹ آفیسر۔ ہم نے ہی کام ایک ساتھ کیا تھا۔ ایک ساتھ اس کمپنی میں ملازم ہوئے تھے۔ ایک ہی پوسٹ پر۔ بل کلرک۔

اس لیے ایک ہی کمرے میں ایک ہی قطار میں بیٹھے تھے۔ میں نے اکاؤنٹنس کا امتحان دیا اور جلدی ہی اکاؤنٹ کلرک بن گیا۔ پھر اکاؤنٹینٹ کی پوسٹ سے ہوتا ہوا اکاؤنٹ آفیسر بن گیا۔ اور منچندانی صرف پہلا اور آخری پروموشن لے کر اکاؤنٹ کلرک ہی بن پایا۔ اُس سے میں نے بہت کہا کہ وہ بھی امتحان دے لے۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

حالاں کہ میں اس کا آفیسر ہوں مگر ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہم اب بھی ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر لنچ لیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ سگریٹ پیتے ہیں۔ اور لیٹے بیٹھے اِدھر اُدھر کی دُنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اب بھی کوئی کاغذ' کوئی فائل لے کر میرے کمرے میں آتا ہے۔ اور زور سے ٹیبل گلاس پر پٹک کر کہتا ہے۔

"دیکھنا یار ـــــ"

پھر ٹیبل پر سے سگریٹ کی پیٹی اُٹھا کر سگریٹ سلگاتا ہے۔ اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کاغذ یا فائل دیکھ کر میں اُس کی پرابلم حل کرتا ہوں لیکن برسوں سے میں اُس کے خلاف ٹینشن (TENTION) سے بھرا ہوا ہوں۔ وہ بھی صرف صبح کے وقت جب وہ آتے ہی اخبار پر ہلّہ بولتا ہے۔ مجھے اس کے اخبار پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مشکل یہ ہے کہ اس کی مرغوب خبر جیسے ہی ملتی ہے وہ مجھے ضرور سُناتا ہے حالاں کہ اُسے معلوم ہے کہ مجھے اخبار سے دلچسپی نہیں ہے پھر بھی وہ سناتا ہے اور خبر سنانے میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اُسے پتا ہی نہیں چلتا کہ میں خبر سُن رہا ہوں یا کسی فائل کی ورق گردانی کر رہا ہوں اُسے سیاسی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اُسے ہیجان انگیز STUNT نیوز پسند ہیں۔ سماج کی ایسی خبریں جو حادثات کہلاتی ہیں جیسے :

ساس سے جھگڑ کر بہو نے اپنے تین معصوم بچّوں کے ساتھ کنوئیں میں کود کر خودکشی کی۔

کالج کے لڑکوں نے بینک لوٹا' چاروں اعلیٰ افسران کے لڑکے تھے۔

کنپٹی مار بابا نے ایک اور کی جان لی۔

زمین کے بٹوارے کے جھگڑے میں بھائی نے بھائی کے سر پر کلھاڑی ماری۔

جہیز کم لانے پر شوہر نے بیوی کو زندہ جلایا۔

سترہ ہریجنوں کو اُن کے گھروں میں بند کر کے جلا دیا۔

اور خاص طور پر یہ خبریں اُس کے لیے بہت چٹخارے والی ہوتیں۔

کھیت پر کام کر رہی عورت سے زنا بالجبر۔

تھانے میں چار دن تک عورت کو ننگا رکھا۔

چھ بچّوں کی ماں اپنے عاشق کے ساتھ

ماگ گئی۔
لڑکی کے پیچھے کالج کے لڑکوں میں جھگڑے
زی۔
ناکام لیلیٰ مجنوں نے ایک ساتھ زہر کھایا۔
نرس کے ساتھ سات آدمیوں کا اجتماعی
زنا بالجبر۔
اور جب اُسے ایسی خبریں کسی دن اخبار
میں نہ ملتیں تو وہ بُرا سا منہ بنا کر کہتا "آج کوئی
خاص خبر نہیں ہے۔"
چاہے اس دن عام بجٹ پیش ہوا ہو یا
وزیر اعلیٰ نے استعفیٰ دیا ہو یا امریکہ اور روس
میں کوئی خاص سمجھوتہ ہوا ہو یا اُن کا سربراہ یہاں
آیا ہو۔ اُس کے لیے یہ خبریں بے معنی تھیں۔ وہ
اخبار میرے سامنے پھینک دیتا اور ایک
واہیات سی انگڑائی لے کر پہلے والا جملہ دہرا
دیتا:
"اور سناؤ کیا حال چال ہیں۔
پھر اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر
مجھے سگریٹ دیتا، خود سلگاتا۔ پھر اُس کا آخری
جملہ ہوتا "اچھا چلیں۔"
اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا
میں شیشے کے دروازے سے اُسے چٹکلیاں
بجاتا، بھاری بھرکم کولھے مٹکاتا، راہ داری کے
آخری سرے تک جاتے دیکھتا رہتا۔
وہ جب تک میرے کمرے میں رہتا میں
اپنے آپ کو ایسا ناتواں، بے دست و پا محسوس
کرتا جیسے کسی پُرشور تیز رفتار مشین کے پُرزے
الگ الگ ہو کر مجبور و بے کس پڑے ہوں۔
اُس کے جانے کے بعد میرے حواس لوٹ
آتے۔ جسم میں توانائی رفتہ رفتہ دوڑنے لگتی دن
بھر اُس کے خلاف میرے ذہن میں کوئی TENSION
یا غصہ نہ رہتا۔ لیکن ہاں ـــــ جب میں گھر پہنچتا
تو اُس کی خبریں دھیرے دھیرے کسی بادل
کی ٹکڑی کے سائے کی طرح میرے دماغ پر
رینگ کر دماغ کو بوجھل کر دیتیں۔ مجھے تب تک
سکون نہ ملتا جب تک کہ میں کسی خبر سے چھلے
خوف کا تدارک نہ کر لیتا۔ کبھی کبھی تو میں اُس خبر
سے بے چین ہو کر کئی کئی راتیں بے خواب گزارتا۔
صبح ہلکا پھلکا ہو کر دفتر پہنچتا۔ اخبار پر
نظر پڑتی لیکن کسی قسم کا ردعمل مجھ پر نہ ہوتا۔
اخبار اُٹھاتا بھی نہیں کیوں کہ مجھے خبروں سے
کوئی دلچسپی نہیں تھی ویسے بھی خاص خاص خبریں
ریڈیو ٹیلی ویژن پر سُن لیتا تھا۔ لیکن جیسے ہی
منیجندانی نظر آتا میرا پورا جسم مٹی بھرے بورے
کی طرح بے جان ہو جاتا اور دماغ بالکل خالی۔
صرف آنکھیں اُس پر ٹکی رہتیں اور دل انجانے
خوف سے دھڑکتا رہتا۔
وہ اخبار پھیلا دیتا اور اپنی تیز "سرچ
لائٹ" آنکھوں سے پھڑکتی خبروں کو تلاش
کرنے لگتا۔
"یار ـــ سُنا تم نے کتنی دلچسپ
خبر ہے۔"
میں نے فائل پر سے نظریں ہٹا کر
اُسے دیکھا۔
نئی نویلی دُلہن کے ساتھ زنا بالجبر۔
دہلی۔ دو نوجوان راجوری گارڈن کے ایک
فلیٹ میں گھس گئے اور وہاں رہنے والے
پردیپ کمار کو کرسی سے باندھ دیا پھر اُس کے
سامنے ہی اُس کی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ زنا کیا۔
پردیپ کمار ابھی بیس دن پہلے ہی آشا کو بیاہ کر
لایا ہے۔"
خبر ختم ہونے سے پہلے ہی میرا دھیان اپنی
بیوی کی طرف چلا گیا۔ میری شادی ابھی ایک ماہ
قبل ہی ہوئی ہے۔ میرے دفتر آنے کے بعد وہ
اکیلی رہتی ہے اور سامنے کے فلیٹ میں وہ شرابی
مسٹنڈا رہتا ہے جو روزانہ بالکنی میں آکر سامنے
کے فلیٹس کی عورتوں کو گھورتا رہتا ہے۔ میری بیوی
بہت خوبصورت نہ سہی لیکن ابھی شادی ہوئی ہے۔
نئی بیاہتا کنواری لڑکیوں سے زیادہ پُرکشش
ہوتی ہے۔
اور میں نے جلد ہی فلیٹ بدل دیا۔
پھر ایک دن اُس نے خبر سُنائی:
شوہر کے دوست کے ساتھ بیوی
بھاگ گئی۔
میں نے اپنی بیوی کو میرے کسی بھی دوست
کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔ اب جو بھی دوست
میرے گھر آتا میں ہوشیار ہو جاتا۔ چائے یا شربت
بھی میں خود ہی لے کر آتا اور ایسا خشک برتاؤ کرتا
کہ وہ پھر کبھی نہ آتا۔
ایک دن منیجندانی نے خبر سُنائی۔
شادی میں شرکت کرنے کے لیے جاتے
ہوئے ایک جوڑے کو، جو اسکوٹر پر سوار تھے چند
غنڈوں نے راستے میں روکا اور ریوالور کی نوک پر
تمام زیورات اُتار کر بھاگ گئے۔
اتفاق سے دوسرے دن ہی مجھے معہ بیوی
کے ایک قریبی رشتے دار کے یہاں شادی میں
جانا تھا۔ رشتے دار میرے گھر سے چھ کلومیٹر دُور
رہتا تھا بیچ کا دو کلومیٹر کا راستہ تقریباً غیر آباد
تھا۔ اب میں پریشان۔ شادی میں جانا ضروری۔
اسکوٹر کی سواری۔ جب میں نے اپنی بیوی کو
بہت ہی کم زیور پہن کر جانے کا مشورہ دیا تو
وہ بہت ناراض ہوئی۔
آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کے قریبی

رشتے دار کی شادی۔ اچھے تو بچے لوگ خود آپ کے پاس دعوت دینے آتے۔ میں پہلی بار اُن کے یہاں جا رہی ہوں وہ مجھے ننگی بوچی دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ آپ کو اپنی عزت کا بھی خیال نہیں؟"

لیکن میں بضد رہا۔ آخر اُس نے قسم کھائی کہ اس شادی ہی میں نہیں بلکہ اب وہ کسی بھی شادی یا تقریب میں زیور کا ایک کھیرا بھی پہن کر نہیں جائے گی۔

پھر ایک دن منجندانی نے خبر سُنائی۔

لو صاحب ـــــ دن دہاڑے گھنی بستی میں عورت کا قتل۔

جے پور۔ جواہر نگر میں رہنے والا ہمّت سنگھ جب اپنی نوکری پر گیا تو پیچھے سے کسی نے اُس کی بیوی کو قتل کر دیا۔ پتا اُس وقت چلا جب خون بہہ بہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پاس کے لوگوں نے جب دروازہ کھولا تو عورت کا پیٹ چِرا ہوا تھا اور اُس کے پاس بیٹھی ایک سالہ بچی رو رہی تھی۔ قتل کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔

میں اندیشے سے بھر گیا۔ میرا بھی دُو سال کا بچہ ہے۔ دروازہ کھول کر باہر آ جاتا ہے اگر کوئی غنڈہ بدمعاش پہنچ جاتے تو ـــ؟

شام کو گھر پہنچتے ہی میں نے اپنی بیوی کو کچھ ہدایات دیں۔ جیسے: دروازہ ہر وقت بند رکھنا، کوئی کال بیل بجائے تو دروازہ مت کھولنا بلکہ پیپنگ آئی (PEEPING EYE) سے دیکھ کر بات کرنا۔

اور اگر ڈاکیہ کوئی رجسٹری، پیکٹ وغیرہ لے کر آیا تو ـــــ؟

میں فکر میں ڈوب گیا۔ دوسرے دن میں دفتر نہیں گیا۔ کارپنٹر کو لا کر دروازے میں پیپنگ آئی کے نیچے تقریباً چھ انچ کے دائرے میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کرائے تاکہ ان SPEAKING HOLES سے بات کی جا سکے۔ یہی نہیں بلکہ تالے والی ایک زنجیر بھی لایا اور دروازے کے پٹ میں لگا کر اُسے چوکھٹ سے جوڑ دیا۔ اب دروازہ چھ انچ سے زیادہ نہیں کھل سکتا تھا۔ کھڑکیاں وغیرہ سب چیک کر لیں۔ اب میں مطمئن تھا۔

منجندانی نے اخبار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"یار کیسی دردناک موت ہوئی ہے۔"

میں اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔

کوٹہ۔ اسکول کی ایک بس جب ایک بس اسٹاپ پر کچھ بچوں کو اُتار رہی تھی تو بس میں بیٹھا ایک بچہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے اُترا کہ سامنے پیاؤ پر پانی پی کر آتا ہوں۔ اسکول ملازم کے روکتے روکتے وہ سڑک پر دوڑ گیا اتنے میں سائڈ سے آ رہی ایک تیز رفتار بس اُسے کچلتے ہوئے تیزی سے گزر گئی۔

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ حادثہ ابھی ابھی میرے دماغ پر واقع ہوا ہو۔ مجھے اپنے دونوں بچے یاد آ گئے جو اسکول بس میں ہی جاتے ہیں، بڑے بچے کو بہت پیاس لگتی ہے۔

شام کو پلاسٹک کے چار تھرماس گھر لیتا گیا۔

"لو یہ تھرماس، یہاں سے جاؤ تو پانی بھر کر لے جانا، واپس آؤ تو اسکول سے پانی بھر کر لانا، راستے میں سڑک پر کہیں پانی نہ پینا اور ہاں ـــــ کوئی چیز بھی سڑک پار کر کے مت خریدنا۔"

بیوی نے پوچھا "دو تھرماس ہی چاہیے تھے، دُو زیادہ کیوں لے آئے؟"

"اگر کبھی یہ اسکول میں یا بس میں بھول آئیں تو پھر پانی کیسے لے جائیں گے؟"

پھر منجندانی نے ایک خبر سُنائی۔

"چہ چہ چہ ـــ کتنے بدنصیب تھے وہ ماں باپ جن کے دونوں بچے مر گئے۔"

میرا دل دھڑکنے لگا، پوچھا "کیا ہوا۔"

منجندانی نے خبر پڑھی۔

جے پور۔ گھاٹ گیٹ پر رہنے والے ایک وکیل کے دونوں بچے اُس وقت مارے گئے جب وہ کھیل رہے تھے اور کھیلتے کھیلتے، چلتے ہوئے ایئر کولر کے ہاتھ لگا دیا۔ ایئر کولر باڈی میں کرنٹ آ رہا تھا۔ بچہ اسی وقت چپک گیا۔ اُسے چھڑانے کے لیے جب بھائی نے ہاتھ لگایا تو وہ بھی چپک گیا اور اس طرح دونوں بچے مر گئے ـــ "یار اُن ماں باپ پر کیا گزری ہوگی ـــ؟"

اور میں خدشات کے پر لگا کر گھر پہنچ گیا۔ میرے یہاں بھی ایئر کولر ہے میرے بھی دو بچے ہیں گرمی کا زمانہ ہے چھٹیوں کے دن ہیں، میری بیوی شکایت کر رہی تھی کہ یہ دن بھر اُچھلتے بھاگتے رہتے ہیں سونے کے لیے کتنا ہی کہو، سوتے ہی نہیں۔

شام کو گھر پہنچ کر کولر کو چیک کیا۔ ہلکا ہلکا کرنٹ آ رہا تھا میں فکر میں ڈوب گیا۔ کیا کیا جائے۔ پھر میں نے کولر کو ڈِس کنیکٹ کر دیا۔ دوسرے دن ایئر کولر کو دوسرے کمرے کی کھڑکی کے باہر لگوا دیا اور اُس کے آس پاس ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دیں کہ بچے اُس تک نہ پہنچ سکیں۔

میں نے سگریٹ سلگا کر دھواں چھوڑا ہی تھا کہ منجندانی کہنے لگا:

"یار یہ ریزلٹ بھی بچوں کے لیے قیامت

بن کر آتا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ایک لڑکے نے خودکشی کر لی۔"

اجمیر۔ ہائر سیکنڈری کے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سے سوشیل کمار جین نے ریل کے آگے کود کر جان دے دی۔

منجھندانی نے آگے کیا پڑھا۔ مجھے یاد نہیں میرا دھیان تو اپنے بچے کی طرف چلا گیا جس نے ابھی سیکنڈری کا امتحان دیا تھا اور اب اس کا نتیجہ آنے ہی والا تھا حالانکہ اس نے بہت محنت کی تھی۔ ویسے تو وہ کہہ رہا تھا کہ پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں مگر کیا بھروسہ ــــ ؟ اگر وہ فیل ہو گیا اور ... اور ...

میں بے چین ہو اٹھا۔

رات کو دونوں بہن بھائی کسی موضوع پر بات چیت کر رہے تھے میں نے ادھر ادھر کی بات چیت کرنے کے بعد بچے سے نتیجہ آنے کے بارے میں پوچھا پھر پرچوں کے بارے میں سوالات کیے۔ وہ بہت مطمئن تھا۔ میں چپ ہو گیا پھر ادھر ادھر کی بات چیت کر کے اسے بتایا کہ اگر کسی کام میں انسان ناکامیاب ہو جاتے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اور محنت اور لگن سے کام میں جٹ جانا چاہیے۔ کامیابی محنت کے بعد قسمت پر بھی منحصر ہوتی ہے۔

اب روزانہ اس سے بات چیت کر کے یہ باور کرانے لگا کہ اگر وہ فیل ہو جاتے تو کوئی غلط قدم نہ اٹھاتے۔ میرا بچہ بہت ذہین اور تیز طرار ہے۔ مجھ سے کہنے لگا:

"پاپا ــــ ایسا کیوں سوچ رہے ہو کہ میں فیل ہو جاؤں گا۔"

"بیٹے ــــ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ قسمت ہے۔ فرض کرو کہ ..."

اس نے میری بات کاٹ دی "اوہ پاپا" یہ فرض کی بات بھی آپ کیوں الٹی سوچ رہے ہیں۔ یہ فرض کیوں نہیں کر لیتے کہ میں ٹاپ کروں گا اور اسی خوشی میں آپ مجھے موٹر سائیکل دلوائیں گے۔"

اور میں سر کھجانے لگا۔ اور واقعی اس کا نام میرٹ لسٹ میں سب سے اوپر تھا۔

پھر ایک دن منجھندانی نے ایک خبر پڑھ کر تشویش کا اظہار کیا:

"یار آج کل کو ایجوکیشن کا معاملہ بہت غلط ہو گیا ہے لڑکیوں کو تو کالج میں داخلہ دلوانا ہی نہیں چاہیے۔"

میرا دل دھڑکنے لگا "کیا بات ہو گئی ؟"

کیا بات ہو گئی سنو :

"ایک لڑکی اپنے کلاس ساتھی کے ساتھ بھاگ گئی۔"

جودھپور۔ ......

وہ خبر پڑھنے لگا اور میرا دل اندیشوں کی چوٹ سے کانپنے لگا۔

میری لڑکی کالج میں پڑھتی ہے خوبصورت ہے اور ہر خوبصورت لڑکی کے ہزار عاشق ہوتے ہیں ــــ کہیں ــــ کہیں ــــ اس نے بھی کسی کو دل نہ دے دیا ہو اور پھر... پھر...

مجھے اپنی بدنامی کا خیال آنے لگا۔

اب میں اپنی لڑکی کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ تو ایسی خبریں منجھندانی سناتا اور کچھ خبریں آس پاس سے سننے کو ملنے لگیں کہ کالج میں ایک لڑکی کے عاشقوں میں چھرے بازی ہو گئی۔ ایک ناکام عاشق نے لڑکی کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔ ایک لڑکا اور لڑکی خط بازی کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تشویش کے بھنور تیزی سے بڑھنے لگے۔ پہلے تو سوچا کہ اپنی لڑکی کا کالج جانا بند کر دوں۔ پرائیویٹ امتحان دلوا دوں مگر پھر خیال آیا کہ لوگ کیا کہیں گے اور میں کیا جواب دوں گا ؟

میں نے ان خبروں سے اور اپنے اندیشوں سے اپنی بیوی کو آگاہ کیا۔ پہلے تو اس نے کہا "تم غلط سوچتے ہو ــــ اپنی بے بی ایسی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہی غلط فہمی تو مصیبت لاتی ہے۔ سب ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی سوچتے ہیں۔ اگر ہر لڑکی اتنی ہی اچھی ہے تو پھر یہ آئے دن کے عشق بازی کے جھگڑے قصے کیوں خبروں کا عنوان بن رہے ہیں۔"

اب میری بیوی بھی میرے اندیشوں سے متفق ہو گئی۔ ہر ماں اپنی بیٹی کے لیے بہت فکر مند ہوتی ہے اس لیے اس نے بیٹی کے سج دھج کر کالج جانے پر ٹوکنا شروع کر دیا۔ اس کے جلدی جانے یا دیر سے آنے پر جواب طلب کرنے لگی۔ سہیلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے جانے پر بھی پابندی لگا دی۔

وہ رات کو دیر تک پڑھتی رہتی ہے میں رات دیر تک جاگتا رہتا ہوں۔ جب وہ سو جاتی ہے اور میں یہ سمجھ لیتا ہوں کہ وہ اب گہری نیند سو گئی ہے تو اٹھ کر اس کے کمرے میں جاتا ہوں اور بہت آہستگی اور احتیاط کے ساتھ ایک ایک کاپی ایک ایک کتاب کی جانچ کرتا ہوں پرس کھول کر دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کے کسی عاشق کا خط نہ ہو یا اس نے اس کو خط نہ لکھا ہو۔ یہاں تک کہ الماری میں اس کے کپڑے، پرائیویٹ کپڑے تک کی تلاشی لیتا ہوں پھر واپس آ کر لیٹ

جاتا ہوں بہت دیر بعد نیند کے سائے آکر فکرمند دماغ کو سلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی درمیان منچندانی نے ایک خبر سُنائی :

"محبت کے مارے لڑکے لڑکی نے خودکشی کی۔"

اودے پور۔ یہاں کی ایک اونچی سوسائٹی کی لڑکی نے اپنے عاشق کے ساتھ زہر کھاکر خودکشی کرلی یہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر لڑکی کے باپ نے صاف اِنکار کر دیا اور اپنی لڑکی کی شادی کہیں اور کرنے لگے . . .

خوف کے سانڈ اپنے طاقتور سر اور خدشات کے لمبے سینگوں سے مجھے رگڑنے لگے۔

جوان لڑکی کا بوجھ کتنا بھاری ہوتا ہے مجھے اب پتا چلا تھا۔ آخر میں نے سوچا اگر میری لڑکی کسی سے عشق کرتی ہے تو میں اُسے کیسے روک سکتا ہوں بہتر یہی ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کرلیا جائے۔

پھر میں نے سنبھل کر اُس سے بات کر ہی لی۔

وہ بالکنی میں ایزی چیئر میں دراز کچھ سوچ رہی تھی۔ پین سے دانت بجاکر کسی خیال میں غرق تھی۔ سینے پر کتاب رکھی تھی۔ میرا شک حقیقت معلوم ہونے لگا۔ شاید وہ اپنے رنگین خواب کے بہترین اور لطیف سین میں رانی یا شہزادی بنی ہوئی ہے۔ اپنے شہزادے سے، محبوب سے . . .

مجھے دیکھتے ہی وہ سنبھلی۔ میں نے اِدھر اُدھر کی تمہید باندھ کر کہا :

"دیکھو بیٹی ــــ تم سمجھدار ہو ــــ محبت کوئی بُری بات نہیں یہ تو ازل سے انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر تمھیں کسی سے محبت ہے تو بے جھجک ہم سے کہہ دینا۔ جہاں تم چاہوگی وہیں شادی کر دیں گے۔

اُس نے اپنا معصوم چہرہ اُٹھاکر غور سے، حیرت سے مجھے دیکھا پھر کتاب اُٹھاکر کمرے کی طرف چل دی۔

اب میں اپنے دفتر جاتا تو بہت بوجھ کے ساتھ۔ گھر سے روانہ ہوتے ہی یہ خیال آتا تھا کہ دفتر پہنچتے ہی نہ جانے کیسی خبر منچندانی سنائے۔ حالاں کہ میرے گھر پر بھی اخبار آتا تھا لیکن میری نظریں کبھی ایسی خبروں پر نہیں پڑیں اور آخر میں تو اخبار سے ہی نفرت ہوگئی۔ میرے دفتر میں میرے کمرے میں کمپنی کی طرف سے اخبار آتا تھا میں نے چاہا بھی کہ رام داس سے کہہ دوں کہ اخبار میری ٹیبل پر مت رکھا کر، کہیں بھی رکھ دے چاہے منچندانی کی ٹیبل پر رکھ دے۔ مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ منچندانی جو میرا شروع سے دوست ہے روزانہ صبح اخبار دیکھنے ہی نہیں، مجھ سے ملنے بھی آتا ہے۔ اگر اخبار اُس کی ٹیبل پر رکھوا دوں تو وہ سوچے گا کہ شاید میرے دوست میں آفیسر کی بُو باس آگئی ہے جس کی وجہ سے وہ اب مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔

اور آج ــــ ابھی جیسے ہی میری نظر منچندانی پر پڑی میرا سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ حسبِ عادت کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے زور سے آواز لگائی :

"ارے رام داس! اخبار . . ."

لیکن ٹیبل پر رکھے اخبار پر نظر پڑتے ہی اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تیزی سے بڑھ کر اخبار اُٹھالیا۔

"اور سناؤ کیا حال چال ہیں؟" حالاں کہ کہا اُس نے مجھ سے تھا لیکن اُسے میرے جواب کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی نظریں پھڑکتی تڑپتی خبروں کی مچھلیاں تلاش کرنے لگیں پھر ایک دم جیسے چیخا :

"حد ہوگئی نیچ کام کی ــــ رام رام رام ــــ کیا زمانہ آگیا۔ کل یُگ ہے کل یُگ ــــ تم نے خبر پڑھی ــــ ؟" اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اور میرے دل نے دھڑکنا ایک دم بند کردیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں سوکھی ریت کی دیوار ہوں جو اب بھربھرا کر گرنے ہی والی ہے۔ خبر کی ہیڈنگ کیا تھی مجھے پتا نہیں چلا۔ وہ اب **تفصیل پڑھ** رہا تھا۔

جے پور۔ تھانہ برہمپوری میں تعینات ایک سب انسپکٹر نے نشے کی حالت میں اپنی جوان بیٹی کے ساتھ . . .

"خاموش" میں چیخ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میرا بھرپور ہاتھ اُس کے گال پر پڑا۔ منچندانی لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے پھولتی ہوئی سانس سے غضبناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے، لڑکھڑاتے لہجے میں کہا "اب ــــ اب ــــ اگر ــــ تم نے یہاں اخبار پڑھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔" پھر تیزی سے اخبار اُس کے ہاتھ سے چھینا اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے برسوں سے ٹینشن کے شکنجے سے میرا دماغ اب آزاد ہوگیا ہے۔

دستورِ شہرِ خواب بناتے بھی جائیے
خوابوں کو ساتھ ساتھ جلاتے بھی جائیے

تاریکیوں کے ظلم سُناتے بھی جائیے
جلتے ہوئے چراغ بُجھاتے بھی جائیے

تقصیرِ آب و گل کی دکھاتے بھی جائیے
بنجر زمیں میں خواب اُگاتے بھی جائیے

جاں تک مری رگوں سے چراتے بھی جائیے
خوفِ خدا مجھی کو دلاتے بھی جائیے

اب کے تو میرا قتل نہیں بسترِ خسرواں
اب کے مرا قصور بتاتے بھی جائیے

غُنچے وطن کی خاک سے کلیاں بھی پھول بھی
اس شمع رو کو راکھ بناتے بھی جائیے

جمشید مسرور

LINDEBER GASEN, 46A, N-1068
OSLO-10 NORWAY

عشرت دھولپوری

سنگباری کا ہر اک منظر اُٹھالے جائیں گے
صبح تک سڑکوں سے وہ پتھر اُٹھالے جائیں گے

خوشبوؤں نے رات بھر بدلی ہیں اس پر کروٹیں
کچھ فرشتے اب مرا بستر اُٹھالے جائیں گے

یہ مسیحا ہیں مگر ان کی سیاست اور ہے
آنکھ بخشیں گے مگر منظر اُٹھالے جائیں گے

صحنِ مقتل کو چمن کرنا بھی آتا ہے ہمیں
گردنیں رکھ جائیں گے خنجر اُٹھالے جائیں گے

تنگ دامانی جو شہروں کی یونہی بڑھتی رہی
لوگ ویرانوں میں اپنے گھر اُٹھالے جائیں گے

کچّی دیواریں حفاظت کرسکیں گی کب تلک
تیز جھونکے گاؤں کے چھپّر اُٹھالے جائیں گے

کُھل ہی جائے گا ہماری بند مُٹھی کا بھرم
چند سکّے ہیں جو سوداگر اُٹھالے جائیں گے

۷/۱۷۱، مالویہ نگر، جے پور (راجستھان)

اس نے یوں سلسلۂ لمسِ نظر کھولا ہے
سنگریزوں میں بھی اک بابِ گہر کھولا ہے

کوئی لایا نہ مرے شعلۂ تخلیق کی تاب
میری خوشبو نے مرا رازِ سفر کھولا ہے

کہنہ دیواروں پہ روشن ہیں خدوخال مرے
دل نے یہ کون سا سربستہ کھنڈر کھولا ہے

نشّۂ ساعتِ اوّل سے ہیں سرشار آنکھیں
پھول نے چہرہ پسِ شاخِ شجر کھولا ہے

آج کے منفرد اسلوبِ غزل نے عشرت
منظرِ خس تہِ دریائے شرر کھولا ہے

عشرت ظفر

یونی واچ کمپنی، لال املی کراسنگ، سائیکل مارکیٹ، کانپور (یوپی)

شمالی امریکہ میں اُردو

تاثراتِ سفر

قمر رئیس

سی-۱۶۶، وویک وہار، دہلی ۱۱۰۰۳۲

گزشتہ دس سال میں شمالی امریکہ (کناڈا) کے بعض شہر اُردو کی ادبی سرگرمیوں کے اہم مرکز بن گئے ہیں۔ یہ ایسے شہر ہیں جہاں برِ صغیر ہندو پاکستان کے لوگ قابلِ لحاظ تعداد میں آباد ہیں۔ ان میں پنجابی، گجراتی، بنگالی اور اُردو بولنے والے سبھی ہیں جو ترکِ وطن کر کے چالیس پچاس سال یا پندرہ بیس سال قبل کناڈا کے کم آباد شہروں میں بس گئے تھے۔ اُردو ان کے لیے تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب جبکہ وہ مرفہ الحال ہیں اپنی تہذیب و ثقافت کے مظاہرے ربط پیدا کرنے اور اپنے بچّوں کو ان سے متعارف کرانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں مجھے وہاں کے بعض سیمناروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس بار گزشتہ ستمبر میں مجھے وہاں کے تین سیمناروں میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ ٹورنٹو میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے پچھتر سالہ جنم دن پر ایک بڑا سیمنار تھا۔ اس کے بعد وہاں سے ہزاروں میل دور شہر کیلگری میں جوش ملیح آبادی پر ایک سیمنار تھا اور آخر میں ۹، نومبر کو اقبال کے جنم دن پر مانٹریال جیسے بڑے شہر میں ایک مذاکرہ تھا۔ اشفاق حسین صاحب ان تمام تقریبات کے COORDINATOR تھے۔ انھوں نے آخر ستمبر میں ہی مجھے ایئر فرانس کا ٹکٹ بھیج دیا تھا۔ علی سردار جعفری صاحب بھی مدعو تھے لیکن وہ نہیں جا سکے۔

۲۵، اکتوبر کی رات میں دو بجے کی فلائٹ سے ہم پیرس کے لیے روانہ ہوئے۔ ایئر فرانس کا طیارہ آرام دہ اور ہر طرح کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ سامنے کے اسکرین پر دلچسپ فلمیں دکھائی جاتی رہیں۔ آٹھ گھنٹے کا سفر سوتے جاگتے کٹ گیا۔ پیرس پہنچے تو وہاں ابھی رات ہی تھی۔ پانچ گھنٹے بعد وہاں سے ٹورنٹو کے لیے دوسرا طیارہ پکڑنا تھا۔ بقعۂ نور بنے ہوئے پیرس کے خوبصورت ایئر پورٹ پر میں تنہا کھڑا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرا نام لے کر آواز دی۔ دیکھا تو سرشار صدیقی صاحب کھڑے تھے ہم دونوں بڑے جوش سے بغلگیر ہوئے۔ انھوں نے حضرت محشر بدایونی سے تعارف کرایا جو پیچھے ایک صوفے پر نیم دراز تھے معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات بھی کچھ دیر پہلے کراچی سے آئے ہیں اور اب دوسرے طیارے سے امریکہ روانہ ہوں گے جہاں انھیں کئی مشاعروں میں شریک ہونا ہے۔ دیارِ غیر میں اس اچانک ملاقات سے حیرت اور خوشی تھی۔ ہم لوگ پہلی منزل پر ایک آرام دہ لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ چار گھنٹے خوش گپیوں میں گزر گئے۔ صبح کو نو بجے بھوک محسوس ہوئی تو میں نے کہا کہ سامنے کے کیفے میں چل کر ناشتہ کر لیں۔ دونوں یہ سن کر مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ میں حیران۔ کچھ دیر میں دونوں نے اپنے بیگ سے ناشتے دان نکالے اور ان میں سے لال لال پراٹھے اور کباب برآمد کیے۔ میں نے پانی کا انتظام کیا۔ اور لاؤنج کے دوسرے مسافروں سے بے نیاز ہو کر ہم لوگ مرغن پراٹھوں پر ٹوٹ پڑے۔ محشر صاحب بولے یہ انتظام اس لیے کیا کہ یہاں ذبیحہ کا گوشت ملتا نہیں۔ سرشار صدیقی صاحب بھی جب سے حج کر کے آئے ہیں حرام اور حلال میں فرق کرنے لگے ہیں یعنی شراب بھی ترک کر دی ہے۔

ہم لوگوں کی فلائٹ تقریباً ایک ہی وقت تھی یعنی ایک بجے۔ انھیں نیو یارک اور مجھے ٹورنٹو کی سمت روانہ ہونا تھا۔ یہ طیارہ دو منزلہ تھا اور مجھے اوپر کی منزل پر جگہ ملی۔ تقریباً چھ گھنٹے تک طیارہ بحر اٹلانٹک پر پرواز کرتا رہا۔ باہر کے منظر کی یک رنگی سے اکتا کر ہم فلمیں ہی دیکھتے رہے۔

ٹورنٹو میں جہاز اترا تو رات کے دس بجے تھے (پیرس ٹائم) لیکن روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامان لے کر باہر لاؤنج میں آیا تو کچھ ہی دیر بعد جاوید دانش صاحب مسکراتے اور تیز تیز قدموں سے میری طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ بولے باہر

ٹورنٹو میں ندیم سمینار ـــــ (دائیں سے) خالد سہیل، قمر رئیس، جاوید دانش

لد سہیل صاحب اپنی گاڑی میں منتظر ہیں۔ ہم
ے فوراً باہر آئے۔ خالد سہیل سے بغلگیر ہوئے۔
ڑی میں سامان رکھا اور چل دیے۔ ٹورنٹو کے
ہانے موسم اور دوستوں کی ملاقات نے راستے
تھکن دُور کر دی۔

پہلے ہم لوگ اشفاق صاحب کے گھر
نچے جو ایئر پورٹ سے قریب ہی تھا۔ وہاں ان کی
گم نرجس، بزمی صاحب اور زاہد صاحب سے
اقات ہوئی جو مقامی شعرا کے مشاعرے میں
انے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں بھی تازہ دم ہو کر
ن کے ساتھ ہو لیا۔ مشاعرہ ایک نو تعمیر لائبریری
عظیم الشان عمارت کے ہال میں تھا۔ ہال بھرا
ہوا تھا اور کئی شعرا کلام پڑھ چکے تھے۔ احمد
ریم قاسمی صاحب صدارت کر رہے تھے۔ مجھے
جن کا کلام سننے کو ملا ان میں عقیلہ شاہین، سیدہ نزہت صدیقی، جوش مندوزئی (جن کا شعری مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے) اور خالد سہیل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس لائبریری کا ایک حصّہ اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور اُردو کی کتابیں اور رسائل لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہاں بہت سے دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ شہزاد احمد، ڈاکٹر سحر انصاری، محسن احسان جو پاکستان سے آئے تھے۔ بخش لائلپوری جو لندن سے پہنچے تھے۔ مہمانوں کی تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ مجھے ڈاکٹر منموہن شرما صاحب کے ساتھ قیام کرنا تھا۔ جہاں بخش صاحب اور محسن احسان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ قیام پذیر تھے۔

ڈاکٹر شرما یوں تو امراض قلب کے ماہر ہیں لیکن اُردو شعر و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے پاس ہند و پاکستان کے بہترین مغنیوں کی گائی ہوئی اُردو غزلوں کا بڑا نایاب ذخیرہ ہے۔ ان کی بیگم بھی موسیقی کا بڑا رچا ہوا ذوق رکھتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُردو زبان انھوں نے ٹورنٹو میں ہی سیکھی۔ اُردو کی محفلوں اور تقریبات میں دونوں سرگرمی سے حصّہ لیتے ہیں۔

صبح سو کر اٹھا تو نو بج چکے تھے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ باہر نظر ڈالی تو خزاں کے رنگ بدلتے سُرخ سنہرے اور زرد پتّوں نے دل موہ لیا۔ موسم خزاں کے یہی وہ منظر ہیں جو بہار کی رُت سے زیادہ دلکشا ہوتے ہیں۔ مسی ساگا کا یہ علاقہ ٹورنٹو کی گھنی آبادی سے کچھ دور واقع ہے۔ اس کے اِردگرد پھلوں کے باغات اور جنگل ہیں۔ ڈاکٹر شرما نے بتایا کہ اس خطّے میں کروڑ پتی بلکہ اَرب پتی لوگ ہی محل نما مکان بنوا کر رہتے ہیں۔

اسی دن شام کو بیرونی شعرا کا بڑا مشاعرہ تھا۔ کناڈا میں اس طرح کے مشاعرے ایک قومی جشن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گھر گھر اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ پاکستانی اور ہندوستانی سیکڑوں میل دُور کے شہروں سے ڈرائیو کر کے مشاعرہ سننے کے لیے آتے ہیں۔ مشاعرے کے ٹکٹ جو دس ڈالر کے ہوتے ہیں اکثر پہلے ہی فروخت ہو جاتے ہیں۔

مشاعرہ شروع ہونے سے بہت پہلے ہال کی گیلری اور لاؤنج میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ چائے، کافی، سموسوں اور مٹھائی کے اسٹال لگے تھے۔ خواتین زرق برق لباس میں

موجود تھیں۔ یہاں لکھنؤ کے ڈاکٹر سلمان عبّاسی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ شکاگو سے آئے ہوئے افتخار نسیم ملے۔ جن کے بارے میں چودھری نعیم نے پچھلے دنوں لکھا تھا کہ وہ امریکہ کے شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ صبیحہ صبا اور حنیف اخگر صاحب بھی امریکہ سے آئے تھے، زہت صدیقی، عبدالقوی ضیا، عروج اختر زیدی، ولی عالم شاہین، بیدار بخت، حفظ الکبیر قریشی اور دوسرے شعرائے کرام بھی ملے۔ پاکستان سے آئے ہوئے شعرا میں قاسمی صاحب کے علاوہ جون ایلیا، محسن احسان، سحر انصاری اور شہزاد احمد تھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ آٹھ سو سیٹوں کا خوبصورت ہال اس طرح بھرا تھا کہ ایک سیٹ بھی خالی نہیں تھی۔ ڈائس پر میں قاسمی صاحب کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ وہ پہلی بار کناڈا آئے تھے اور سامعین کے جوش و خروش سے بے حد متاثر تھے۔ خاص طور سے ان کی شعر فہمی اور خوش ذوقی سے۔ اچھے اشعار پر خوب داد ملتی اور معمولی شعر پر سناٹا چھا جاتا۔ اشفاق حسین کی نظامت نے بھی مشاعرے کو کامیابی سے چلانے میں حصہ لیا۔ امریکہ اور کناڈا کے شاعروں کے کلام میں یا تو ارض وطن اور ماضی کی حسین یادوں کی کسک تھی یا ہجرتوں کے عذاب کا احساس تھا۔ چند اشعار ایک پرزے پر نوٹ کر لیے تھے:

ہوگیا خالی نگر بلوائیوں کے خوف سے
آنگنوں میں گھومتی پھرتی ہوائیں رہ گئیں
—— افتخار نسیم

گرتے ہوئے پتوں نے موسم کی خبر دی ہے
ہم پھر سے سنورنے کو اک بار بکھر جائیں
—— شاہین

وہ روشنی بھی اندھیروں نے چاٹ لی انور
کہ جس کے واسطے ہر روشنی لٹائی تھی
—— محمد انور

لوگ اس شہر میں اس درجہ ہراساں کیوں ہیں
کیوں کوئی شخص نکلتا نہیں گھر سے باہر
—— عروج اختر

وہ لوگ جن سے کریانے عمر بھر کے تھے
یہ اب کھلا وہی دشمن ہمارے سر کے تھے
—— بخش لائلپوری

اور آخر میں ندیم قاسمی صاحب کا شعر:

دائیں سے: سلمان عبّاسی، قمر رئیس، جون ایلیا، شہزاد احمد اور احمد ندیم قاسمی

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

مشاعرہ رات کو کوئی ایک بجے ختم ہوا۔ باہر نکلے تو شام جیسی رونق تھی۔ مغرب کے ان شہروں میں راتیں دن سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہوتی ہیں۔

دوسرے دن شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل "ہالی ڈے ان" کے ہال میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا پچھتّر سالہ جشن منایا گیا۔ یہ ایک سنجیدہ علمی مذاکرہ تھا۔ حاضرین کی تعداد ستّر پچھتّر سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن سب صاحبِ ذوق تھے جو آخر تک شریک رہے۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت فتح محمد ملک صاحب نے کی۔

سیمینار کا پہلا پرچہ ڈاکٹر خالد سہیل نے پڑھا۔ جس میں نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے قاسمی صاحب کی تخلیقات کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ انھوں نے قاسمی صاحب کی شخصیت کے بعض نازک پہلوؤں کو ان کے کرداروں اور تمثالوں میں تلاش کیا تھا۔ اکرام بریلوی صاحب نے جو حال ہی میں ٹورنٹو میں آباد ہو گئے ہیں احمد ندیم قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا تھا' ولی عالم شاہین نے 'جلا وطن کے خطوط' سلسلے کا ایک خط پڑھا جس میں قاسمی صاحب کی شاعری اور افسانوں میں دھرتی سے وابستگی کے نقوش تلاش کیے تھے۔ انھوں نے قاسمی صاحب کے فن کے کچھ نئے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا عبدالقوی ضیا نے انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا۔ جس کا عنوان QASMI, A POET OF GLO-BAL PERSPECTIVE تھا- انھوں نے قاسمی صاحب کی شاعری کے آفاقی عناصر کا سراغ لگایا تھا۔

ڈاکٹر سحر انصاری نے قاسمی صاحب کے شعری مجموعے "دشتِ وفا" کے آئینے میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا تھا۔ خاص طور سے انھوں نے شاعر کی انسان دوستی کے تصوّر کو اُجاگر کرتے ہوئے عظمت آدم کے بارے میں ان کے نظریے کو پیش کیا تھا' راقم الحروف نے اپنے مقالے میں احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کے ارتقائی مرحلوں کی نشان دہی کی اور ان کے حال کے لکھے افسانوں مثلاً "بہن" کے حوالے سے بتایا کہ انھوں نے بیانیہ تکنیک میں کامیاب تجربے کر کے اس کے نئے امکانات کو دریافت کیا ہے۔ فتح محمد ملک صاحب نے 'مقاماتِ ندیم' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ جس میں دقّتِ نظر کے ساتھ ندیم کی فکری اور فنّی بلندیوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ حال ہی میں ملک صاحب نے احمد ندیم قاسمی پر ایک جامع کتاب بھی لکھی ہے۔

ٹورنٹو میں فعال' باذوق اور مخلص ادیبوں اور ادب دوستوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ادبی اور تہذیبی جلسوں میں سرگرمی سے کام کرتی ہے۔ بیدار بخت کے علاوہ کرنل انوار احمد' خالد سہیل' جاوید دانش' ڈاکٹر منوہن شرما' نزہت صدیقی' حفظ الکبیر قریشی' رضا الجبّار اور دوسرے نوجوان ہیں جو تنظیمی کاموں میں اشفاق صاحب کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہاں اُردو سوسائٹی آف کناڈا بھی سرگرم عمل ہے۔ اسی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام حفظ الکبیر قریشی صاحب کی ایک اہم کتاب AN ANTHOLOGY OF MODERN URDU POETRY شائع کی گئی ہے۔ جس میں فیض' ن۔م۔ راشد' میراجی' مخدوم' سردار جعفری' جاں نثار اختر' اختر الایمان' مجروح' ساحر لدھیانوی' عزیز حامد مدنی جیسے شعرا کے علاوہ کناڈا کے دس اہم شاعروں کے منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ مع اردو متن کے شائع کیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"ایک نئی نسل جو شمالی امریکہ ہی میں پیدا ہوئی اب پروان چڑھ رہی ہے اور اسکولوں اور کالجوں میں پہنچ گئی ہے۔ ہندستان' پاکستان سے آنے والی نسل اپنے اس عظیم ادبی ورثے کو نئی نسلوں تک پہنچانا چاہتی ہے۔ چوں کہ گھر کا ماحول ہندستانی پاکستانی ہی رہتا ہے اس لیے یہاں پیدا ہونے والے بچّوں کو اُردو سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔"

اس طرح اس کتاب کا بڑا مقصد کناڈا میں نئی پیڑھی کے نوجوانوں کو اُردو شاعری کے ذائقے سے آشنا کرنا ہے۔

۲۷ اکتوبر کو خالد سہیل اور جاوید دانش کے ساتھ میں نے ٹورنٹو سے متصل WHITBY شہر کی سیر کی۔ ان دونوں کی رہائش یہیں ہے۔ افتخار نسیم صاحب بھی ہم سفر تھے۔ یہ ایک کھلا کھلا روشن اور جدید شہر ہے۔ رات گئے تک ہم لوگ خالد سہیل کے فلیٹ پر مختلف ادبی اور تہذیبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ خالد سہیل مجرد زندگی کے حامی ہیں اور افتخار نسیم GAY تحریک کی سرگرم حمایت کرتے ہیں جس کا مقصد اپنی ہی جنس کے لوگوں سے جنسی تعلّقات کی آزادی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ اور کناڈا کے بڑے شہروں میں اس تحریک نے تنظیمی شکل اختیار کر لی ہے اور وہ اپنے حقوق کے لیے جدّوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن جب میں نے افتخار نسیم کا شعری مجموعہ "غزال" پڑھا تو اس میں مجھے اتنی بھی امرد پرستی نظر نہیں آئی جتنی میر کے کلام میں ملتی ہے۔

ان کی غزلوں میں ناسٹیلجیا کی شدت کے باوجود تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ غزال ان کے اشعار میں بچپن کی سادگی فطری پن اور معصومیت کی علامت ہے:

بھولنے پائے نہ اُس دشت کی وحشت دل سے
شہر کے بیچ رہو، باغ میں آہو رکھو

خالد سہیل ایک تجربے کار ماہر نفسیات ہیں۔ ان کی نئی کتاب "انفرادی اور معاشرتی نفسیات" پڑھ کر اور ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ شمالی امریکہ میں مادی آسایشوں کی کثرت نے ذہنی اور اعصابی بیماریوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔

۲۸ نومبر کو جاوید دانش اور ان کی بیگم عظمی نے ہم لوگوں کی پُرتکلف ضیافت کی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ نوجوان بڑے محنتی ہیں اور اپنے پیشے میں انہماک اور اس کی مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے میں بھی خاصہ وقت صرف کرتے ہیں۔ میری دانست میں اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ شراب نوشی یا کسی دوسری طرح کے نشے کی لت میں مبتلا نہیں۔

۲۹ نومبر کی صبح کو میں ٹورنٹو سے کیلگری کی طرف روانہ ہوا۔ تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر کا سفر تھا جو تین گھنٹے میں طے ہوا۔ جون ایلیا، سحر انصاری، شہزاد احمد اور محسن احسان صاحب تقریباً اسی وقت لیکن ایک دوسرے طیارے سے کیلگری پہنچے۔ ایر پورٹ پر معلوم ہوا کہ وہاں کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے پندرہ ڈگری نیچے ہے۔ اقبال حیدر ان کی بیگم نکہت اور بہن شائستہ رضوی نے ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ جو زیادہ شدید ہوتی گئی۔ اقبال حیدر کے کشادہ مکان کی قدِ آدم دیواریں شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ اور یہ شہر کی آبادی سے دور ویرانے میں ہے۔ اندر سے مکان گرم ہے۔ ہم لوگ کرتے پہن کر بیٹھتے اور باہر کی شدید برف باری کا نظارہ کرتے۔ یہ سلسلہ کوئی دس روز تک جاری رہا۔ دو روز بعد احمد ندیم قاسمی فتح محمد ملک، اشفاق حسین اور سلمان عباسی بھی آگئے۔ ہم لوگوں نے یہاں جی بھر کر آرام کیا۔ ادبی نشستیں اور غیر رسمی مذاکرے ہوتے۔

۲ نومبر کو کیلگری یونیورسٹی کی سائنس فیکلٹی کے ایک ہال میں مشاعرہ تھا۔ اس دن درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بیس ڈگری نیچے تک پہنچ گیا تھا۔ اردگرد تالابوں اور جھرنوں کا پانی جم گیا تھا۔ اس کے باوجود لوگ مشاعرہ سننے کے لیے جوق در جوق آرہے تھے۔ اقبال حیدر کے بھائی جمال، عرفان اور بہن شائستہ مشاعرے کے انتظام میں دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ تقریباً تین چوتھائی ہال بھر گیا۔ قاسمی صاحب نے صدارت کی۔ ہندی کے ادیب شری دویدی جی نے ابتدائی تعارف کرایا۔ وہ ایک روز قبل ٹیلی ویژن کے لیے جوش پر ایک مذاکرہ ریکارڈ کرچکے تھے۔ جس میں سحر انصاری راقم السطور اور شائستہ نے حصہ لیا تھا۔ مشاعرے میں ابتدا میں مقامی شعرا انور، محمد ولی، اقبال حیدر اور پھر ناشاد جونپوری نے کلام سنایا اس کے بعد اشفاق نے غزل پڑھی:

سمندر چھوڑ آئے کوہ و دریا چھوڑ آئے ہیں
نئی دنیا کی خاطر ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
پہن کر ہم لباس اجنبیت اب کدھر جائیں
کہ ہم اپنا بدن لائے ہیں چہرہ چھوڑ آئے ہیں

ہجرت کے اسی کرب کی جھلکیاں دوسرے مقامی شعرا کے کلام میں بھی نظر آرہی تھیں۔ بعد میں سلمان عباسی، جون ایلیا محسن احسان، شہزاد احمد، سحر انصاری، راقم السطور اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے کلام سنایا۔ سامعین کے اصرار پر دوسرا دور بھی ہوا۔ جس میں منتخب شعرا نے کلام پڑھا۔ بارہ بجے شب کے بعد مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔ باہر نکلے تو دن جیسی رونق تھی۔ سامنے لائبریری میں بیسیوں طلبہ انہماک سے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔

دوسرے دن شام کو جوش لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام جوش سیمینار تھا۔ اس سوسائٹی کے صدر معتمد اقبال حیدر ہیں۔ جوش اور ان کی شاعری سے اقبال حیدر کے اہل خاندان کو غیر معمولی عقیدت رہی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۸۵ء اور پھر ۱۹۸۸ء میں وہ جوش پر دو سیمینار کرچکے ہیں۔ جن میں ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، رئیس امروہوی مرحوم اور راقم الحروف نے شرکت کی تھی۔ جوش پر ان کی سوسائٹی نے دو کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اقبال حیدر صاحب کئی سال تک 'پرواز' نام کا ایک پندرہ روزہ اخبار بھی کیلگری سے نکال چکے ہیں۔

یہ سیمینار بھی یونیورسٹی کیمپس کے ایک ہال میں ہوا۔ صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب نے کی۔ ابتدا میں ڈاکٹر سلمان عباسی نے جوش کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ جوش کی شخصیت اور مزاج کی تعمیر میں لکھنؤ کی تہذیب کا اہم حصہ رہا ہے۔ اس کے بعد عقیل اطہر نے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اُردو زبان کی موجودہ صورت حال کا حقائق کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ جوش اور اُردو دونوں کے ساتھ برصغیر ہند و پاک میں ایک جیسا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ شائستہ رضوی نے اپنے مقالے میں دنیائے انسانیت

اور کائنات کے تئیں جوش کی جستجو نے مسلسل کی
نشان دہی کی اور ان کی شاعری کی آفاقیت
پر زور دیا۔ پیشاور یونیورسٹی میں انگریزی کے
استاد اور ممتاز شاعر محسن احسان نے اپنے مقالے
میں جوش کی فکر کے دو دھاروں کی نشان دہی
کی ایک رومان پسندی کا دھارا اور دوسرا
تعقل دوستی کا جس نے گہری سماجی اور سیاسی
بصیرت تک ان کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر سحر انصاری
نے اپنے مقالے 'جوش اور غزل' میں صنف غزل
کے بارے میں جوش کے متنازعہ رویے کی وضاحت
کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ فن پارے میں مربوط فکر
کے قائل تھے اور ان کی بے شمار نظمیں مسلسل غزل
کہی جاسکتی ہیں۔ وہ تقلیدی روش کے خلاف
تھے۔ راقم السطور نے جوش کی شعریات کے ان
عناصر کا تجزیہ کیا جو ان کا تشخص ہیں اور انھیں
جملہ معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس سلسلے
میں دبستان لکھنؤ اور ایرانی تہذیب سے ان کی
اثر پذیری اور منفرد جمالیاتی حس پر خصوصیت
سے زور دیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے
صدارتی کلمات میں جوش کی عظمت کا اعتراف
کیا اور کہا کہ وہ حق پرست تھے۔ کوئی مصلحت
انھیں سچ بولنے سے نہیں روک سکی۔ وہ حریت
دوست اور عقلیت پسند تھے۔ انھوں نے برطانوی
سامراج اور دقیانوسیت کو للکارا اور سب
سے بڑی بات یہ کہ وہ انسان کی آزادی اور عظمت
کے پرستار تھے۔ آخر میں اقبال حیدر نے حاضرین
کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بعض بڑے
شاعروں کی عظمت کا اعتراف کما حقہ ہو چکا ہے
لیکن ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے جوش کی عظمت
کے اعتراف کا دور اب طلوع ہو رہا ہے۔ یہ ہم سب
کی ذمے داری ہے۔ اس سے کوتاہی مجرمانہ
بے انصافی ہوگی۔

کیلگری میں یوں تو بہت سے سنجیدہ
مسائل گفتگو کا موضوع رہے لیکن ایک مسئلہ جو
ہم سب کی توجہ اور تشویش کا باعث رہا وہ تھا
ہند و پاک میں بڑھتی ہوئی کشیدگی اور دونوں
ملکوں کے درمیان سچی دوستی اور اعتماد کے پل
کی تعمیر میں ادیبوں اور دانشوروں کا رول۔ ۸
نومبر کو کوئی گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہم اتفاق رائے
سے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم اہل قلم 'امن'، باہمی
اعتماد اور اتحاد کے لیے رائے عامہ کو تیار
کر سکتے ہیں اور سیاست دانوں کو باہمی محبت
تعاون اور آشتی کی نیک راہ دکھا سکتے ہیں۔
ہمیں یقین ہے کہ دونوں ملک اپنے کثیر دفاعی
مصارف میں کمی کر کے اپنے عوام کو غریبی اور
جہالت سے نجات دلا سکتے ہیں۔ حال ہی میں اسی
طرح کا ایک اجتماع سنیے ڈالمیا اور شمس الزماں
صاحب کی کوششوں سے ORGANISATION
OF UNDERSTANDING AND FRA-
TERNITY- کے زیر اہتمام ہوا۔ ضرورت
ہے کہ ہند اور پاکستان کے اہل قلم اس مسئلے
پر آزادی سے لکھیں۔ اور جرات کے ساتھ نئے
اقدامات کریں۔

۹ نومبر کو مانٹریال میں جشن اقبال تھا۔
مانٹریال کیلگری سے کوئی تین ہزار کلومیٹر دور
OVEBEC صوبہ کی راجدھانی ہے۔ جہاں
فرانسیسی زبان اور کلچر کی حکمرانی ہے۔ یہ شہر
بڑی بڑی خوبصورت جھیلوں کے درمیان کئی
جزیروں پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے
جشن اقبال کے سلسلے کا سمینار منسوخ ہو گیا
ہے۔ لیکن اسی دن یعنی ۸ نومبر کی شام کو
بخارا ہوٹل میں قاسمی صاحب کا جشن سالگرہ
منایا جائے گا اور کتابوں کا اجرا ہوگا۔ یہ تقریب
رات کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ یہ تقریب
بزم پاکستان کے زیر اہتمام ہوئی جس کے روح
رواں علی عباس حسنی اور ظہیر عباس تھے۔
تقریب کا دلچسپ آئٹم "ڈانسنگ ٹیلی گرام" تھا۔
مقامی دستور کے مطابق ایک بت طناز کی ساق
سیمیں میں ایک تہنیتی تار بندھا تھا۔ جسے جھک کر
قاسمی صاحب کو اپنے ہاتھوں سے نہیں ہونٹوں
سے اٹھانا تھا۔ بڑی حیرت ہوئی جب قاسمی
صاحب نے بڑی مہارت اور مشاقی سے یہ کام
انجام دے دیا۔ اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔
اسی تقریب میں بڑی عجلت میں حنیف 'افگر'،
عبدالقوی ضیا، جوش مندوزئی اور عزیز الحسن
عزیز کے شعری مجموعوں کی رونمائی ہوئی۔ محفل
کی نظامت ریاض کے پروفیسر اور مزاحیہ شاعر
محمد ذکی کر رہے تھے جو اسکول میں میرے
ہم جماعت تھے۔

ہم سب کا قیام لکھنؤ کے آفاق حیدر
صاحب کے ساتھ تھا۔ وہ اور ان کی بیگم نیر
بھابی مل کر آٹھ دس مہمانوں کا ناشتہ اور کھانا
تیار کرتے تھے۔ تقریبات میں لے جاتے اور سیر
بھی کراتے۔ ہمیں ان کی حالت پر ترس آتا لیکن
مجبوری تھی کہ وہ ساری تقریبات کے تنہا والنٹیر
تھے۔ شاید علی عباس حسنی صاحب کو کوئی اور
نہیں ملا۔ دوسرے دن مشاعرہ تھا جس میں
دو تین شعرا کے علاوہ سب وہی شاعر تھے جو
ٹورنٹو میں زینت محفل تھے۔ اور اکثر کلام بھی
وہی پڑھ رہے تھے۔

مانٹریال سے اردو کے کئی اخبارات
اور رسائل نکل رہے ہیں۔ 'پیامبر' نے جشن
اقبال کے موقعے پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔

ماہنامہ بزمِ خواتین بھی پابندی سے نکلتا ہے۔ جس کی مدیرہ فریدہ واسطی ہیں۔ اقبال رضا صاحب "مانٹریال ٹائمس" نکالتے ہیں۔

دوسرے دن ولی عالم شاہین نے اپنے شہر اُٹاوا (OTTAWA) میں ایک مشاعرہ رکھا تھا۔ یہ شہر کناڈا کی راجدھانی ہے۔ یہ مانٹریال سے کوئی دو سو کلومیٹر دُور ہے۔ ہم لوگ دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ میں آفاق حیدر صاحب کے ساتھ تھا۔ کھلا آسمان تھا لیکن سخت برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں صاف کشادہ سڑک اور دونوں طرف ہرا بھرا جنگل تھا جس میں بارہ سنگھے ہرن اور ریڈ انڈین بسے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم لوگ اُٹاوا پہنچ گئے۔ یہاں اشفاق حسین نے ایس۔ ایم۔ اشرف صاحب سے ملوایا۔ جو کناڈا کے نامور کلاسیکی کردار ہیں۔ وہ پاکستان کی مشہور شخصیت شائستہ اکرام اللہ کے داماد ہیں۔ شاید ۱۹۴۸ء میں وہ یہاں کی سول سروس میں آگئے تھے۔ ان میں جوانوں سے زیادہ جوش اور ولولہ نظر آتا تھا۔ شعر و ادب کا ذوق ان کے لہو میں رچا تھا۔ رتن ناتھ سرشار کی ٹکسالی زبان میں اور نہایت برجستگی سے وہ ماضی کے قصے سناتے تو لطف آجاتا۔ وہ اور ان کی بیگم مشاعرے میں بھی شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ کناڈا کی پارلیمنٹ کے سب سے خوبصورت ہال میں ہوا۔ حاضرین کا خاصہ بڑا مجمع تھا۔ اور شاہین صاحب کی خوش انتظامی قابلِ داد تھی۔ ماحول اتنا شگفتہ، شائستہ اور خوشگوار تھا اور حاضرین اس سلیقے سے داد دے رہے تھے کہ ہر شاعر کو زیادہ سے زیادہ شعر پڑھنے کی تحریک ہو رہی تھی۔ رات کو کوئی دو بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

صبح کو جب ہم آفاق حیدر صاحب کے ساتھ مانٹریال کی سمت روانہ ہوئے تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ارد گرد کے میدان اور جنگل برف سے ڈھک گئے۔

دوسرے دن میرے ایک علی گڑھ کے ساتھی اختر سعید کی بہن ثریا مجھے شاپنگ کرانے اور شہر کی سیر کرانے اپنی گاڑی میں لے گئیں۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ اس روپہلی پھوار میں شہر زیادہ روشن اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔

اگلے روز شام کو بھائی آفاق حیدر ہمیں MIRABEL کے بین الاقوامی ایئر پورٹ چھوڑنے آئے جو شہر سے ستر کلومیٹر دُور ہے۔ اور جہاں سے ہمیں ایئر فرانس کی آٹھ بجے کی فلائٹ سے پیرس روانہ ہونا تھا۔ ہم نے انھیں الوداع کہا اور کہا کہ ان کی مدارات اور مسافر نوازی کا شکریہ ہم لکھنؤ کو ادا کریں گے جس کی تہذیب ان کے گھرانے میں یادگار بن کر زندہ ہے۔

نظمیں

ایک عورت

انا کے ٹکڑے لیے کھڑی ہے
کبھی سوالی ہے ذہن و دل سے
کبھی گلہ ہے ضمیر سے بھی
مگر کہاں کوئی سُن رہا ہے
یہ پتھروں کے مکاں کے اندر
مکیں بھی سارے ہیں پتھروں کے
لیے کھڑی ہے
وہ اک سمندر سا آنسوؤں کا
اگر کہیں باندھ اس کے آنچل کا ٹوٹ جائے
ہر ایک قطرہ حساب مانگے گا
حشر سامانیوں کا تم سے
جواب آتش نوائیوں کا
جواب صحرا نوردیوں کا
مگر کہاں ہیں جواب سارے؟
جواب لفظوں سے ماورا ہیں

ملکہ نسیم

الف ۔ ۱۲، قورٹ کالونی، چار املی، بھوپال

یقین

وہ ایک بے بس ضعیف جوڑا
کہ جن کے بیٹے جواں ہیں لیکن
نہیں ہے اُن کا کوئی بھی حامی
پُرانے اخبار کی طرح وہ پڑے ہیں گھر میں
اُداس تنہا
انھیں یقیں ہے کہ اُن کے پوتے
کریں گے اُن کو شناخت اک دن .....

اندیشہ

گئے زمانوں کے مقبروں میں
ہیں ڈھیر سے جنگلی کبوتر
بنا رکھا ہے جنھوں نے اپنا
اسی کو مسکن
انھیں خبر ہے
کہ جستجو میں مکاں کی انساں بھٹک رہا ہے
انھیں یہ ڈر ہے
کہ آکے کوئی مکاں پہ قبضہ نہ کر لے اِن کے
اسی لیے بات چیت اِن کی
ہمیشہ سرگوشیاں رہی ہیں .....

مُلک زادہ جاوید

معرفت ڈاکٹر رضیہ حامد، ۴۵ ۔ بی، سیکٹر ۷، بھیل کالونی، نوئیڈہ

ایک سوال

بہت دنوں بعد
ہم اچانک ملے ــــــ تو اک دوسرے کو
آواز دے کے روکا
زباں تھی خاموش
ہم مگر ــــــ اپنی اپنی روداد کہہ رہے تھے
رموز و اسرار کی زباں میں ــــــ
ــــــ جدا ہوئے تھے تو اجنبیت نہیں تھی کوئی
مگر جو اب ہم ملے ہیں تو کیوں
فضا میں نامحرمی کی گم ہیں
ہمارے چہرے کے خال و خد
کیا بدل گئے ہیں،
ہم اپنے چہروں کی کھوج میں
بے مکان و بے خواب
ہو گئے کیوں؟
ہم آپ اپنے کو
ناشناسی کی ندیوں میں
ڈبو گئے کیوں؟؟

اظہر نیّر

۱۵۹ ۔ سی مارکیٹ، سیکٹر ۶، بھلائی نگر، درگ ۴۹۰۰۰۶ (ایم پی)

صحافت پر مضامین کا سلسلہ ــــــ (۶)

گزارش کا ابتدائیہ

عزیز الحسن جعفری
مکان نمبر ۱۰۱۷، گلی نمبر ۲۵، جعفرآباد، دہلی ۵۳...

اخبار اُٹھائیے اور کوئی گزارش پڑھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ (۱) سُرخی (عنوان) (۲) مقدماتی بند (پہلا پیراگراف) اور (۳) خبری داستان ــــــ سرخی بہت بڑے حروف میں، مقدماتی بند عموماً جلی حروف میں اور باقی گزارش اخبار کے عام خفی حروف میں لکھی ہوتی ہے۔

اخبار کی سُرخی ہی قاری کو خبر کی طرف متوجّہ کرتی ہے۔ مناسب سُرخی جمانا خود ایک فن ہے۔ یہ سُرخی ہی ہوتی ہے جو قاری کی تیرتی ہوئی نظروں کو روک کر گزارش پڑھنے میں منہمک کر دیتی ہے۔ لیکن صرف مناسب سُرخی ہی اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مقدماتی بند کی دلکشی ہوتی ہے جو قاری کو گزارش میں محو کر دیتی ہے۔ صحافتی اصطلاح میں مقدماتی بند کو ہی ابتدائیہ کہتے ہیں۔

مقدماتی بند یا ابتدائیہ

گزارش کا پہلا پیراگراف عموماً پوری گزارش کا مقدمہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو "مقدماتی بند" کہتے ہیں۔ اور چوں کہ اسی سے گزارش کی ابتدا ہوتی ہے لہٰذا اسے "ابتدائیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ ابتدائیہ چند لفظوں کا بھی ہو سکتا ہے اور چند سطروں یا پیراگرافوں پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ ابتدائیہ پوری گزارش کا اجمالی خاکہ یعنی پوری خبر کا لب لباب ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر خبر کے انتہائی اہم اجزا کو ابتدائیہ میں سمو دیا جاتا ہے۔

ابتدائیہ میں پوری خبر کو جامعیت کے ساتھ بیان کر دینا، کامیاب گزارش نویسی کی علامت ہے۔ ابتدائیہ اتنا توجّہ گیر ہونا چاہیے کہ قاری کو دوسری خبر پر "چھلانگ" نہ لگانے دے اور اُس کی توجّہ کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لے کہ وہ پوری گزارش کو اختتام تک پڑھنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اتنا جامع بھی ہو کہ قاری پر خبر کی نوعیت مکمل طور پر واضح کر دے۔

دراصل ابتدائیہ کے انداز سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قاری اس گزارش کو آخر تک دلچسپی سے پڑھے گا یا نہیں۔ ابتدائیہ توجّہ گیر نہ ہو تو قاری کی نظریں دوسری خبر کی طرف "پھسل" سکتی ہیں۔ ابتدائیہ کی مبہم طرز تحریر پوری گزارش سے بے التفاتی اور اُس میں مذکورہ حقائق سے بے اعتنائی کا باعث بن سکتی ہے۔ اور کوئی بھی نشریاتی ادارہ ایسی کسی گزارش کو شامل نشریات نہیں کرتا جس کو اُس کا قاری یا سامع پڑھنا یا سننا پسند نہ کرے۔ ادارتی عملہ ایسی گزارشات کو رد کر کے اُن کی جگہ دیگر ذرائع سے حاصل شدہ خبروں کو شامل کر لیتا ہے۔

ابتدائیہ کے اجزا

گزارش کے نکات کی ترجیحی لحاظ سے درجہ بندی کرنے سے قبل ضروری ہے کہ خبرنگار پر داستانِ گزارش کے تمام پہلو و حقائق واضح و روشن ہوں۔ گزارش میں چھ کاف (ک) پر مشتمل سوالات کے جواب شامل کیے جاتے ہیں۔ انھیں "شش کاف" کہا جاتا ہے: کیا، کون، کہاں، کب، کیوں اور کیسے۔ اگر ان تمام سوالات کے جواب ممکن نہ ہوں تو جتنے حاصل ہو سکیں اُن کو خبر کی اہمیت کے پیشِ نظر ترتیب دے کر گزارش میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ انھی شش کاف کے جوابات کا لب لباب ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

ابتدائیہ میں شش کاف

کیا: ہر ایک گزارش اور اُس کے ابتدائیہ میں سوال "کیا" کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ گزارش کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اس بات کی تشریح و وضاحت کرے کہ کیا واقعہ/سانحہ/حادثہ وقوع

پذیر ہوا ہے۔ مثلاً:

"اترکاشی میں تباہ کن زلزلے نے ایک ہزار سے زائد لوگوں کی جان لے لی۔"

"بس حادثے میں چالیس لوگ مارے گئے۔"

کون: اگر کسی خبری داستان میں "لائق خبر" کوئی شخص شامل ہے تو گزارش اور اس کے ابتدائیہ میں سوال "کون" کا جواب بھی دینا چاہیے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ "کون" کے جواب میں صرف مشہور و معروف شخصیات کو ہی شامل نہیں کیا جاتا بلکہ ہر ایک ایسا شخص اس کا مورد ہوسکتا ہے جو کسی بھی وجہ سے جزو خبر بن گیا ہے۔ مثلاً:

"افریقی طالب علم جیکب ایک کلو اسمیک کے ساتھ اندرا گاندھی ہوائی اڈے پر گرفتار کرلیا گیا۔"

"ٹیکسی ڈرائیور مہندر سنگھ نے امریکی سیاح جان بل کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔"

"پپّو نے شراب کے نشے میں اپنی بھتیجی وملا سے منہ کالا کیا۔"

کیوں: اگر کسی واقعے یا سانحے کا محرک اہم و دلچسپ یا نادر و کمیاب نوعیت کا ہو تو گزارش اور اس کے ابتدائیہ میں یہ بتا دینا چاہیے کہ "اس سانحے کا سبب یہ تھا" مگر اس کا ذکر کرتے ہوئے قانونی گرفت کا خیال رکھیں۔ اور جس طرز و انداز میں ممکن و مناسب ہو "راوی" کا حوالہ دے دیں۔ یا یہ کہ آپ خود چشم دید گواہ ہوں۔ مثلاً:

"قتل کا سبب آپسی رنجش بتایا جاتا ہے۔"

"اس کے بدلے میں "فلاں" تنظیم نے تین دہشت گردوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔"

"پولیس فائرنگ سے موقع پر ہی دس آدمی ہلاک ہوگئے۔"

کب اور کہاں: ان دو سوالوں کا جواب ہر ایک گزارش اور اس کے ابتدائیہ میں بہت ضروری ہے کبھی کبھی تو یہ بہت اہم نکتے ہوسکتے ہیں لہٰذا اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ خواہ ان کا ذکر اختصار کے ساتھ ہی ہو۔ ابتدائیے میں مقام کا نام اور گزارش میں اس کی تفصیل بیان کرنی چاہیے۔ مثلاً

"نئی دہلی (۲۵ دسمبر) آج یہاں۔۔"

"لکھنؤ (۱۲ر اکتوبر) کل رات اترکاشی میں۔۔۔"

"نئی دہلی (۲۸ دسمبر) یو۔پی کے ضلع مرادآباد میں کل۔۔۔" (ابتدائیہ)

"مرادآباد سے ۳۵ کلومیٹر جنوب میں واقع، قصبہ سرسی میں نماز جمعہ کے بعد۔۔۔ ۔۔۔" (گزارش)

کیسے: داستان خبر میں "کیسے" کا جواب ہمیشہ نہیں مل پاتا البتہ اگر مل جائے تو اس کو بھی گزارش اور اس کے ابتدائیہ میں شامل کرلیں۔ مثلاً

"شراب پلا کر گلا گھونٹ دیا۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق تیز دھار دار ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔"

"چور نقب لگا کر گھر میں گھس گئے۔"

ابتدائیے کے اقسام

ابتدائیہ کئی طرح سے لکھا جاتا ہے۔ معروف و مروج اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

ا- معکوس مثلث (الٹا اہرام): یومیہ اخبارات میں جو خبریں شائع ہوتی ہیں، ان کا روایتی طرز معکوس مثلث ہی ہے۔ اس میں گزارش کی اہم ترین باتیں شروع میں اور کمتر اہمیت کی حسب ترتیب بعد میں پیش کی جاتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر خبر کے "اوج" یعنی اس کے اہم ترین اجزا کو گزارش کے شروع میں لکھا جاتا ہے اور پھر سلسلہ وار اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ گزارش کے آخری بند میں خبر نگار کے تجزیات و توقعات اور دیگر ملحقہ معلومات شامل کی جاسکتی ہیں۔

اس قسم کی گزارش کا ابتدائیہ گویا پوری گزارش کی فہرست ہوتا ہے۔ گزارش میں مذکورہ باتوں کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی تخیلاتی شکل اس طرح بن جاتی ہے:
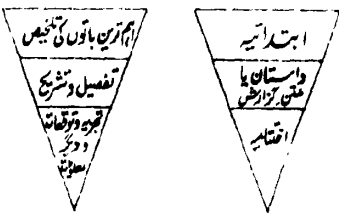
اس طرز پر گزارش نویسی کے کئی فائدے ہیں:

اوّل: یہ کہ قاری گزارش کے اہم نکات کو ابتدائیہ میں ہی پڑھ لیتا ہے۔ ممکن ہے ابتدائیہ کے بعض نکات اسے پوری گزارش پڑھنے کی طرف ملتفت کردیں۔

دوم: اس طرز کو عملۂ ادارت بھی پسند کرتا ہے کیوں کہ ایک تو انھیں ابتدائیہ پڑھ کر معقول سرخی لکھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے اور اس کو مناسب صفحے پر شائع کرنے کے متعلق

فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر گزارش ایسی ہے جس کے لیے اخبار میں جگہ پہلے سے معین کر دی گئی ہے یا مدیر اُس کو کسی سبب سے مختصر کرنا چاہتا ہے تو وہ گزارش کے آخری حصّے کو حذف کر سکتا ہے۔ پوری گزارش کو مکرّر پڑھنا اور پھر اُس میں سے کمتر اہمیت کے نکات کو کاٹنا، ادارتی کام میں الجھن پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس نیچے سے اوپر کی طرف اس حد تک قلم زد کرنا آسان ہے، جہاں گزارش کے اہم نکات کی تشریح ہے، یا ابتدائیہ داستان گزارش میں داخل ہوا ہے۔

سوم: یہ کہ اس طرز نگارش کو خبر نگار بھی بہت پسند کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح پر، وہ کسی خبر کو اختصار کے ساتھ بھی لکھ سکتے ہیں اور اسی کو طویل بھی بنا سکتے ہیں۔ معکوس مثلّث گزارش نویسی، روایتی مروج طریقہ تو ہے لیکن صرف یہی ایک واحد راستہ نہیں ہے۔ بلکہ عام دلچسپی کی گزارشات میں دیگر طریقے بھی رائج ہیں۔

۲۔ تلخیصی

تلخیصی طرز کی گزارش، مختلف النوع "مخلوط و مربوط" خبروں کا خلاصہ ہوتی ہے۔ جب ایک ہی خبر میں مختلف امور شامل ہوں اور ہر ایک اہم ہو نیز عجلت یا اخبار کی طلب و ضخامت اس کی متقاضی نہ ہو کہ ہر ایک مربوط عنوان کے لیے جداگانہ معکوس مثلث گزارش تیار کی جائے تو ایک ہی گزارش میں مختلف باتوں یا معاملوں کے خلاصے کو شامل کر لیتے ہیں۔

عموماً عدالتی مقدموں، جلسوں اور تقریروں میں تلخیصی طرز ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی گزارش نویسی میں مختلف موضوعات کا خلاصہ جمع کر کے انھیں معکوس مثلث کی شکل میں ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔ اور پوری گزارش کے ماحصل یعنی گزارش کے خلاصے کو اس کے ابتدائیہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

نئی دہلی (۲، جنوری) آج یہاں گرما گرم بحث کے بعد "فلاں" پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے جنرل سکریٹری کے عہدے سے "پچھوا سنگھ" کا استعفیٰ منظور کر لیا۔ ان کی جگہ "بچّو خاں" کو نامزد کر دیا گیا ہے۔ سیاسی حلقوں میں خان سنگھ "گہرے دوست" مانے جاتے ہیں۔ خاں صاحب جے۔ پی۔ اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ اس نامزدگی پر اُن کا ردّ عمل معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

اس ابتدائیہ میں "گرما گرم بحث"، "پچھوا سنگھ کی شخصیت"، "اُن کے استعفے کا سبب"، "بچّو خاں کی شخصیت"، "اُن کے حمایتیوں کے بیانات"، "پچھوا سنگھ سے اُن کے روابط"، "خاں صاحب کی علالت ؟!"، "نامزدگی کا راز" ..... بہت سے ایسے نکات و معاملات ہیں جن پر جداگانہ گزارش کا ابتدائیہ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر موقعیت اور دیگر اسباب کی بنا پر، خبر نگار نے سب کو تلخیصی گزارش میں شامل کر دیا ہے۔

۳۔ التوائے دلچسپی

التوائے دلچسپی میں خبر نگار گزارش کے انتہائی اہم نکتے کو اختتام گزارش تک قاری سے چھپائے رکھتا ہے۔ عموماً شروع کے جملوں میں اس کے متعلق کچھ اشارہ دے دیا جاتا ہے۔ عام دلچسپی کے بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں اہم ترین بات اگر اختتامیہ میں کہی جائے تو قاری کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ جیسے جیسے گزارش آگے بڑھتی ہے، اُس کا "ہدف" روشن ہوتا جاتا ہے۔ دقیق لفظوں میں اس کی تعریف یہ ہے کہ "جس گزارش کے اوج کو اختتامیہ تک ملتوی رکھا جائے اُسے التوائے دلچسپی گزارش کہتے ہیں۔" اُس کے مقدماتی بند کو التوائے دلچسپی ابتدائیہ کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل گزارش ملاحظہ فرمائیں:

زید نے اپنی رہائش گاہ روہنی اپارٹمنٹ میں شاندار دعوتِ ولیمہ کی۔ دولہا دلہن کے بہت سے دوست احباب قیمتی تحائف لے کر حاضر ہوئے۔ ولیمے سے فارغ ہو کر زید نے تحفوں پر نظر ڈالی۔ اُن میں کشمیر کے لیے ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ جو اگلے دن (۲۵، اپریل) کے لیے "او۔ کے" تھے۔ ٹکٹ کے ساتھ ایک پرچی تھی، جس پر لپ اسٹک سے لکھا ہوا تھا "غور کیجیے، یہ کس نے دیے ہیں!"

دونوں "ہنی مون" منانے کے لیے کشمیر چلے گئے۔ ایک ہفتہ سیر و تفریح کے بعد دونوں دہلی واپس آ گئے۔ جب وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ سارے تحفے غائب ہیں اور تجوری کا ڈھکنا کھلا ہوا ہے۔ اُن کی نظر سنگار میز کے آئینے پر پڑی۔ اُس پر لپ اسٹک سے لکھا ہوا تھا "اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ ٹکٹ کس نے دیے تھے!"

تحیراتی یا استعجابی

التوائے دلچسپی ابتدائیہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، مختصر گزارشات میں استعمال ہوتا ہے۔ تحیراتی یا استعجابی ابتدائیہ بھی التوائے دلچسپی کی مانند ہی لکھا جاتا ہے مگر عموماً اُس کو داستان یا چہرہ نویسی میں استعمال کرتے ہیں۔ اُس میں

ت، استعجاب اور پُر اسراریت کا عنصر
ب رہتا ہے۔

داستان میں کسی راز دارانہ نکتے کو کسی
تک راز رکھنے کی کوشش میں ایک عجیب
رح کی دلچسپی اور بقیہ داستان پڑھنے کے
ے رغبت باقی رہتی ہے۔ اور قاری یہ جاننے
ے لیے بیتاب رہتا ہے کہ اس کا آخر نتیجہ و
جام کیا ہوا۔ داستان نویس لطافت زبان
ا سہارا لے کر بیان کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایوانِ
ردو کے غالباً ہر شمارے میں ایسی داستانیں
ائع ہوتی رہتی ہیں، جن میں اس طرح کے
بتدائیے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً "ایوانِ اُردو"
مبر ۱۹۹ء کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"سرکس کا پورا تمبو کھچا کھچ بھرا ہوا
ھا۔ اور سارے لوگ ہمہ تن گوش تھے کہ
یک آدمی شیر کے مُنہ میں اپنا سر دینے والا
ھا . . ."

"گول چہرا، سانولا رنگ، لمبی چوٹی،
دراز قد، صراحی دار گردن، اُبھرا ہوا جسم،
بڑی بڑی آنکھیں، متناسب بدن، غرض لڑکی
کیا تھی ایک قیامت تھی۔ جس نے دیکھا دیکھتا
ہی رہ گیا۔ حالاں کہ گروپ میں اور بھی بیس
لڑکیاں تھیں لیکن . . ."

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں
تحیر و استعجاب کا استعمال ہے۔ پہلا اقتباس
"گزارشی چہرے" کا ہے اور دوسرے اقتباس
کا استعمال ایسے مضمون میں کیا گیا ہے جس
میں شخصیاتی اور گزارشی چہروں کا امتزاج
ہے۔ دونوں ابتدائیوں کی روش تحیراتی و
استعجابی ہے۔

داستان/ چہرہ نویس، اختتامیہ میں
مشتاق قاری کو وہ راز بتا کر حیرت زدہ
کر دیتا ہے، جسے ابتدائیہ میں پنہاں رکھا گیا
تھا۔ ایسے چہروں کو جلد بازی اور روا روی
میں نہیں لکھا جا سکتا، کیوں کہ قاری کے استعجاب
کو برقرار رکھنا، دشوار کام ہے۔ اسی کے ساتھ
یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ غیر سیاسی چہرہ گزارش
اس طرز پر لکھے جا سکتے ہیں لیکن حادثاتی سانحات
کی "گزارشات" میں اس انداز کو اختیار نہیں
کرنا چاہیے۔

ابتدائیہ نویسی کے رہنما نکات

۱۔ ابتدائیہ گزارش خبر کی مناسبت سے لکھیے: خبر سنجیدہ ہے تو ابتدائیہ بھی سنجیدگی سے پُر ہونا چاہیے۔ اگر اُس میں شوخی، مزاح یا ہنسی مذاق کا عنصر غالب ہے تو اُس کا ابتدائیہ بھی وہی عکاسی کرے۔ ہاں! اگر کسی سنجیدہ مسئلے کو جان بوجھ کر شوخ انداز میں پیش کرنا ہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن صحافتی ضابطۂ اخلاق اور "ہتک عزت" قانون کا خیال رہے۔

۲۔ ابتدائیہ ایسا ہو جو قاری میں پوری گزارش پڑھنے کا جذبہ پیدا کر دے: اس کے لیے روزانہ اخبارات پڑھیے۔ اور جب بھی آپ کوئی گزارش پڑھیں تو غور کیجیے کہ خبر نگار نے اس کے ابتدائیہ میں کون سی ایسی ترکیب استعمال کی ہے کہ آپ پوری گزارش پڑھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ جس چیز نے آپ کو مائل کیا ہے، وہ دیگر قارئین کو بھی ملتفت کرے گی۔ لہٰذا اپنی گزارش میں اُس ترکیب کو استعمال کرنے میں ہرگز نہ ہچکچایئے۔ ابتدائیہ اتنا جالب ہونا چاہیے کہ قاری کو دوسری خبر کی طرف التفات سے روکے رکھے۔

۳۔ ابتدائیہ حتی الامکان مختصر لکھیے: یوں تو ابتدائیہ چند کلمات سے چند پیراگرافوں تک کا متحمل رکھتا ہے لیکن اچھا ابتدائیہ وہی سمجھا جاتا ہے جو مختصر ترین ہو۔ کوشش کیجیے کہ اس میں چالیس سے زائد کلمات نہ ہوں اور پوری گزارش کا لب لباب اُس میں آ جائے۔ نیز الفاظ اتنے دلکش اور پُر اثر ہوں کہ پوری گزارش پڑھنے پر مائل کر دیں۔ یہ دھیان رہے کہ قاری کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدائیہ میں نظم و ضبط اور اختصار سے کام لیجیے اس کے ساتھ اس میں قابل فہم وضاحت بھی ہونی چاہیے۔

۴۔ ابتدائیہ گزارش/ چہرے کے کلیدی نکتے پر مبنی ہونا چاہیے: اس کے لیے "شش کاف" اصول کو مدنظر رکھیے ..... آج کل شش کاف کا استعمال، دیگر خبروں کے مقابلے میں، قانون شکنی کی گزارشاتِ خبر میں زیادہ ہوتا ہے۔

۵۔ ابتدائیہ نویسی کی مشق کیجیے: اگر وقت میں گنجائش ہے تو ایک ہی خبر کے لیے مختلف نوعیت کے ابتدائیے لکھ کر پڑھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کونسا ابتدائیہ زیادہ موزوں ہے۔

۶۔ گزارش نویسی کی سب سے زیادہ اہم درسی کتاب: یومیہ اخبارات ہوتے ہیں۔ اگر گزارش نویسی میں آپ مبتدی ہیں تو روزانہ متعدد اخبارات پڑھیے۔ اسی کے ساتھ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی خبروں کو توجہ کے ساتھ سنیے۔ یہ سب چیزیں آپ کے لیے روزانہ ہزاروں اچھے/ بُرے نمونے پیش کرتی ہیں۔

۷۔ اچھی اور بُری گزارشات کے نمونوں کو اکٹھا کیجیے۔ اس سے آپ کو قارئین کے معیار دلچسپی کا اندازہ ہو جائے گا۔ قارئین کی دلچسپی اور اچھے خبر نگار کی روش کو مدنظر رکھتے ہوئے، اگر آپ بھی کوشش کریں تو عمدہ ابتدائیہ اور بہترین گزارش لکھ سکتے ہیں۔

لوٹ پیچھے کی طرف

تسنیم کوثر

معرفت انوار الحق تبسّم، محلہ نوگھروا، بالمقابل سلطان گنج تھانہ، پوسٹ
مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ (بہار)

"امّاں... امّاں کہاں ہیں آپ؟"
شاہ زماں پرانی حویلی کے کھلے دروازے سے اندر چلے آئے۔ اونچی چھت اور لمبے لمبے سائبان، کشادہ کمروں والی پُرانی حویلی گئے وقتوں کی نشانی تھی۔ اس کے پھاٹک اب کھلتے اور بند ہوتے وقت کراہنے کی سی لمبی آواز پیدا کرتے تھے۔ شاہ زماں بغل میں فائل دبائے اور ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ اُٹھائے لمبا دالان عبور کرکے امّاں جی کے کمرے میں آگئے وہ عصر کی نماز ادا کررہی تھیں۔ شاہ زماں ساگوان کے بھاری بھرکم پلنگ پر بیٹھ گئے۔

امّاں جی کے کمرے میں مختصر سا سامان تھا۔ اُن کا کالے پینٹ والا بھاری بھرکم پلنگ، نماز کی چوکی، سائڈ میں رکھی لکڑی کے اسٹینڈ پر مٹی کی صُراحی چاندی کے کٹورے سے ڈھکی۔ دیوار سے لگا اُن کا پُرانا لوہے کا بکس سفید کپڑے سے ڈھکا۔ کمرے کی دیواروں اور اُس سے متعلق چیزوں پر پاکیزگی کی علامت سفید رنگ حاوی تھا۔ چھت سے لٹکتا پنکھا جو سدا ایک ہی رفتار سے گھومتا تھا۔ گرمیوں میں کھڑکی دروازے خس سے ڈھک دیے جاتے اور اُن پر پانی چھڑکنے سے خس کی خوشبو پورے گھر میں چکراتی پھرتی۔ امّاں جی کے کمرے میں عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا، سکون اور ٹھنڈک کا احساس آپ ہی آپ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔

امّاں جی کو سلام پھیرتا دیکھ کر شاہ زماں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھائے، انھوں نے اشارے سے "جیتے رہو" کہا۔ دعا کے بعد تسبیح ختم کی اور شاہ زماں پہ پھونکتے ہوئے بولیں "کیا بات ہے میرے لال یہ مٹھائی کس خوشی میں ہے؟" شاہ زماں نماز کی چوکی تک چلے آئے اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولے "امّاں آج ہمارا کام ہوگیا، شہر کے وسط میں ہمیں زمین الاٹ ہوگئی ہے، اب ہمارے سارے دلدر دُور ہوجائیں گے۔"

"ہیں! گویا ہمیں جانا ہی پڑے گا۔"

امّاں جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اس مغالطے میں تھیں کہ شاید کوئی صورت نکل ہی آئے اور انھیں حویلی نہ چھوڑنا پڑے۔ حالاں کہ سرکاری نوٹس تو تین مہینے پہلے ہی مل چکا تھا۔

حکومت پُرانی حویلی کی جگہ ایک مارکیٹ کمپلیکس بنوانا چاہتی تھی کیوں کہ یہ علاقہ بزنس پلیس تھا۔ لہٰذا مالکان کو شہر کے وسطی رہائشی علاقے میں زمین الاٹ کردی گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد بھی گفتگو کا موضوع حویلی ہی تھا۔ "امّاں اب تو مجبوری ہے حویلی تو جلد از جلد خالی کرنا ہوگی۔" شاہ زماں دھیرے سے بولے۔

"جس حویلی نے ہماری چار پشتوں کو پروان چڑھایا ہو، جس کی دیواریں اس گھر کے مکینوں کی محبت کی امین ہوں، جس کا ذرہ ذرہ خلوص و وفا کی خوشبو سے مہکتا ہو اس سے جدائی کا تصوّر ہی میرے لیے جان لیوا ہے میرے بچے۔" امّاں جی نے آنسوؤں سے لبریز لہجے میں کہا۔ "لیکن بیٹے اتنی جلدی ہم جائیں گے کہاں؟" وہ کچھ فکرمند تھیں۔
"آپ پریشان نہ ہوں امّاں! میں نے اپنے دوستوں سے کہہ رکھا ہے وہ کوئی نہ کوئی کرائے کا مکان تلاش کرلیں گے۔" شاہ زماں نے ڈھارس بندھائی۔

اگلے دن سے شاہ زماں نے مکان کی تلاش کا کام تیز کردیا۔ روز گھر سے نکلتے وقت امّاں جی تاکید کرتیں "بیٹا مکان اچھا سا لیجو مجھ سے بند کمروں میں نہ رہا جائے گا۔"

امّاں جی کو اس بڑی سی حویلی میں سب سے پیارا اپنا آنگن لگتا تھا۔ ان کے خیال میں بغیر آنگن کے کوئی مکان گھر نہیں ہوتا۔ اطراف میں بیلا، گلاب اور رات کی رانی کے پودے آنگن کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے اور امّاں جی پہروں یہاں بیٹھی گزرے وقت کو یاد کرتی رہتیں۔ کبھی ایسا بھی تھا کہ...

گرمیوں میں شام کے وقت آنگن میں چارپائیاں اور چوکیاں بچھ جاتی تھیں پکوڑوں کے

...اتھ شام کی چائے پی جاتی تھی اور گپ شپ،
...ی مذاق کا دور رات گئے تک چلتا رہتا۔ بچے
...ے سے آنگن میں کوڑا جمال شاہی کھیلتے یا پھر
...رے میں لگے موٹے کھمبوں کے پیچھے چھپا چھپی۔
...حویلی میں تو کبھی کبھی بڑے بھی شامل ہو جاتے
... کچھ سال پہلے جب شاہ زماں کے بڑے ابا اور
...ٹے ابا بھی اسی حویلی میں رہتے تھے تو ایسا روز
...معمول تھا بلکہ حویلی میں رات تو شاید ہوتی ہی
...تی۔ حویلی کا یہ بڑا سا خوبصورت آنگن تینوں
...تینوں کے میل محبت کا امین تھا۔ جب سے
...نوں دیور پاکستان شفٹ ہوئے حویلی کی
...نقوں میں کمی آئی اور پھر جب شاہ زماں کی
...نوں بہنیں بیاہ کر پیا دیس سدھاریں تو حویلی
...سناٹے کا راج ہو گیا۔ اب تو بس یہ دونوں
...ں بیٹا ہی رہ گئے تھے۔

شاہ زماں کے والد کافی عرصہ پہلے انتقال
...ر چکے تھے۔ گاؤں میں کچھ زمینیں تھیں منشی جی
...سال میں ایک بار فصل دے جایا کرتے تھے۔ خان
...زماں کی پنشن اوپر کے کاموں پر اٹھ جاتی تھی۔
...شاہ کو سانس کی تکلیف نے آگے پڑھنے نہ دیا
...در بھلا انٹر پاس کے لیے کونسی نوکری دھری
ہے۔

اماں جی کے کہنے پر شاہ نے تینوں بہنوں
کو آنے کے لیے خط لکھ دیے تھے کہ آخری بار سب
اس حویلی میں اکٹھے ہو جائیں۔ یکے بعد دیگرے
تینوں اپنے بچوں اور شوہروں سمیت آگئیں۔
ان سے اور ان کے ننھے منے بچوں کی کلکاریوں
سے پورا آنگن گونج اٹھا۔ حویلی میں رونق سی ہو گئی
تھی۔ لمبے اسارے میں آتی جاتی اماں جی بہت خوش
نظر آتی تھیں۔ دوپہر کے وقت تینوں لڑکیاں اپنے
اپنے بچوں کو لے کر کمرے میں بند ہو گئیں تو اماں جی
پھر ماضی میں کھو گئیں۔

شاہ زماں مکان کی تلاش میں لگے تھے۔
کوئی ڈھنگ کا مکان ملتا ہی نہ تھا۔ تھک کر گھر
آتے تو جلد ہی سو جاتے۔ بہنوں سے بھی گپ شپ
کا موقع کم ہی مل پاتا تھا۔ وقت پلک جھپکتے گزر
گیا اور دوبارہ نوٹس آگیا۔ رقیہ، رضیہ اور رافعہ
اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

ایک دن شاہ زماں نے اطلاع دی کہ مکان
مل گیا ہے اور اگلے دن شفٹ ہونا ہے۔ اماں جی
کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں وہ پوری حویلی میں بولائی
بولائی سی پھرتیں۔ کبھی اس دیوار پر ہاتھ پھیرتیں
تو کبھی اس کھمبے سے لگی سسکتیں۔ گلاب کی
کیاریاں سنوارتیں تو کہیں بیلے کے پودے میں
پانی دینے لگتیں۔ یہ سب کچھ بلڈوزر کے نیچے
آنے والا ہے، سوچ کر ان کا کلیجہ کٹ گیا۔

آج اس آنگن میں ان کی آخری شام تھی۔
کونے میں بچھی چوکی پر بیٹھی وہ کپڑے تہہ کر رہی
تھیں گزرا ہوا وقت ان کی آنکھوں میں فلم کی مانند
چل رہا تھا۔ انھیں یاد آیا کہ ایک بار وہ آنگن میں
گیہوں سکھا رہی تھیں۔ چھوٹے دیور رنگ سے
بھرا مگ لیے منجھلی بہو کو تقریباً دوڑاتے ہوئے
آنگن کی طرف آئے تھے اور گیہوں پر پیر پڑتے
ہی رنگ کا مگ لیے نیچے آرہے، بہو تو لانگتی پھلانگتی
اس پار جا کھڑی ہوتیں اور سارا رنگ اماں جی کے
سفید دوپٹے کو رنگ گیا تھا۔ دیور صاحب اور
گیہوں بھی بچ نہ سکے۔

حویلی ان کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ اس
سے بچھڑنے کا غم انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا
تھا۔ اتنا تو وہ منجھلے اور چھوٹے دیوروں کے پاکستان
جانے پر بھی نہ روئی تھیں۔ یہی وہ آنگن تھا جہاں
وہ دلہن بن کر اتریں اور یہیں ان کے شوہر کی
لاش بھی رکھی گئی۔ یہ حویلی گواہ تھی کہ کبھی شوہر کی
محبت پاش نظروں کی تاب نہ لا کر کسی کھمبے کی اوٹ لی
تھی اور کبھی شدت غم سے دیواروں سے سر ٹکرایا
تھا۔

آخر وہ وقت بھی آگیا جس کا اماں جی کو
قطعی انتظار نہ تھا۔ سارا سامان جا چکا تھا۔ ماں
بیٹے نے آخری بار حسرت سے حویلی کے در و دیوار
پر نظر ڈالی، اماں جی نے پودوں کو پانی دیا، شاہ زماں
نے کھڑکی دروازے بند کر دیے اور سہارا دے کر
اماں کو باہر لے آئے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی
تھیں۔ اس بیچ رکشہ والے نے آواز لگائی "باوجی
جلدی کیجیے۔" "چلو بیٹا" اماں جی آہستہ سے
بولیں۔ پھاٹک سے دور ہوتے ہوئے انھوں نے
کئی بار مڑ کر دیکھا۔ ان کے لیے یہ دکھ جلاوطنی
سے کم نہ تھا۔

رکشہ جب چھ منزلہ عمارت کے سامنے
رکا تو اماں جی نے بیٹھے ہی بیٹھے آنکھوں کے آگے
اپنے ہاتھوں کا چھجہ بنا کر اوپر کی سمت دیکھا،
رنگ و روغن سے چمکتی اس بلڈنگ میں ان گنت
کھڑکیاں تھیں، دو دو کھڑکیوں کے آگے تھوڑا
آگے کی طرف بالکنی تھی کسی میں پھولوں کے گملے
رکھے تھے تو کہیں کپڑوں کی الگنی تھی ان میں ٹنگے
رنگ برنگے کپڑے ہوا کے دوش پر جھنڈوں
کی طرح لہرا رہے تھے۔

"کیا یہیں اترنا ہے؟" انھوں نے رکشے
سے اترتے ہوئے بیٹے سے پوچھا۔ جو رکشے والے
کو کرایہ دے رہے تھے۔ "جی اماں وہ سامنے
ہمارا فلیٹ ہے۔" انھوں نے عمارت کی دوسری
منزل کی طرف اشارہ کیا۔ اور اماں جی کو لے کر
فلیٹ کی طرف بڑھ گئے۔
یہ بلڈنگ ایک بیوہ عورت کی ملکیت تھی۔

اماں جی فلیٹ کا چکر لگا کر ابھی پلنگ پر بیٹھی ہی تھیں کہ وہ آگئیں۔ شاہ زماں کھانے پینے کی اشیا لانے بازار گئے تھے۔ "آداب! میں عالیہ خانم ہوں اس بلڈنگ کی مالک کہیے گھر پسند آیا؟" انھوں نے دروازے پر سے ہی اماں جی کو مخاطب کیا۔ اماں جی بستر پر اُٹھ بیٹھیں، انھوں نے عالیہ خانم کو اُوپر سے نیچے تک بغور دیکھا اور بولیں "گھر؟ بی بی چند دیواروں کو جوڑ کر اُوپر چھت ڈالنے سے کیا گھر بن جاتا ہے؟" عالیہ خانم کو اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی بولیں:

"بہن لگتا ہے آپ زمانے کے سرد و گرم سے واقف نہیں"۔ عالیہ خانم نے طنزیہ کہا۔

"بھلا آنگن کے بغیر بھی کوئی گھر مکمل ہوتا ہے"۔ اماں جی خشک لہجے میں بولیں۔

"آنگن؟ وہ کس لیے؟" عالیہ خانم نے کندھے اُچکائے۔

"لو، حویلی سے جدائی ہی کیا کم تھی کہ اب انھیں آنگن کی ضرورت اور اہمیت بتانی ہوگی"۔ اماں جی کھڑی ہونا چاہتی تھیں مگر ان کے پیر لڑکھڑائے اور وہ فرش پر گریں اور بے ہوش ہوگئیں۔

شاہ زماں بازار سے لوٹے تو فلیٹ کے گرد بھیڑ دیکھ کر چونکے، راستہ بناتے ہوئے اندر آئے تو دیکھا اماں جی بے ہوش پڑی تھیں اور چند عورتیں ان پر جھکی انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ الٹے قدموں بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو لے آئے۔ اماں جی کے اوسان بحال ہوئے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ جیسے تیسے کٹ رہی تھی یہ فلیٹ اماں جی کو مُرغی کا ڈربہ لگتا تھا اور وہ پنجرے میں بند کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی تھیں۔ ایسے میں انھیں اپنا حویلی والا آنگن بہت یاد آتا تھا۔

مگر پھر عادت سی ہوگئی اور اب حالات بھی تو وہ نہیں رہے تھے۔ شاہ نے مایوس ہوکر نوکری کی تلاش چھوڑ دی تھی۔ کھیت بھی بھرپور فصل نہیں دے رہے تھے۔ فلیٹ کا کرایہ الگ ایک بوجھ تھا۔ لے دے کے ایک پنشن ہی رہ گئی تھی۔

پاس پڑوس سے دوستی ہوگئی تو اماں جی کا وقت اچھا کٹنے لگا۔ فلیٹ کی مالک بھی اماں جی کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئیں تھوڑی دعا سلام بڑھی تو وہ عالیہ خانم کے فلیٹ میں آنے جانے لگیں۔ ان کا جدید طرز پر آراستہ فلیٹ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوتیں۔ پوچھنے پر خانم نے بتایا کہ یہ بلڈنگ ہی ان کی کفیل ہے۔ ان کی دونوں بیٹیاں بھی پڑھ رہی ہیں۔ باتوں کے دوران انھوں نے بیٹیوں کے لیے جوڑ جمع کیے گئے جہیز کی تفصیل بھی بتائی۔ انھوں نے بیٹیوں کی شادی کا تذکرہ کیا تو اماں جی کو بھی شاہ زماں کی شادی کا خیال آیا۔ اس کی بہنیں بھی کئی دفعہ اماں جی پر زور ڈال چکی تھیں۔

آج کل شاہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ انھوں نے کچھ تو حکومت کی طرف سے ملی رقم اور کچھ اپنی آدھی زمین بیچ کر اپنے نئے مکان کی تعمیر شروع کروادی تھی۔ وقت گزرتے دیر نہ لگی اور مکان تیار ہوگیا۔ پانچ سال کا عرصہ کبھی تنگی اور کبھی فراغت سے گزر ہی گیا۔ آج وہ دن آگیا تھا کہ اماں جی اپنے گھر جا رہی تھیں تمام پاس پڑوس انھیں رخصت کرنے جمع ہوگیا تھا۔

اپنے گھر جاتے ہوئے اماں جی اکیلی نہیں تھیں بلکہ عالیہ خانم کی چھوٹی لڑکی ثمینہ ان کی بہو کے روپ میں ساتھ تھی۔ صبح کا وقت تھا سڑک پر زندگی تیز رفتاری سے فاصلے طے کر رہی تھی ایک دوسرے سے بے نیاز لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ منزل آنے پر اماں جی کار سے اُتریں آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھجّہ سا بنا کر سامنے رنگ و روغن سے چمکتی اس اونچی عمارت کو دیکھا جس کے کچھ فلیٹ آباد ہوچکے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹے اور بہو کے ساتھ اندر آگئیں۔ انھوں نے گراؤنڈ فلور پر رہنا پسند کیا۔

وقت اور حالات اچھے بھلے انسان کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ پُرانی شخصیت کی شناخت مشکل ہوجاتی ہے۔

آج ایک نئے کرایے دار آئے ہیں اماں جی نے سوچا مل آئیں۔ وہ دوسری منزل پر بنے اس فلیٹ میں آگئیں۔ آنے والوں کا سامان بے ترتیب پڑا تھا اور پلنگ پر لیٹی بوڑھی عورت بھی سامان کا حصہ لگ رہی تھی۔ اماں جی کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوتیں۔ اماں جی بولیں "آداب، میں بیگم زماں ہوں اس فلیٹ کی مالک، کہیے گھر پسند آیا؟"۔ "گھر؟ بہن! چند دیواروں کو جوڑ کر اُوپر چھت ڈال دینے سے کیا گھر بن جاتا ہے، اس گھر کا آنگن کہاں ہے؟" بوڑھی عورت ایک سانس میں بولی "آنگن! بھلا وہ کس لیے؟" اماں جی بولیں۔ بوڑھی عورت لمبی سانس لے کر بے ہوش ہوچکی تھی۔

اگرچہ مجھے غم ملے ہیں زیادہ
مگر میرا دل بھی ہے کافی کشادہ

خموشی کی تردید کا مدّعی ہے
تکلّم کا روٹھا ہُوا شاہزادہ

اُداسی پہ مضمون لکھنے کی خاطر
مری زندگی سے کرو استفادہ

سواری کے احسان سے چوٹ لگتی
اگر ہم نہ کرتے سفر پا پیادہ

اثرؔ! مجھ کو تاریک چادر ملی ہے
نہ جانے کہاں ہے منوّر لبادہ؟

ساجد اثرؔ

دیوان بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱

عظیم امروہوی

کبھی میں دل میں کبھی اُس کی چشمِ تر میں رہا
کبھی سفر میں رہا ہوں کبھی حضر میں رہا

نہ جانے کتنے سفینے بچائے طوفاں سے
یہ اور بات ہمیشہ میں خود بھنور میں رہا

سمندروں کو بھی پی کر نہ جس کی پیاس بُجھی
اُس آفتاب کے نیچے میں دوپہر میں رہا

اُسے بھی آ گئے آداب سنگ باری کے
وہ گاؤں چھوڑ کے شیشے کے جب نگر میں رہا

نہ جانے کس گھڑی چھوڑا تھا اپنا گھر میں نے
پھر اس کے بعد نہ جا کر میں اپنے گھر میں رہا

وہ دل کہ جس پہ مرا خود ہی بس کبھی نہ چلا
عجیب بات کہ وہ بھی ترے اثر میں رہا

امیرِ شہر کے ہاتھوں پہ جب نہ بیعت کی
ہمارا نام نہ فرمانِ آبِ زر میں رہا

دربار شاہ ولایت، امروہہ (یو.پی)

پڑھ کر بھی گویا پڑھا نہیں
من کا سندیسا پڑھا نہیں
آثارِ قدیمہ کیا دیکھے
جب وقت کا لکھا، پڑھا نہیں
دروازے کی رونق پڑھ لی
گھر کا سنّاٹا پڑھا نہیں
تھیں وہی تباہی کی خبریں
اخبار لہٰذا پڑھا نہیں
پتھّر پہ کھدی تحریر پڑھی
اور زندہ کُتبا پڑھا نہیں
جس خط میں نہ آیا ذِکر ترا
اُس خط کو دوبارا پڑھا نہیں
کچھ گھر میں کما کر لاتا ہے
اِس لیے یہ بچّا پڑھا نہیں
حالات پڑھے شاہوں کے فقط
کچھ حالِ رعایا پڑھا نہیں
درویشؔ کسی دربار میں بھی
کوئی ہم نے قصیدا پڑھا نہیں

ضمیر درویش

E-51-B، ریلوے کالونی (نارتھ) مرادآباد ۲۴۴۰۰۱

اشاریہ ایوانِ اُردو' دہلی

{مئی ۱۹۸۷ء سے اگست ۱۹۹۱ء تک}

محمد فاروق انصاری

۲۵۹، پیریار ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

اُردو میں اشاریہ سازی کی کوئی قدیم اور مستحکم روایت موجود نہیں ہے۔ حال کے برسوں میں جو چند اشاریے سامنے آتے ہیں ان کو دیکھ کر یہ کہنا آسان ہے کہ اُردو میں اشاریہ سازی کا دورِ طفلی سے عنفوانِ شباب کی جانب بتدریج سفر مرتب سائنٹیفک بنیادوں پر کم' تجربہ کر کے سیکھنے پر زیادہ انحصار کرتا ہے' افسوسناک بات یہ ہے کہ تجربہ کر کے سیکھنے کی رفتار مایوس کن حد تک دھیمی ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ مایوس کن رویہ نوجوان مصنفوں سے وابستہ ہے۔ اشاریہ سازی کے میدان میں نوجوان اہلِ قلم حضرات نے پیش رفت تو کی مگر نتائج بہت حوصلہ افزا نہیں رہے۔

'ایوانِ اُردو' کے اس اشاریے کو پیش کرتے ہوئے مجھے اپنی حد بندیوں کا احساس ہے' اپنی کم مائیگی پر نازاں ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں ہے اور اپنی خامیوں کی نشاندہی کرنے والے حضرات کا میں سپاس گزار رہوں گا' مگر معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ یہ سعی سائنٹفک بنیادوں پر کی گئی ہے اور یہ کوشش بھی برائے خاص کی ہے کہ تمام معلومات یک جا ہو جائے۔

اشاریے کی افادیت اور خامیوں کا بہتر فیصلہ تو قارئینِ ایوانِ اُردو اور دیگر اہلِ علم نیز پیش رو اشاریہ ساز حضرات صادر فرمائیں گے' مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں یہاں مختصراً اشاریے کے بعض اہم اور دلچسپ پہلوؤں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستان کی کسی بھی اُردو اکادمی کے ترجمان کو علمی اور عوامی ہر دو حلقوں میں بلکہ شاید کسی بھی حلقے میں مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ اسباب کی بحث مناسب نہیں مگر 'ایوانِ اُردو' کو دونوں حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت میسر آئی اور ہندستان ہی نہیں دُنیا کے مقتدر ترین اہلِ قلم حضرات کی تحریریں 'ایوانِ اُردو' کی زینت بنیں۔

اشاعتِ اول سے تادمِ تحریر پابندیِ وقت سے شائع ہونے والا اس اعتبار سے واحد جریدہ ہے کہ اس اثنا میں اپنی اشاعت شروع کرنے والے کسی دوسرے علمی جریدے کو اس پابندیِ اوقات کے ساتھ شائع ہونا میسر نہیں ہوا۔

مئی ۱۹۸۷ء سے اگست ۱۹۹۱ء تک ۵۲ شماروں پر مشتمل اشاریہ' تین خاص نمبروں خواجہ احمد عباس نمبر' مولانا ابوالکلام آزاد نمبر' جواہر لال نہرو نمبر کا احاطہ کرتا ہے۔ اس اشاریے کا اشاریہ یعنی کلید (آپ اپنی آسانی کے لیے تلخیص بھی کہہ سکتے ہیں) یوں ہے:

(۱) اشاریہ مصنف کے نام سے حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

(۲) مضامین کا خلاصہ (بہ قدرِ توفیق اور اپنی کم مائیگی کے باوجود) لکھا گیا ہے۔

(۳) مضامین سے متعلق اہم مکتوبات کو بھی مضمون کے ذکر کے ساتھ شامل کیا ہے' توصیفی خطوط کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ معترض حضرات کے خطوط یا ان مکتوبات کو اس فہرست میں جگہ دی گئی ہے جو موضوع سے متعلق کسی خامی کی نشاندہی کرتے ہیں' یا معلومات میں کچھ اضافہ کرتے ہیں۔

(۴) پہلے شمارے اور خصوصی نمبروں کے لیے موصول ہونے والے پیغامات بھی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں۔

(۵) "سرودِ رفتہ" کو بھی الگ سے مرتب کیا گیا ہے۔ موضوع کی افادیت اور اہمیت کا بھی اندازہ نہیں ہوتا مگر اُردو کی تاریخ کی تدوین میں آئندہ یہ کالم بہت معاون ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں شائع ہونے والے اعتراضات والے خطوط کو شامل نہیں کیا ہے۔

(۶) "آپ کی رائے" عنوان کے تحت شائع ہونے والے خطوط کو مکتوب نگار کے نام کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔

۷) "ہم طرح اشعار" کے لیے جس شاعر کے
ہرع کو طرح کے طور پر منتخب کیا جاتا تھا ان کی
رست بھی شعرا حضرات کے تخلص کے حروف
ی کے اعتبار سے شاملِ اشاریہ ہے۔

۸) "سرورق کے اندرونی صفحے کی تصویر
یے عنوانات" کو اشاریے میں شامل نہیں کیا
یا ہے۔

۹) "اردو خبرنامہ" کے تحت شامل مواد کو
مینار/کانفرنس/مذاکرات، لیکچر/گزارشات/
طالبات، رسمِ اجرا، تقریبات، وفیات و دیگر
تفرق عنوانات کے تحت یکجا کیا ہے۔ اور خبرنامہ
کے عنوانات کو شامل کیا گیا ہے مگر خبر کے
رکزی موضوع کے علاوہ باقی مواد قلم زد کر دیا
ہے۔

۱۰) مئی ۸۷ء سے اگست ۹۱ء تک
"ایوانِ اردو" میں تقریباً ہر صنفِ سخن پر تاریخی
عتبار سے اور متفرق علمی و ادبی موضوعات
پر مضامین شائع ہوتے ہیں، ان کی بعض
صوصیات یہ ہیں:

◄ سب سے زیادہ مضامین کی اشاعت
کا شرف "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" اور "پنڈت
جواہر لال نہرو نمبر" میں شامل حضرات کے مضامین
سے قطع نظر، پروفیسر عبدالمغنی کو حاصل ہوا
ہے ان کے چھ مضامین اس اثنا میں شائع
ہوتے ہیں۔

◄ ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک طویل مضمون
"دلّی کے آثارِ قدیمہ" گیارہ قسطوں میں
شائع ہونے والا طویل ترین مضمون ہے۔

◄ منظوم تخلیقی ادب میں جنابِ محمد علوی
کو سب سے زیادہ نظمیں شائع کرانے کا شرف
حاصل ہوا ہے مگر بلا عنوان نظمیں جنابِ
صابر فخرالدین کی شائع ہوتی ہیں۔ جناب
مصوّر سبزواری کی غزلوں کی اشاعت اور
دوہوں میں جنابِ بھگوان داس اعجاز اور
وقار واثقی (مشترکہ طور پر) سر فہرست ہیں۔

◄ اس اثنا میں صرف تین گیت شائع ہوئے
ہیں جن میں دو ظفر گورکھپوری صاحب اور ایک
مظہر امام صاحب کا ہے۔ ہائیکو نظمیں ایک بار
سے زیادہ شائع کرانے کا شرف جناب صابر زاہد
کو حاصل ہوا ہے۔ گنڈلیاں صرف بھگوان داس
اعجاز کی شائع ہوئی ہیں۔ اور حمد جنابِ انیس
اشفاق اور سید قدرت نقوی کی شائع ہوئی
ہیں۔

◄ سب سے زیادہ افسانے شفق کے
شائع ہوتے ہیں۔

◄ صنفِ انشائیہ میں یہ شرف جنابِ یوسف
ناظم کو، اور طنز و مزاح میں پرویز ید اللہ مہدی
اور محمد منظور کمال شریک ہیں۔

◄ پانچ خاکہ نگاروں جناب تنویر راج
نرائن راز، شہناز انجم، عابدہ بیگم اور ڈاکٹر
مجیب الاسلام کو ایک ایک خاکے کی اشاعت
کا شرف حاصل ہوا ہے۔

◄ گوشۂ رفتگاں محترمہ صالحہ عابد حسین،
فکر تونسوی اور خوشتر گرامی پر مشتمل ہے۔

◄ صنفِ ڈراما میں پاندھی ننکانوی کو
دو ڈراموں کی اشاعت کا شرف حاصل ہے۔

◄ دو انٹرویو جنابِ اطہر فاروقی اور
جناب گوربچن چندن کے لیے ہوئے شائع
ہوتے ہیں۔

◄ رپورتاژ شیخ رحمٰن آکولوی کا شائع
ہوا ہے۔

◄ سفرنامہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا
شائع ہوا ہے۔

◄ سب سے زیادہ تبصرے شائع کرانے کا
شرف جنابِ اطہر فاروقی کو حاصل ہوا ہے
ان کے ۳۷ تبصرے اس دوران شائع ہوئے
ہیں۔ ان میں سے ۲۷ تبصرے تو جولائی ۸۷ء
سے جولائی ۸۹ء تک شائع ہو چکے تھے۔

◄ یہ فخر مزید بھی صرف اطہر فاروقی صاحب
کو حاصل ہوا ہے کہ ان کے تبصرے، تحقیقی
مضامین، غزل، افسانہ، انٹرویو اور ترجمہ
ہی شائع نہیں ہوئے بلکہ مکتوبات کی فہرست
میں بھی ان کا نام درج ہے۔

●

حرفِ آغاز

سید شریف الحسن نقوی:

○ رسالے کا ابتدائیہ، ترتیبِ مضامین کے متعلق۔ مئی ۸۷ء، ص ۴۔
○ اردو کی ترویج اور ترقی۔ جون ۸۷ء، ص ۴۔
○ وفیات، ولی شاہ جہاں پوری، قمر مراد آبادی، مہدی نظمی اور خواجہ احمد عباس۔ جولائی ۸۷ء، ص ۴۔
○ ایک اردو تنظیم، تبلی (کرناٹک) کی گزارشات۔ اگست ۸۷ء، ص ۴۔
○ آزادی کی سالگرہ، ماضی، اور مستقبل۔ ستمبر ۸۷ء، ص ۴۔
○ قلمکاروں سے خطاب۔ اکتوبر ۸۷ء، ص ۴۔
○ اردو زبان سے متعلق۔ نومبر ۸۷ء، ص ۴۔
○ خواجہ احمد عباس نمبر سے متعلق۔ دسمبر ۸۷ء، ص ۴۔

- اردو تعلیم اور عباس نمبر سے متعلق۔ جنوری ۸۸ء، ص ۴۔
- ادب کی سماجی معنویت و اہمیت۔ فروری ۸۸ء، ص ۴۔
- غالب سمینار کے موقعے پر جناب شنکر دیال شرما کی تقریر۔ مارچ ۸۸ء، ص ۴۔
- غزل کا ارتقائی جائزہ، اپریل ۸۸، ص ۴۔
- روس کے سماجی ڈھانچے سے متعلق روسی ادیب اور مصور اوگینی بریژیکوف کے تاثرات۔ مئی ۸۸، ص ۴۔
- ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی: دلی انتظامیہ کے جلسے کی روداد۔ جون ۸۸ء، ص ۴۔
- اُردو تعلیم ضروری ہے، کیوں اور کیسے۔ اگست ۸۸ء، ص ۴۔
- ۱۵ اگست اور ملک کے مسائل، ستمبر ۸۸ء، ص ۴۔
- اُردو تحریک اور مختلف انجمنیں۔ اکتوبر ۸۸، ص ۴۔
- مولانا آزاد نمبر کے متعلق۔ نومبر ۸۸ء، ص ۴۔
- مولانا آزاد نمبر کی پیش کش اور ترتیبِ مضامین۔ دسمبر ۸۸ء (مولانا آزاد نمبر) ص ۵۔
- ۲۶ جنوری اور ملک کی صورتِ حال۔ جنوری ۸۹، ص ۴۔
- ہندو پاک تعلقات، مولانا آزاد نمبر۔ فروری ۸۹، ص ۴۔
- مولانا آزاد سیمنار میں بشمبر ناتھ پانڈے کے تاثرات۔ مارچ ۸۹، ص ۴۔
- اکادمی پر الزامات اور ان کی تردید۔ اپریل ۸۹ء، ص ۴۔
- لسانی تعصب کا شکار اُردو زبان۔ مئی ۸۹، ص ۴۔
- اُردو غزل کی افادیت اور مقبولیت۔ جون ۸۹ء، ص ۴۔
- نثر نگاروں سے گزارش، اُردو کی تمام علوم و فنون سے وابستگی کی ضرورت۔ جولائی ۸۹ء، ص ۴۔
- جدوجہد آزادی، کانگریس کا کردار، موجودہ عہد میں عوام کی ذمے داریاں۔ اگست ۸۹ء، ص ۴۔
- اُردو کی زبوں حالی، نہرو اور اندرا گاندھی کے عملی اقدامات، اُردو کی ترویج و ترقی، ہندی دانشوروں کا اُردو دشمنی کا رویہ۔ ستمبر ۸۹ء ص ۴۔
- بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ، اتر پردیش میں اُردو کو آئینی قانونی حیثیت دینے پر مختصر نوٹ۔ اکتوبر ۸۹ء، ص ۴۔
- اتر پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ۔ نومبر ۸۹، ص ۴۔
- پنڈت جواہر لال نہرو کی قومی اور بین الاقوامی شخصیت۔ دسمبر ۸۹ء (نہرو نمبر)، ص ۵۔
- اُردو اور ہندی کی آپس میں مماثلت کے باوجود اُردو تعصب کا شکار، پنڈت نہرو کے عملی اقدامات، ریاستی اور ملکی انجمنوں کی اُردو تعلیم کے تئیں دلچسپی، اُردو کی زبوں حالی کے اسباب اور ان کا حل۔ جنوری ۹۰ء، ص ۴۔
- جمہوریت کے آداب، عدم تشدد کی ضرورت، جشنِ جمہوریت پر مبارکباد۔ فروری ۹۰ء، ص ۴۔
- اُردو کی علوم و فنون سے وابستگی کی اہمیت و ضرورت۔ مارچ ۹۰ء، ص ۴۔
- گجرال کمیٹی سفارشات کا حکومتِ ہند کی طرف سے قبول کیا جانا۔ اپریل ۹۰ء، ص ۴۔
- ڈاکٹر امبیڈکر کی ۹۹ ویں سالگرہ اور ملک کا جمہوری آئین۔ مئی ۹۰ء، ص ۴۔
- مرکزی وزیر داخلہ اندر کمار گجرال کی اکادمی کے دفتر میں استقبالیہ تقریب، حکومت کی قائم کردہ نئی کمیٹی۔ جون ۹۰ء، ص ۴۔
- اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کا انگریزی کی جگہ ملکی زبان کو جگہ دینے پر زور، جنوبی ہندوستان کی زبانیں، اُردو کی حق تلفی۔ جولائی ۹۰ء، ص ۴۔
- جشنِ آزادی کی ۴۳ ویں سالگرہ، فرقہ وارانہ جھگڑے اور سیاستِ اقتدار کی پشت پناہی، تشدد پسندی اور دہشت گردی کے منفی نتائج۔ اگست ۹۰ء، ص ۴۔
- بہار اُردو اکادمی کے رسالے "زبان و ادب" کے حوالے سے بہار کے اخبارات و رسائل کا غلط اُردو زبان استعمال کرنے کا انکشاف، زبان و بیان، گرامر اور املا وغیرہ کی غلطیاں، تعلیمی معیار کی پستی۔ ستمبر ۹۰ء، ص ۴۔
- دہلی سے نکلنے والے معروف اخبار میں استعمال شدہ غلط زبان کی نشاندہی، عام اُردو محاورے کی خلاف ورزی کی نشاندہی۔ اکتوبر ۹۰ء، ص ۴۔
- ملک کی موجودہ ہنگامی صورتِ حال اور شعرا ادبا کی ذمے داری۔ نومبر ۹۰ء، ص ۴۔
- مولانا آزاد کی تحریروں سے چند اقتباسات کے حوالوں سے قومی اتحاد اور یک جہتی کا پیغام۔ دسمبر ۹۰ء، ص ۴۔
- ہندوستان کی آپسی میل جول اور تہذیبی روایت کی تاریخ، صوفیوں اور سنتوں کا حصہ،

...ردہ صورتِ حال کا لمحۂ فکر۔ جنوری ۹۱ء، ص ۴۔

○ اُردو اکادمیوں کے اغراض و مقاصد ...کارکردگی، بالخصوص اُردو اکادمی، دہلی۔ ...رری ۹۱ء، ص ۴۔

○ سوویت روس کی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں ...روسی دانشور ڈاکٹر اولیک جی ایسیفروف کا ...ہارِ خیال۔ مارچ ۹۱ء، ص ۴۔

...خمور سعیدی:

○ اُردو کے مسائل پر ایک جلسہ۔ جولائی ...۸ء، ص ۴۔

○ اُردو اکادمی، دہلی کے نئے سیکریٹری ...وفیسر اشتیاق عابدی کا مختلف کمیٹیوں کے ...وگرام (۹۲-۱۹۹۱ء) کے لیے عمومی خاکہ۔ ...لائی ۹۱ء، ص ۴۔

○ ناروے اور ڈنمارک کے دورے کے ...روہاں کی تقریبات اور واقعات کا بیان۔ ...ت ۹۱ء، ص ۴۔

●

...غامات

○ انور علی دہلوی، ممبر اُردو اکادمی، دہلی۔ ...نگریزی) مئی ۸۷ء، ص ۲۳۔

○ ایچ۔ ایل۔ کپور، لیفٹننٹ گورنر، دہلی۔ ...ی ۸۷ء، ص ۱۰۔

○ ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت، مرکزی وزیر ...ے پارلیمانی امور۔ مئی ۸۷ء، ص ۸۔

○ بنسی لال چوہان، ایگزیکیٹو کونسلر (صحت) ...لی انتظامیہ دہلی، مئی ۸۷ء، ص ۱۷۔

○ پرشوتم گوئل، چیئرمین میٹرو پولیٹن ...نسل، دہلی (انگریزی) مئی ۸۷ء، ص ۱۲۔

○ پریم سنگھ، ایگزیکیٹو کونسلر، دلی انتظامیہ دہلی مئی ۸۷ء، ص ۱۶۔

○ تاجدار بابر، نائب چیئرمین میٹرو پولیٹن کونسل دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۱۳۔

○ ترلوچن سنگھ، ڈپٹی پریس سیکریٹری صدر جمہوریہ ہند (انگریزی) مئی ۸۷ء، ص ۷۔

○ کلانند بھارتیہ، ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیمات) دلی انتظامیہ دہلی (ہندی) مئی ۸۷ء، ص ۱۵۔

○ جگ پرویش چندر، چیف ایگزیکیٹو کانسلر دلی انتظامیہ، دہلی (انگریزی) مئی ۸۷ء، ص ۱۴۔

○ حبیبہ قدوائی، ممبر اُردو اکادمی، دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۴۔

○ حکیم عبدالحمید، دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۰۔

○ سید حسین علی جعفری، ممبر اُردو اکادمی دہلی (نظم)۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۵۔

○ سید سبط رضی، وزیر تعلیم و مسلم اوقاف، اُترپردیش۔ مئی ۸۷ء، ص ۱۱۔

○ (ڈاکٹر) صلاح الدین، شعبۂ اُردو، ذاکر حسین کالج، دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۶۔

○ ظہیر احمد صدیقی، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۲۔

○ کے۔ کے۔ ماتھر، چیف سیکریٹری، دلی انتظامیہ دہلی ۸۷ء، ص ۱۹۔

○ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۱۔

○ مشکور علی صدیقی، ممبر اُردو اکادمی، دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۲۷۔

○ مفتی محمد سعید، وزیر (انگریزی) مئی ۸۷ء، ص ۹۔

○ مہندر سنگھ ساتھی، میئر آف دہلی۔ مئی ۸۷ء، ص ۱۸۔

○ شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریہ ہند۔ دسمبر ۸۸ء (آزاد نمبر) ص ۶۔

○ رمیش بھنڈاری، لیفٹننٹ گورنر، دہلی۔ (انگریزی) دسمبر ۸۸ء (آزاد نمبر) ص ۷۔

○ جگ پرویش چندر، چیف ایگزیکیٹو کانسلر دلی انتظامیہ، دہلی۔ دسمبر ۸۸ء (آزاد نمبر) ص ۸۔

○ کلانند بھارتیہ، ایگزیکیٹو کانسلر (تعلیمات) دلی انتظامیہ دہلی۔ دسمبر ۸۸ء (آزاد نمبر) ص ۹۔

○ شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریہ ہند۔ دسمبر ۸۹ء (نہرو نمبر) ص ۷۔

○ رمیش بھنڈاری، لیفٹننٹ گورنر دہلی دسمبر ۸۹ء (نہرو نمبر) ص ۸۔

○ جگ پرویش چندر، چیف ایگزیکیٹو کانسلر، دلی انتظامیہ دہلی (انگریزی) دسمبر ۸۹ء (نہرو نمبر) ص ۹۔

○ کلانند بھارتیہ، ایگزیکیٹو کانسلر (تعلیمات) دلی انتظامیہ دہلی۔ دسمبر ۸۹ء (نہرو نمبر) ص ۱۰۔

(باقی آئندہ)

غیر طلبیدہ نگارشات

جن کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ساتھ نہ ہو، ناقابلِ اشاعت سمجھی جانے پر ضائع کردی جاتی ہیں۔

——— ادارہ

سیّد شکیل دسنوی

ہر شخص بے رُخی سے جو ٹھوکر لگائے گا
تو دل کے آئینے کو کہاں تک بچائے گا

آنکھوں میں موجزن جو سمندر تھا، پی گیا
ہونٹوں کی تشنگی کو کہاں تک چھپائے گا

حالات کے حصار میں جب تک رہے گا قید
آسیب آرزو کا ہمیشہ ستائے گا

سایہ ہے سر پہ دھوپ کا اور یہ غبارِ کرب
یادوں کا اک شجر ہے کہاں تک بچائے گا

احساس کی صلیب، یہ تنہائیوں کا بوجھ
کاندھوں پہ بے بسی کے وہ کب تک اٹھائے گا

حسن منزل، مرآڈیا بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اڑیسہ)

دُور تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں
رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں

سوچنا کس کو راس آیا ہے
دھوپ سے کب چراغ جلتے ہیں

اُجلے موسم کا انتظار کرو
پتّھروں کے بھی دل پگھلتے ہیں

اپنی دُنیا تلاش کرتے ہوئے
تیرے کوچے میں آ نکلتے ہیں

اشک بھی بدگماں پرندے ہیں
بے سبب گھر سے کم نکلتے ہیں

رسول ساقی

شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو.پی)

نفیس نقی

متاعِ لفظ و معنی کیا لٹائیں
کوئی قیمت نہیں عرضِ ہنر کی

لہو کے قطرۂ رنگیں سے ہم نے
نگارش کی ہے عنوانِ سحر کی

دُھواں سا اُٹھ رہا ہے بام و در سے
عجب حالت ہے اب دل کے نگر کی

اُڑانیں کیا بھرے گا وہ پرندہ
نہ ہو کچھ فکر جس کو بال و پر کی

کسی کے نام نقدِ جاں لُٹا کر
شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

راج بازار، سرونج ۴۶۴۲۲۸ (ایم.پی)

بچّہ

جلال آلِ احمد

خالدہ حسینی

معرفت قاسمی دواخانہ، ۸۰، نوتولا سٹریٹ، کلکتہ ۳، ۰۰۰،۷

میں اور کیا کر سکتی تھی؟

میرا شوہر مجھے اپنے بچے کے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ بچہ پہلے شوہر سے تھا۔ پہلے شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور اس نے بچے کو بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا۔

میری جگہ اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو وہ کیا کرتی؟

آخر مجھے بھی جینا ہے۔ اگر یہ شوہر بھی مجھے طلاق دے دے تو میں کیا کروں گی؟ اس لیے میں مجبور تھی کہ اس "بچے" سے چھٹکارا پاؤں۔ مجھ جیسی گھریلو عورت کی سمجھ میں اس کے سوا اور کیا آسکتا تھا؟ مجھے نہ جگہیں معلوم تھیں، نہ راستے! میری سمجھ میں اور کوئی بات نہیں آرہی تھی.....

ہاں، میں جانتی ہوں کہ اسے کسی یتیم خانے میں چھوڑا جاسکتا تھا۔ کسی لاولد میاں بیوی کو دیا جاسکتا تھا!

لیکن وہ لوگ میرے بچے کو کس طرح یوں ہی قبول کرلیتے؟ کیا بھروسہ تھا کہ وہ میری بے عزتی نہ کرتے؟ مجھے اور میرے بچے کو نہ جانے کیا کیا کہتے۔ اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کام کا انجام ایسا ہو۔

اس دن شام کو جب میں اپنا یہ کام ختم کرکے واپس آئی تو پوری کہانی ماں اور پڑوسیوں کو سنائی۔

ان میں سے ایک نے کہا "اچھا ہوتا اگر تو بچے کو کسی یتیم خانے یا بچوں کے سرکاری گھر میں چھوڑ آتی"۔ پھر اس نے کئی جگہوں کے نام بتائے، جن میں سے اب مجھے ایک بھی یاد نہیں، لیکن اس وقت میری ماں نے جواب دیا...

"کیا تو سوچتی ہے کہ وہ لوگ بچے کو یوں ہی آسانی سے لے لیتے ہیں؟"

میں پڑوسن کی بات پر سوچنے لگی تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "اچھا ہوا تو نہیں گئی، کیونکہ وہ کام آسانی سے نہ ہوتا"۔ پھر میں نے ماں سے کہا "کاش! میں نے ایسا ہی کیا ہوتا" لیکن... مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی... بھرپور یقین تھا کہ وہ لوگ اسے آسانی سے قبول نہ کریں گے۔ لیکن اس عورت کی گفتگو سے میں بے چین ہوگئی اور رو پڑی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روئی، یہی سوچ کر کہ وہ کتنی بری بات تھی۔

ایک عورت کو آہستہ سے کہتے سنا، "رو بھی رہی ہے اور شرم بھی نہیں آتی!"

آخیر میں میری ماں نے ہی مجھے تسلی دی، بہت تسلی دی۔ دراصل اس کی بات بھی صحیح تھی کہ میری جوانی کی ابھی ابتدائی منزل ہے، میں ایک بچے کے واسطے اتنی پریشان کیوں رہوں۔ خاص کر جب کہ میرا شوہر مجھے اس بچے کے ساتھ رکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔

ٹھیک ہے وہ میرا پہلا بچہ تھا اور مجھے ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ویسے مجھے کوئی پریشانی یا تکلیف نہیں تھی کہ میں جاتی اور اس طرح کا کام کرتی۔ تکلیف تھی تو میرے اس شوہر کو تھی، جو بار بار اس کام کے لیے زور ڈالتا رہا۔

لیکن اس کی بات بھی ٹھیک تھی۔ وہ کیسے ایک دوسرے گدھے کے بچے کو اپنے دسترخوان پر برداشت کرتا! میں جب بھی سوچتی تو خود کو اسی کی حمایت پر آمادہ پاتی۔ ٹھیک ہی تو ہے، میں اس "گدھے کے بچے" کو اس شوہر کے بچوں سے زیادہ کیسے پیار کرسکتی تھی؟ اور وہ میرے لیے ایک فالتو بوجھ کے سوا اور کیا بن سکتا تھا!... وہ سچ کہتا تھا کہ وہ میرے بچے کو... میرے نہیں، بلکہ ایک گدھے کے بچے کو (بقول اس کے) اپنے دسترخوان پر کیوں دیکھے؟

پچھلے دو دنوں میں بھی جب میں اس کے گھر گئی تو ساری بات صرف اس بچے کے بارے میں ہوتی رہی تھی۔ آخری رات ہم نے اس بارے میں کافی دیر تک گفتگو کی تھی۔

گفتگو کیا' اصل میں صرف وہی بول رہا تھا اور میں سُن رہی تھی' آخر میں میں نے اس سے کہا تمہیں کچھ بتاؤ ' میں کیا کروں ؟" شوہر نے کچھ نہیں کہا' تھوڑی سی خاموشی کے بعد پھر بولا" میں نہیں جانتا تمہیں کیا کرنا ہے . . . جس طرح بھی ہو میں اس گدھے کے بچے کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتا" اس نے مجھے میری اُلجھن کا کوئی حل یا کوئی علاج نہیں بتایا ' بلکہ اس رات میرے ساتھ سویا بھی نہیں. شاید مجھ سے رُوٹھ گیا تھا. میں جانتی ہوں وہ مجھ پر دباؤ ڈال کر کہنا چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح جتنی جلدی ہو سکے میں اسے ٹھکانے لگا دوں. صبح گھر سے جاتے وقت وہ کہہ کر گیا کہ شام کو جب گھر واپس آؤں تو اس بچے کو یہاں نہ دیکھوں.

میں اُسی وقت اپنا کام سمجھ چکی تھی اب میں اس سلسلے میں جتنا بھی سوچتی ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کام کے لیے میرا دل کیسے تیار ہو گیا. لیکن اُس وقت میں مجبور تھی.

گھر سے شوہر کے نکلتے ہی میں نے سر پر چادر ڈالی' بچے کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل پڑی.

میرے بچے کی عمر تقریباً تین سال تھی. وہ خود سے اچھی طرح چل سکتا تھا. اس کا قصور یہی تھا کہ اُس نے اپنی عمر کے لگ بھگ تین سال گزار لیے تھے. یہی سب سے بڑی غلطی اُس نے کی تھی. اس کی وہ ساری پریشانیاں ختم ہو چکی تھیں جنہیں ہر بچہ بچپن میں سہتا ہے. راتوں کو اس کا رونا اور جاگنا بند ہو چکا تھا. آرام کے دن اسے ابھی ابھی نصیب ہوئے تھے لیکن اب میں بے بس تھی. اسے انجانی راہوں پر تنہا چھوڑنے کے لیے ـــــ بس اسٹینڈ تک میں اس کے ساتھ گئی.

جانے سے پہلے میں نے ایک چھوٹا نیلے رنگ کا کوٹ پتلون' جو پہلے شوہر نے اس کے لیے خریدا تھا پہنایا. جوتے پہنائے. اس کے بالوں میں کنگھا کیا' واقعی وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا. جب میں نئے کپڑے پہنا رہی تھی تو شاید وہ سوچ رہا ہوگا کہ آخر آج امی نئے کپڑے کیوں پہنا رہی ہیں. لیکن میں ان نئے کپڑوں کا کیا کرتی؟ ہاں . . . جب میں دوبارہ بچے کو جنم دوں گی تو اس شوہر کو ہی نئے کپڑے خریدنے ہوں گے.

میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا' تاکہ تیز چلنے کے لیے اسے جھڑکنے کی ضرورت نہ پڑے. میں اسے اپنے ساتھ گلی میں لے گئی. دو تین جگہوں پر اس نے چاہا کہ میں اسے لالی پاپ خرید دوں. میں نے کہا" پہلے بس میں سوار ہو جائیں تب تجھے لالی پاپ بھی خرید دوں گی" مجھے یاد ہے کہ اس دن وہ اور دنوں کی طرح مسلسل کچھ نہ کچھ سوال کرتا رہا.

ایک جگہ نالی کے کھڈ میں گھوڑے کا پیر دھنس گیا اور لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے. وہ بھی ضد کرنے لگا کہ میں اسے بھی اوپر اُٹھا کر دکھاؤں کہ کیا ماجرا ہے' میں نے اسے اُوپر اُٹھایا. اس نے اس گھوڑے کو دیکھا' جس کی ٹانگ میں چوٹ لگی تھی. جب میں نے اسے نیچے اُتارا تو اس نے کہا" امی اُچھ کے ہاتھ میں لد دئی ہے." میں نے کہا" ہاں بیٹا اس نے اپنی امی کا کہنا نہیں مانا تھا' اس لیے اسے چوٹ لگی"

اس طرح ہم آہستہ آہستہ بس اسٹینڈ تک پہنچے. صبح کو بسوں' موٹر کاروں کی بہت بھیڑ تھی. جس کی وجہ سے مجھے بس ملنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا. بچے نے بھی بہت تنگ کیا. وہ اس قدر سوال کرتا تھا کہ میرے ضبط کی طاقت جواب دینے لگتی. اس کے سوالوں سے میں بیزار ہو رہی تھی. اس نے دو تین بار کہا" امی اب چل چپا ہو دا؟" بچھ تو نتیں آئی. تلو چل لالی پاپ تھریدیں" مجھے کہنا پڑتا" بس آنے پر ہی خریدیں گے"

آخر کار میں نے سات نمبر بس پکڑی. میدانِ شاہ کے اسٹاپ پر ہم اُترے. بچہ پھر کچھ کہہ رہا تھا. مجھے یاد ہے' اس نے ایک بار پوچھا" امی ہم تاں دا لئے ہیں؟" میں نے پریشانی میں کہہ دیا" ہم پاپا کے پاس جا رہے ہیں" اس نے بے چینی سے پوچھا" تون چھے پاپا تے پاچھ؟" میں بالکل بے قابو ہو گئی. میں نے زور سے کہا" بیٹا تو کتنا زیادہ بولتا ہے. اگر تو اس طرح بولے گا تو میں تجھے لالی پاپ نہیں دلواؤں گی"

لیکن میرا دل اب اس بات پر تڑپ رہا ہے ـــــ اس طرح کی یادیں انسان کو بہت زیادہ تڑپاتی ہیں. آخر میں نے کیوں بچے کا دل اس آخری وقت میں توڑ دیا جب کہ گھر سے نکلتے وقت میں نے کام پورا ہو جانے تک اُسے کچھ بھی نہ کہنے کا اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا؟

اس وقت میرا ننھا چپ ہو گیا. تھوڑی دیر بعد وہ کنڈکٹر سے بولنے لگا' جو اُسے مُنہ چڑھا رہا تھا. میرا خیال دونوں ہی کی طرف نہیں تھا. بچہ قہقہے کے ساتھ ہنس رہا تھا. میدانِ شاہ آنے پر میں نے کہا" اسٹاپ؟" میں اُسے لیے ہوئے بس سے اُتری' وہ اس وقت بھی ہنس رہا تھا. میدان میں بہت بھیڑ تھی. مجھے اپنا

کام کرتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر پیدل چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بھیڑ کچھ کم ہوئی۔ میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے آ کر جیب سے دس ریال کا سکہ نکال کر اسے دیا۔ بچہ حیران تھا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ پیسے پکڑنا بھی نہیں جانتا تھا۔ . . میں اس کی اس حالت کو کیسے بیان کروں؟

سڑک کے اس پار کدو کے بیج بیچنے والا آواز لگا رہا تھا۔ میں نے انگلی کے اشارے سے بچے کو اسے دکھایا اور کہا "یہ لے پیسے . . . جا لالی پاپ خرید لے۔ دیکھوں کیا تو اپنے آپ جا کر خرید سکتا ہے؟" بچہ کچھ دیر تک سکے کو دیکھتا رہا۔ پھر مجھے دیکھ کر کہنے لگا "امی آ، تو بھی تل۔" بچہ پھر سے سکے کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ الجھن میں تھا اور پھر وہ ابھی خریداری بھی کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز عجیب تھا۔ میں نے اس کو ابھی چیزیں خریدنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ شاید اب میں اپنا ارادہ بدل دوں گی۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میں وہاں کیسے کھڑی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر بیج بیچنے والے کی طرف اشارہ کر کے کہا "جا بیٹا یہ پیسے اسے دے دینا کہنا بیج دے دو۔ جا خدا تیرا محافظ ہو۔"

میرے ننھے بچے نے بھی اس طرف دیکھا جیسے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر رونے لگا، اور بولا "امی ہیں بید نئیں تجھ مجھ ٹونڈا۔"

میں بے بس ہوتی جا رہی تھی۔ اگر وہ تھوڑی دیر تک رُکا رہتا تو پھر شاید میں اپنا ارادہ بدل لیتی لیکن اس نے رونا بند کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ میرا ضبط ختم ہو چکا تھا۔ میں اس پر جھلائی "کشمش بھی ہے اس کے پاس، اس کے پاس جا . . . جو دل چاہے خرید لے . . . لے . . . جا بھی اب" اسے میں نے فٹ پاتھ سے اٹھا کر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے اور اس کی ہمت بڑھانے کے لیے کہتی رہی "جا بیٹا جا، دیر ہو رہی ہے۔"

سڑک پر بھیڑ نہیں تھی۔ بچہ چل دیا لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد ہی واپس آ گیا۔ بولا۔ "اچھے پاس تجھ مجھ تھیں نئیں" میں نے کہا۔ "ہاں بیٹا، جا کر کہہ دے کہ دس ریال کی کشمش دے دیں۔"

اب وہ پھر چل پڑا۔ سڑک کے بیچ تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک کار نے ہارن بجایا۔ میں ڈر سے کانپ گئی۔ بغیر سوچے سمجھے دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اسے لے کر فٹ پاتھ کے کنارے آ گئی۔ میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ گھبراہٹ کی وجہ سے سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ بچے نے کہا "امی یہ کیا ہوا؟" میں نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں بیٹا، لوگ جلدی جلدی سڑک پار کرتے ہیں اور تو آہستہ آہستہ جا رہا تھا قریب تھا کہ کار کے نیچے آ جاتا۔" میں یہ سب کہتے کہتے روہانسی ہو گئی۔ بچہ جو ابھی میری گود میں تھا بولا۔ "امی مجھے اُتا لو، اچھا بال تیدی چھے داؤ ںدا۔" شاید بچے نے یہ نہ کہا ہوتا۔ تو میں بھول گئی تھی کہ میں وہاں کس لیے کھڑی ہوں۔ لیکن اس بات نے پھر مجھے یاد دلایا کہ میں یہاں کس لیے آئی ہوں۔ یہ سب سوچ کر شوہر کی دھمکی یاد آ گئی۔ اگر میں اس سے کنارہ کش نہ ہوئی تو میری زندگی دوبھر ہو جائے گی۔

میں نے اس کو چوما اور گود سے اُتارتے ہوئے اس کے کان میں کہا "بیٹا جلدی سے جا، کار آ رہی ہے۔"

سڑک پھر خالی تھی۔ اس بار بچہ تیزی سے گیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پیر جلدی جلدی اٹھاتا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اس کے پیر آپس میں الجھ نہ جائیں اور وہ گر نہ پڑے لیکن وہ سڑک کے اس پار پہنچ ہی گیا۔ پھر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی چادر کو سمیٹ کر بغل میں دبا لیا اور تیزی سے وہاں سے چل پڑی۔ لیکن جیسے ہی بچے نے گھوم کر میری طرف دیکھا، میں اپنی جگہ پر برف کی طرح جم کر رہ گئی۔ دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھ جائے کہ میں اسے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اس وقت میری حالت ایک چور جیسی تھی جسے چوری کرتے وقت پکڑ لیا گیا ہو۔ میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی میرے ہاتھ آپس میں بندھے ہوئے بغلوں سے ہی چپکے رہے جیسے ایک بار جب میں اپنے شوہر کی جیب کی تلاشی چپ چاپ لے رہی تھی کہ اچانک میرے شوہر دروازے سے اندر آ گئے تھے۔ اور میں بالکل پتھر کے بت کی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی میری حالت وہی تھی۔ میں سر سے پیر تک پسینے سے شرابور ہو گئی تھی۔ میں نے سر نیچے جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد بہت ہمت کر کے سر اوپر اٹھایا تو بچہ چیز بیچنے والے کے پاس قریب قریب پہنچ گیا تھا۔ اب میرا کام انجام پا چکا تھا۔ بچہ حفاظت کے ساتھ سڑک کے اس پار پہنچ گیا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرا بچہ تھا ہی نہیں۔

میں نے بچے کو آخری بار دیکھا بالکل اس طرح کہ اب میں کسی دوسرے انسان کے بچے کو دیکھ رہی ہوں۔ جیسا ایک نئے بچے کو دیکھ کر خوشی

ہوتی ہے، مجھے ویسا ہی محسوس ہوا۔
میں جھٹ فٹ پاتھ کی بھیڑ میں چھپ گئی، لیکن ایک عجیب قسم کا خوف مجھ پر طاری ہو گیا۔ ٹانگیں ایسے چُور ہو رہی تھیں جیسے کسی نے انھیں توڑ دیا ہو۔ ڈر سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں تیز تیز چلنے لگی، اس خیال سے کہ دو تین گلیاں پار کر کے بھاگ چلوں۔ اسی دُھن میں میں ابھی پہلی گلی کے نکڑ پر پہنچی تھی کہ اچانک ایک کار نے آکر میرے پیچھے بریک لگائے اور مجھے ایسا لگا کہ شاید وہ میرا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ ان میں چھلا ہے کا سپاہی ہے، جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے ٹیکسی میں میرے پیچھے آیا ہے اور اب وہ ٹیکسی سے اترا ہوگا اور اب مجھے ضرور پکڑے گا۔ پتہ نہیں میں نے کیسے سر گھما کر پیچھے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ مسافر تھے۔ وہ ٹیکسی سے اترے تھے اور ٹیکسی کا کرایہ دے کر جا رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک نیا خیال یکایک میرے ذہن میں آیا۔ میں اس سے پہلے کہ کچھ اور سوچوں یا دیکھوں، میں ٹیکسی میں جا بیٹھی اور دروازے کو دھڑام سے بند کر دیا۔ جس پر ڈرائیور ہڑبڑا اٹھا۔ لیکن اس نے ٹیکسی آگے بڑھائی۔ میری ٹانگ کی چادر ٹیکسی کے دروازے میں پھنسی ہوئی تھی۔ لیکن جب ٹیکسی کچھ دُور پہنچ گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب سب ٹھیک ہے تو میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، پھنسی ہوئی چادر اس میں سے نکالی، پھر دروازہ بند کر دیا اور سیٹ پر پیچھے ہو کر آرام سے بیٹھ گئی۔

لیکن میں اپنے شوہر سے اُس رات ٹیکسی پر خرچ کیے ہوئے روپے واپس نہیں لے پائی۔

(فارسی سے)

واقعاتِ دارالحکومت دہلی

ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے اور شاہد احمد دہلوی کے والد مولوی بشیر الدین کی یہ کتاب جو شاہانِ دہلی کی مختصر تاریخ اور دہلی کے آثارِ قدیمہ کے مفصل بیان پر مشتمل ہے، سر سیّد احمد خاں کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کے لگ بھگ پچھتر سال بعد لکھی گئی۔ یہ "آثار الصنادید" کا تکملہ بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی۔ تکملہ اس طور پر کہ بعض حالات و واقعات جن کا بیان "آثار الصنادید" میں تشنہ رہ گیا تھا "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" میں وہ پوری تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں اور اضافہ اس معنی میں کہ جن آثارِ قدیمہ تک سر سید احمد خاں کی رسائی نہیں ہوئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے قائم کردہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی کوششوں سے دریافت ہوتے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے ان سب کے حالات و کوائف اس کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔

یہ کتاب دلّی کی تاریخ بھی بیان کرتی ہے، اس کا جغرافیہ بھی۔ یہ دہلوی تہذیب کا بھی مرقع ہے اور یہاں کے قدیم و جدید تمدنی آثار کا بھی۔ مولوی بشیر الدین احمد نے انگریزی دورِ حکومت میں تعمیر شدہ اہم عمارتوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ دہلی کے اہم مقامات کے نقشے اور عمارتوں کی قلمی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ میر تقی میر کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو دلّی کے کوچوں کی طرح اس کتاب کو بھی اوراقِ مصوّر کہا جا سکتا ہے۔

کتاب تین جلدوں میں ہے۔

مصنف : مولوی بشیر الدین احمد   اشاعتِ اوّل : ۱۹۱۹ء   اکادمی ایڈیشن : ۱۹۸۹ء

ضخامت : جلد اوّل ۔ جلد دوم جلد سوم مع تصاویر : ۲۳۵۴   قیمت : مکمل سیٹ (تینوں جلدیں) چار سو روپے (۴۰۰)

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

نئی مطبوعات

فصیل
مرتبین : ڈاکٹر لئیق خدیجہ اور نجم الثاقب
قیمت : ۷ روپے
صفحات : ۶۷
ملنے کا پتہ : کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

کتابچہ زیرِ نظر ان مقالات پر مشتمل ہے جو کرناٹک اُردو اکادمی کے سمینار میں ایک اہم موضوع "جنوبی ہند میں اُردو کے مسائل" پر بیدر میں پڑھے گئے۔

خطبۂ استقبالیہ میں صدر اکادمی نے کام کا تجزیہ کیا ہے۔ اشاعتی گرانٹ۔ تخلیقات کی اشاعت کا اہتمام۔ سمینار۔ مشاعرے۔ کتب خانوں کو امداد۔ انعامات۔ توصیفی سندیں دینے کا ذکر ہوا ہے۔ اُردو دانشوروں کے کام کا بھی احاطہ ہوا ہے۔ آخر میں وہی بات جو ۴۰ سال سے سُنی جارہی ہے اور غالباً مسلسل سُنی جاتی رہے گی 'کہ اردو کا کبھی بول بالا تھا' اب کیوں نہیں!'

اردو کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو اسے ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ زبان بتایا جاتا ہے۔ صحیح بھی ہے۔ ہندوؤں نے حمد۔ نعت مناجات۔ منقبت۔ سلام۔ مرثیے۔ نوحے لکھے۔ اُردو میں ہزاروں کتابیں لکھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے مسلمانوں کی رامائن 'مہابھارت، گیتا' اپنشد وغیرہ کے تراجم نظم ونثر لکھے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، ہمارے یہاں ایسا کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا جس سے نئی نسل کو پتہ لگتا کہ ان کے آباؤ اجداد کیا کچھ انھیں وراثت میں دے گئے۔ یہ کام ہونا چاہیے۔

۶ مضامین ہیں۔ معلوماتی۔ تحقیقی اور نہایت ضروری۔ کسی بھی اردو کے مطالعے کے لیے جو جنوبی ہند کی تاریخ۔ ادب۔ ثقافت کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ یہ کتابچہ نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ صوفیوں کے اثرات۔ شعر ادب۔ صحافت۔ مشاعرے۔ اداریے۔ تصنیفات۔ علاقائی لوک گیت۔ تذکرے۔ بادشاہوں کا رول۔ اُردو۔ ہندی۔ ہندوی۔ دکھنی۔ گجری اور دکنی میں سنسکرت الفاظ کی بہتات کی وجہ۔ دکنی کی بجائے اردو نے جدید کا عروج۔ غرض یہ کہ کوئی بات تشنہ نہیں رہی۔ اُردو سے عداوت۔ اُردو الفاظ خارج کر کے ہندی کے نامانوس شعروں کو رواج دینا۔ اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی تحریک وغیرہ ایسی باتیں بھی ہیں جو نہ جانے کتنی بار کہی جاچکی ہیں اور بار بار دہرائی گئی ہیں۔

سلیم تمنائی نے ٹیپو سلطان کی لکھوائی ہوئی دو کتابوں "مفرح القلوب" اور "اصرار سلطانی" کا ذکر کیا ہے۔ سلطان نے بہت کُتب لکھوائیں اور ایک مکمل اور مفصل نقشہ "الذبیر" بہاولپور کے کتب خانہ نمبر سال ۱۹۷۶ء میں دیا گیا ہے۔ ایک نسخے کا پتہ کیٹلاگ فارسی مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ بہ نمبر ۲۴ دیا گیا ہے۔ چند کتب کے نام ملاحظہ ہوں:

۱۔ عروس عرفان
۲۔ زاد المجاہدین
۳۔ وعظ المجاہدین
۴۔ موید المجاہدین
۵۔ توشک خانہ۔ اسلحہ خانہ۔ توپ خانہ۔ قلعہ بندی۔
۶۔ فتاویٰ محمدی
۷۔ فتح المجاہدین

اکادمی کے کتب خانے میں یہ سب کتابیں ہونی چاہئیں۔ کتابت طباعت عمدہ ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ یہ کتابچہ لائبریریوں میں ہونا چاہیے۔

______ رام لال نابھوی

دیوان بازار، نابھا (پنجاب)

اپنے سائے کے سوا (شعری مجموعہ)
مصنف : ڈاکٹر اختر بستوی
قیمت : پچھتر روپے
ملنے کا پتہ : آواز پبلیکیشنز، رتی کا پُل، گورکھپور۔ یو۔ پی۔

"اپنے سائے کے سوا" ڈاکٹر اختر بستوی کا ایک سو ایک مختصر نظموں پر مشتمل

تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس کا پیش لفظ غنی اعظمی
صاحب نے تحریر کیا ہے۔
اختر بستوی صاحب کافی مدت سے
شعر کہہ رہے ہیں اور ملک کے مقتدر ادبی
رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس
مجموعے سے قبل اُن کے تین اور شعری مجموعے
منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس سال
میں جو نئے شعرا سامنے آئے ہیں ان میں اختر
بستوی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ جہاں تک
فکر، اظہار اور عصری حسیت کا تعلق ہے جدید
اردو شعرا میں اختر بستوی اپنا ایک مخصوص مقام
رکھتے ہیں۔

اس شعری مجموعے کا ایک امتیازی
پہلو یہ ہے کہ یہ کُلی طور پر پابند مختصر نظموں پر
مشتمل ہے۔ گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے
یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اُردو میں آزاد نظم اور
نثری نظم کا دور دورہ ہے اور پابند نظم ان کے
ہاتھوں ہزیمت اور پسپائی کا شکار ہو گئی ہے
ایسے میں پابند نظموں پر مشتمل مجموعے کی اشاعت
اختر بستوی صاحب کی جانب سے ایک بلند
حوصلگی کا اقدام تو ہے ہی مگر ساتھ ہی پابند نظم کی
افادیت اور بقا میں ان کے یقین کی نشاندہی
بھی کرتی ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اختر
بستوی صاحب نے اپنا یہ مجموعہ پیش کر کے
پابند نظم کے مخالفین سے اس کی توانائی کا لوہا
پھر منوا لیا ہے۔

اس مجموعے میں شروع کی چند
نظمیں احساس کی گہرائی، وسعتِ نظر، سنجیدگی
اور پختگی کی دل پذیر تصویریں مہیا کرتی ہیں۔ ملاحظہ
کیجیے یہ چھوٹی سی نظم ... خامشی:

درحقیقت خامشی معراج ہے گفتار کی
اس سے بہتر کوئی بھی صورت نہیں اظہار کی
ہو گئی ہے نطق کی ہر ہر ادا جب بے اثر
میں نے دیکھا ہے طلسمِ خامشی کو کارگر
خامشی ایسے بھی لمحوں کی کہانی کہہ گئی
جن میں گویائی پشیمانی اٹھا کر رہ گئی

شعر کے تین بنیادی لوازم ہیں۔ تفکر،
اظہار اور تاثر۔ تفکر یعنی سوچ اور احساس
کسی ندرت کا حامل نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت
اظہار میں تلاش کی جاتی ہے۔ ہر دور میں
انسان کے جذبات اور فطرت وہی رہی ہے۔
جب ہم نئے موضوعات کی بات کرتے ہیں تو
بلاشبہ ہماری مراد اُن مسائل سے ہوتی ہے
جو تغیر پذیر ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی اور
اقتصادی مسائل شامل ہیں۔ اس لیے موضوعات
تو نئے اور پُرانے ہو سکتے ہیں۔ مگر شاعر کے لیے
کوئی بالکل نیا خیال پیش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔
ہاں اظہار نیا، اچھوتا اور حیران کُن ضرور ہو سکتا
ہے۔ تاثر شعر کا وہ نہ نظر آنے والا جزو ہے
جو خیال اور اظہار کی براہِ راست پیداوار
ہے۔

خیال، اظہار اور تاثر کی ثلیثی کسوٹی پر
اگر اختر بستوی صاحب کی منظومات کو پرکھا
جائے تو ایک واضح لکیر ان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی
ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک حصہ ان نظموں کا ہے جن
میں فکر انگیزی اور اثر آفرینی غیر معمولی طور
پر گہری ہیں اور دوسرا اُن نظموں کا جن میں اظہار
اور اس لیے تاثر عام سطح سے اوپر نہیں اُٹھ سکا
ہے۔ بہر کیف، کسی بھی شعری مجموعے سے یہ توقع
کرنا کہ تمام کی تمام مشمولہ منظومات اعلیٰ پائے
کی ہوں گی۔ شاید ایک غیر معمولی عمل ہوگا۔ ہوتا
یہ ہے کہ اچھے سے اچھا شاعر بعض اوقات عام
نوعیت کے انفرادی احساسات اور تجربات کو
شعری پیمانے میں ڈھالنے پر ہی اکتفا کر کے
اپنا دل ہلکا کر لیتا ہے۔ اگر ہم کسی شعر یا نظم یا
غزل کو سُن کر ایک تعریفی احساس میں فی الفور
نہیں چونک پڑتے اور چند لمحوں تک سوچتے
نہیں رہتے تو اسے بلند پایہ اور ارفع کہنا مشکل
ہوگا۔ ذاتی غم و اندوہ، ناکامی اور منفی احساسات
کی مقصدیت سے عاری عکاسی کسی بھی شعری
تصویر کو طاقتور اور اثر انگیز نہیں بنائے گی۔
اس مجموعے میں کچھ ایسی مثالیں ان نظموں سے
دی جا سکتی ہیں ـــــ جلن باہر، جلن اندر،
کلیوں کا شباب، یادوں کا زہر، کلنڈر کا خوف،
عروسی جنازہ اور نعم البدل۔

مجموعی حیثیت سے اپنے سائے کے
سوا' ایک قابلِ لحاظ شعری مجموعہ ہے جس کا
ادبی حلقوں میں سراہا جانا یقینی ہے۔

ـــــ م۔ م۔ راجندر
۶۸، چترا وہار۔ دہلی ۱۱۰۰۹۲

سنگِ زر (افسانے)
مصنف: عزیز اللہ شیرانی
قیمت: تیس روپے
تقسیم کار: انجمن فروغ اُردو سوسائٹی
جے پور۔

عزیز اللہ شیرانی ٹونک راجستھان کے
ان نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ارد
گرد کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور پرکھا
ہے اور اپنے تجربے، مشاہدے اور فکر کے
اظہار کے لیے افسانے کو ذریعہ بنایا ہے۔ وہ
جس ماحول اور خطے سے تعلق رکھتے ہیں وہ

ہندستان کا ایسا علاقہ ہے جہاں صنعتی تہذیب کی روشنی ابھی پوری طرح نہیں پھیلی ہے اور متبادل معاشی رشتوں کے فقدان کے باعث فرد ابھی تک استحصال کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہاں جدید تعلیم کا سورج بھی کافی تاخیر سے طلوع ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس معاشرے میں ابھی بہت کچھ پہلے جیسا نظر آتا ہے۔ وہی رسم و رواج، وہی دقیانوسی خیالات، ذات پات۔ امیری غریبی کے وہی بندھن۔ عزیز اللہ شیرانی نے اسی معاشرے کو بے باکی کے ساتھ اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔ وہ قاری کو خوش کرنے کے لیے افسانے کے انجام کو طربیہ نہیں بناتے۔ بلکہ سماج کو آئینہ دکھاتے ہیں جس میں اس کے چہرے کے داغ دھبوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

عزیز اللہ شیرانی کے بیشتر افسانوں کے کردار روایتوں کے بندھن میں جکڑے ہوئے ایسے انسان ہیں جو چاہتے ہوئے بھی ان دائروں کو توڑ نہیں پاتے ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ "سنگ ریزے" محبت اور دولت کے درمیان تصادم کی کہانی ہے۔ جس کا تاج دولت کی ہوس کی خاطر نہ صرف اپنی بھتیجی عرشی کو استعمال کرتا ہے بلکہ اس کے جوان جذبات اور محبت کے درمیان بھی حائل ہے افسانہ نگار نے اگرچہ تاج کے کردار میں روحانی تبدیلی لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی کسی حادثے یا واقعے کے بغیر غیر منطقی سی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے افسانے کا مجموعی تاثر مجروح ہو گیا ہے البتہ افسانہ "اجنبی اجنبی" میں ایک ملازم پیشہ لڑکی کا بس کا انتظار کرتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے کی ہمدردی پا کر آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت اس لیے پروان نہیں چڑھتی کیونکہ لڑکے کی پرورش اس کے ماموں نے اپنی لڑکی کے لیے کی تھی جس کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر دونوں کی محبت دم توڑ دیتی ہے۔ اسی طرح "سکڑتے بندھن" کی فرو کو شہزاد اس لیے نہیں مل پاتا کہ تیل کی دولت کمانے کے لیے اکثر لوگ عرب ممالک جاتے تو ہیں لیکن معاہدے کا پھندا ان کی موت کا پھندا بن جاتا ہے اور لڑکیاں سہاگ کا انتظار کرتے کرتے خود مجسم انتظار بن جاتی ہیں۔ افسانہ "آج کی سلمیٰ" میں عزیز اللہ شیرانی نے لڑکیوں پر تعلیم کے منفی اثرات اور ان کی فیشن پرستی اور مغرب زدگی کو پیش کیا ہے تو افسانہ "کوتاہیاں" ہندستان کے متوسط طبقے کا المیہ ہے جو جائداد کے جھگڑوں میں اپنے ہی خون سے کھیل جاتا ہے۔

اس مجموعے کے دو خوبصورت افسانے "ندی کا وردان" اور "انسانیت کا رشتہ" ہیں۔ ندی کا وردان میں انھوں نے آدی واسی کی زندگی، معاشرت، خلوص اور سچائی کے ساتھ اس سماجی حیثیت کو بھی پیش کیا ہے جو پسماندہ طبقوں کے ساتھ اب بھی ریاکاری کے جال بنتی ہے اور ان کے نام پر سرکار اور قانون دونوں ہی کا مذاق اڑاتی ہے۔ لیکن اس سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ پسماندہ طبقوں کے لیے کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ "ندی کا وردان" کا انجینیر بھی آدی واسیوں کی زندگی میں ایسی ہی خوش آئند تبدیلی کا سبب بنتا ہے اور خلوص کا نذرانہ پاتا ہے۔ "انسانیت کا رشتہ" تعصب تنگ نظری، جھوٹی افواہوں پر گہرا طنز ہے۔ کیا انسانی خون کا رنگ الگ الگ ہوتا ہے اور کیا کالج میں پڑھنے والے طلبا و طالبات مذہب کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کے بھائی بہن یا دوست نہیں بن سکتے ہیں۔ منفی سماجی رویوں کے خلاف انسانیت کا رشتہ سماجی شعور کی بیداری کی علامت ہے۔

عزیز اللہ شیرانی کے افسانوں میں علاقائی تہذیب و معاشرت کا گہرا عکس موجود ہے جو ان کے افسانوں کی پہچان قائم کرتا ہے۔ ان میں اچھے افسانہ نگار بننے کے امکانات موجود ہیں۔ امید ہے کہ ان کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ عام طور پر پسند کیا جائے گا۔

—— عظیم الشان صدیقی

میثاق

مصنف: قاضی حسن رضا
صفحات: ۱۳۶
قیمت: ۲۳ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ: سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ڈی ۳۰/۱، پروفیسرز کالونی۔ بھوپال۔

"میثاق" قاضی حسن رضا کا مجموعۂ کلام ہے جو ایک نعت اور ۱۲۱ غزلوں پر مشتمل ہے یہ اگرچہ حسن رضا کا پہلا مجموعہ ہے تاہم وہ گزشتہ ۴۲ سے زائد برسوں سے فکرِ سخن کر رہے ہیں اور بقول ڈاکٹر مظفر حنفی چھٹی دہائی کے اواخر سے جدیدیت کے رجحان کو فروغ دے رہے ہیں۔ یقیناً حسن رضا کے اکثر اشعار میں جدت کے عناصر ملتے ہیں۔ بالخصوص نئی تشبیہات نے

ان کی شاعری کو ایک نیا انداز دیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

تمام عمر کیمرے کی طرح چپ رہا ہوں میں
اور لوگ ریڈیو کی طرح بولتے رہے

دھوپ آلام کی اِس قدر تیز تھی
اڑ گئے بھاپ بن کے مرے حوصلے

قاضی حسن رضا کی شاعری میں عصری مسائل کی جھلک بھی ہے اور تلخ و شیریں تجربات کی کسک بھی۔ تاہم وہ سماجی زندگی کے فوٹوگرافر نہیں بلکہ زندگی کو ایک مصور کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

سِسکتی ہیں جن میں کلرکوں کی روحیں
مرے شہر سے ایسے دفتر ہٹاؤ

لہو سے سینچ کے فصلوں کو تازگی بخشوں
میں ایک ایسا جفاکش کسان بن کے رہوں

"میثاق" میں ایک بزرگ شاعر کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی نے شائع کیا ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

——— اسد رضا

E-11/47 سوموِلانی 'مالویہ نگر' نئی دہلی' K

خط اِک اور

مرتب : اُفق سبزواری
ضخامت : ۱۴۴ صفحات
قیمت : دس روپے
ملنے کا پتہ : اُفق سبزواری' فرشولہ ٹولہ بدایوں۔ یو۔ پی

اچھا خط لکھنا خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اچھا خط وہی ہے جس سے نصف ملاقات کا لطف حاصل ہو اور اس فن میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو خطوط نویسی کے آداب سے واقف ہو۔ غالب اور ابوالکلام آزاد آج بھی اپنے خطوط کی بنا پر ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب سیاسی شخصیتوں اور ادبی شخصیتوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ سیاسی شخصیتوں میں فخرالدین علی احمد مرحوم' ہدایت اللہ' اندرا گاندھی' سمپورنانند' اکبر علی خاں اور ادبی شخصیتوں میں آلِ احمد سرور' جگر مراد آبادی' محمد طفیل' فانی بدایونی۔ نیاز فتحپوری جگر مراد آبادی اور شکیل بدایونی قابلِ ذکر ہیں۔ مرتب کی اس کوشش کی داد دینا ہوگی کہ اس نے مکتوب نگار حضرات پر مختصر مگر جامع تعارفی نوٹ بھی دیے ہیں اور ان خطوط میں جن افراد و واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں ان پر وضاحت کے ساتھ حاشیے بھی لکھے ہیں۔ "حرفے چند" میں شمس بدایونی نے کم کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ کتاب کی طباعت اور کتابت اچھی ہے۔

——— دلیپ بادل

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

جنوری ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ـــــ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

پنچھی، بالک، پھول، پھل، الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی سارے رشتے دار (ندا فاضلی)

مرسلہ: معین الدین شمسی، اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ ۸۱۵۳۰۱

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (حالی)

مرسلہ: احمد سہیل، قوس اردو لائبریری، حمزہ پور، پوسٹ شیر گھاٹی ۸۲۴۲۱۱، ضلع گیا (بہار)

سمندروں میں پہنچ کر فریب مت دینا
اگر کہو تو کنارے پہ ڈوب جاؤں میں (قیصر الجعفری)

مرسلہ: ماجد قاضی، کلیان

ہاتھ کی جنبش میں طرز دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے (اقبال)

مرسلہ: ممتاز علی، بھاگلپور

اب اپنا گاؤں بھی پتھر کا ہوگیا ہے ظفر
یہ آرزو تھی پرندوں کے ساتھ کھیلوں گا (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: انصاری ایاز احمد، بمبئی

شکر ہے اک مدت پر ہم کو تم سا اک غم خوار ملا
شکر ہے اپنے دردِ دل کو آج اذنِ اظہار ملا (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: شائستہ، حمزہ پور

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے (حفیظ جالندھری)

مرسلہ: طفیل احمد انصاری، جونپور

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے (نامعلوم)

مرسلہ: نفیس شیرازی، نئی دہلی

ریت سے دریا اٹے ہیں خاک سے جھیلیں پٹی
یہ پرندے خون میں شاید نہانے آئے ہیں (بشیر بدر)

مرسلہ: نسرین کوثر، گلبرگہ

پچھلے ماہ کی تصویر

ں کے بدلے پنچھی کے پَر باندھے ہیں
کا بچّہ کتنا سیانا لگتا ہے (کیف بھوپالی)

مرسلہ: محمد علی، برہانپور

بچپن بہہ رہا ہے وقت کے سیلاب میں
بہت جلد اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جاؤں گا (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: محمد خالد عمران، بھاگلپور

اپنے دیش کی جھیلوں میں ایسا آکرشن ہے
دراز کے ملکوں سے ہر سال پرندے آتے ہیں (م۔ اسلم انصاری)

مرسلہ: زین اللہ صدیقی، بستی

سینے میں پتّھر ہو تو پھر قربت بھی دوری ہے
دل حسّاس ہو تو ہم زبانی کیا ضروری ہے (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: شگفتہ، حمزہ پور

پیکرِ حیات کو دیکھا جو روبرو
پُرسکون جھیل پریشان ہوگئی (م۔ اسلم انصاری)

مرسلہ: کہکشاں صدیقی، بستی

صرف آپ ہیں جو مغتنم ہیں دُنیا میں
منے والے زباں اپنی کم ہیں دُنیا میں (ناوک حمزہ پوری)

مرسلہ: اعجاز احمد، حمزہ پور

دانہ کے لیے فکر ضروری ہے میاں
کی آگ کہیں پیار سے بجھتی ہے میاں (مناظر حسین شاہد)

مرسلہ: رخسانہ رضوانہ، ٹونک

کترے گئے پر، پھر بھی یہ باز آئے
اڑوں کے پرندے بڑے خود سر نکلے (ظہیر خیرآبادی)

مرسلہ: قریش حسین، برہانپور

ندھے پہ سب خدا کو اٹھائے پھرے مگر
روں کا احترام کسی نے نہیں کیا!!

مرسلہ: نزہت ضیاء اللہ قاضی، ہمت نگر

بنا سا لگے ہے نہ پرایا سا لگے ہے
ر بھی وہ مرا جاننے والا سا لگے ہے

مرسلہ: فاطمہ شکور قریشی، پالن پور

نثری عنوانات

"ملاقات" (ڈاکٹر نریش کی کہانی)
مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محلہ بھیکن پور روڈ،
ضلع بھاگلپور ۸۱۲۰۰۱ (بہار)

"ہمزاد" (وقار واثقی کی نظم)

مرسلہ: محمد امین بھیلونی، بھیلون

"فرشتہ محبت کا" (عذرا بانو عرشی کا ناول)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

"کیچڑ کے کنول" (عارف مارہروی کی کہانی)

مرسلہ: محمد خالد عمران، بھاگلپور

"تخلیقی نقوش" (مصطفٰی فطرت کا مجموعۂ کلام)

مرسلہ: شعیب عالم، بے پور

"چٹکتے غنچے" (اقبال کی نظم)

مرسلہ: سلمان اختر، کوٹہ

"بچپن" (انور کمال انور کی نظم)

مرسلہ: نسیم احمد، نئی دہلی

اُردو خبر نامہ

اکادمی کے دفتر میں دو محترم سفارت کاروں کی آمد

پچھلے دنوں اکادمی کے دفتر میں ہندستانی سفیر برائے سعودی عرب جناب عشرت عزیز ور ہندستان میں سعودی عرب کے ناظم الامور جناب ابوالعوف اکادمی کے دفتر میں تشریف لاتے اور اکادمی کے مختلف شعبوں کی کارکردگی دیکھی۔ اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے مہمانانِ گرامی کا خیر مقدم کرتے ہوئے تفصیل سے روشنی ڈالی اور اُردو زبان عرب ملکوں میں جو جگہ بنا رہی ہے، اس کا بھی ذکر کیا۔ محترم مہمانوں کی خدمت میں اکادمی کی مطبوعات کے سیٹ پیش کیے گئے اور ان سے اظہارِ خیال کی خواہش کی گئی۔ محترم عشرت عزیز صاحب نے کہا کہ یہاں آکر میں دہری خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ ایک اکادمی کی قابلِ تعریف کارگزاریوں سے باخبر ہوکر، دوسرے اپنے پُرانے دوست اور ہم جماعت عابدی صاحب سے تقریباً بیس سال بعد ملاقات کرکے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے جاکر میں دیکھوں گا کہ سعودی عرب کا ہندستانی سفارت خانہ وہاں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ سعودی عرب کے ناظم الامور جنابِ ابوالعوف صاحب نے بھی حاضرین کو خطاب کیا اور اکادمی کے کاموں پر پسندیدگی ظاہر کی۔ مخمور سعیدی کے کلماتِ تشکر پر یہ پُروقار نشست اختتام کو پہنچی۔

(دائیں سے) محترم عشرت عزیز صاحب، پروفیسر اشتیاق عابدی (خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے) جناب ابوالعوف، جناب بی۔ ایس۔ گیرا ڈپٹی سیکریٹری اُردو اکادمی اور جناب مولوی عبدالسلام

(تصویر: سید فدا علی)

مولوی عبدالحق
چار روزہ بین الاقوامی سمینار

"اُردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں" یہ لفظ ڈاکٹر گرجا ویاس نائب وزیر اطلاعات و نشریات نے انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے زیر اہتمام مولوی عبدالحق پر چار روزہ بین الاقوامی سمینار منعقدہ ۲۸ دسمبر تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کے افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہے۔ ڈاکٹر گرجا ویاس نے کہا کہ ہماری سرحدیں سیاسی وجوہ کی بنا پر الگ ہوگئی ہیں لیکن اُردو زبان دلوں کو جوڑنے میں مؤثر رول ادا کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کسی ایک مذہب، فرقہ یا کسی ایک ملک کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمگیر زبان ہے۔

مہمانِ خصوصی سفیر کبیر پاکستان جناب عبدالستار نے کہا کہ مولوی عبدالحق کی شخصیت سرحدوں سے بالاتر ہے۔ انھوں نے پاکستان میں اُردو کی صورتِ حال کے حوالے سے کہا کہ وہاں اُردو کی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو کے ایک اخبار کی اشاعت انگریزی کے تمام اخباروں کی مجموعی اشاعت سے زیادہ ہے۔ جاپانی ادیب پروفیسر اسارا یوتاکا نے اپنی ہندستان آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور نہایت شستہ اُردو بولتے ہوئے عالمی سطح پر اُردو کی بقا اور ترویج کی ضرورت پر زور دیا۔ پاکستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ڈاکٹر گرجا ویاس کی شاعری کے مجموعے "سیپ، سمندر، موتی" کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے کہا کہ گرجا ویاس کا لہجہ شیریں اور شیتل ہے، جس میں پورے سماج کی عکاسی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی ادبی و لسانی خدمات پر یہ بین الاقوامی سمینار اپنی نوعیت کا پہلا سمینار ہے جس میں دُنیا بھر سے بہتّر (۷۲) مندوبین شرکت کررہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمینار میں حکومت سے تعاون نہ ملنے کی شکایت کی، اور وسائل کی کمی کا بھی اظہار کیا۔ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کی طرف سے جناب سید حسن عسکری نے مولوی عبدالحق کی خدمت میں اظہارِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک بہت خوبصورت شیلڈ پیش کی۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے مولوی عبدالحق کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جناب سید حامد نے اپنے صدارتی کلمات میں مندوبین کو چاند، ستارے اور کہکشاں سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ حضرات کی آمد مولوی عبدالحق اور اُردو زبان و ادب سے زبردست محبت و عقیدت کا پتا دیتی ہے۔ حامد صاحب نے کہا کہ مولوی عبدالحق کو خراجِ عقیدت پیش کرنا، نئی نسل کو ان سے متعارف کرانا اور ان ادبی، تہذیبی و ثقافتی قدروں کو اُجاگر کرنا جو ہند و پاک دونوں ملکوں کے لیے مشترکہ ہیں، اس سمینار کے اہم مقاصد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولوی عبدالحق کو بابائے اُردو کا خطاب ملنا ان کی اُردو سے فریفتگی کا ثبوت ہے۔ حامد صاحب نے اُردو کو عالمی سطح پر فروغ دینے کے لیے چند تجویزیں پیش کیں اور اُردو کو یو۔این۔او کی ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے کے مطالبے کو وقت کا اہم تقاضا بتایا۔ آخر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے تشکراتی کلمات سے افتتاحی جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔

اس بین الاقوامی سمینار میں پاکستان، جاپان، انگلینڈ، ناروے، بنگلہ دیش اور ہندستان کے مختلف صوبوں سے بہتّر (۷۲) مندوبین نے شرکت کی۔ ان میں سے ۶۵ حضرات نے اپنے مقالات کی تلخیص پیش کی یا زبانی اظہارِ خیال کیا۔ چند حضرات جو تشریف نہ لاسکے انھوں نے اپنے مقالے بھیج دیے تھے۔ (محمد عارف خاں)

اقبال اور فارسی شعرا

شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ادبی نشست میں ڈپارٹمنٹ آف فارن لینگویجز میں فارسی کے استاد پروفیسر احمد انصاری نے "اقبال اور فارسی شعرا" کے زیرِ عنوان اظہارِ خیال کیا۔ جلسے کی صدارت جناب مجروح سلطان پوری نے کی۔

پروفیسر انصاری نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری اور دیگر فارسی شعرا کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اپنے پہلے اُردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کی متعدد نظموں میں علامہ اقبال نے فارسی شعرا کے اشعار پر تضمینیں کی ہیں، جن میں انیسی شاملو، غنی کشمیری، ملا عرشی، میر رضی دانش، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، ملک قمی، فیضی، ابوطالب کلیم، مرزا صائب، مرزا عبدالقادر

بیدل اور حافظ، رومی اور سعدی شیرازی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر انصاری نے کہا کہ اہلِ فن کی نظر میں تضمین ایک صنعتِ شعری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر اقبال نے تضمین کو فن کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کر دیا تھا" اقبال کے حسنِ انتخاب نے غیر معروف شعرا کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا اور مشہورِ زمانہ شعرا کے بھی ایسے اشعار جو صدیوں سے زبان زدِ خاص وعام رہے ہیں ان کو نئے معنی دیے۔ ان میں نئے سیاق سباق اور نئی جہتیں پیدا کیں۔ انھوں نے کہا کہ تضمین شدہ اشعار بیسویں صدی میں درپیش سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی، ادبی اور فرہنگی مسائل کے آئینہ دار بن گئے ہیں۔

تضمین کی فنی نزاکتوں کی وضاحت کرتے ہوئے صدر جلسہ جناب مجروح سلطانپوری کی تضمین "قلم" کا بھی ذکر کیا گیا جو سعدی شیرازی کے لافانی شعر پہ ہے:

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

پروفیسر انصاری نے اس بات کی وضاحت کی کہ اقبال کی عظیم الشان فارسی کی تخم ریزی" ان کے ابتدائی کلام ہی میں ہو چکی تھی۔ "بانگِ درا" کی ابتدائی دَور کی متعدد نظموں میں اقبال نے جابجا فارسی اشعار نظم کیے ہیں۔ مثلاً ان کی نظمیں گلِ پژمردہ، بلال رض، تصویرِ درد، نالۂ فراق، التجائے مسافر اور عبدالقادر۔

عصمت چغتائی پر مذاکرہ

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی میں نیشنل اُردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام عصمت چغتائی کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں اُردو کے ریسرچ اسکالرز اور دوسرے طلبہ وطالبات نے حصہ لیا۔

مذاکرے کے اختتام پر ایک قرار داد، اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی جس میں اتر پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے فیصلے کو جلد از جلد عملی شکل دینے کا مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے پرزور مطالبہ کیا گیا۔

(شعیب رضا خاں)

خواتین کا عالمی مشاعرہ

یونیکرین امارات کے روحِ رواں جناب سلیم جعفری نے ۱۹۸۶ء میں ایک انڈو پاک مشاعرے کی بنیاد عرب امارات میں رکھی تھی۔ جس کا مقصد ہے مشاہیرِ عصر کی ادبی خدمات کا اعتراف اُن کی زندگی میں ہی کرنے کی خوشگوار روایت قائم کرنا۔ سالِ رواں سے موصوف نے "جشنِ غزل وغزال" کے عنوان سے خواتین کے عالمی مشاعرے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۹۱ء کو اس جشن کا افتتاحی مشاعرہ دوبئی کے عالیشان ٹریڈ سینٹر میں ہوا۔ ۲ دسمبر کو ابوظہبی کے مرکز پاکستان میں اور ۳ دسمبر کو العین کے ہوٹل کانٹی نینٹل میں۔ صدارت پدم شری بیگم ممتاز میرزا نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض سلیم جعفری نے ادا کیے

(وسیم الحق چشتی، دبئی)

"ٹونک ادبی سوسائٹی" کی تشکیل

اچھے ادب کی تخلیق اور اُردو ادب کے فروغ میں اہلِ ٹونک کی کاوشوں کو اُجاگر کرنے کی غرض سے "ٹونک ادبی سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ اور مندرجہ ذیل حضرات کو سوسائٹی کا عہدیدار چُنا گیا ہے:

محمد صادق بہار (سرپرست)، مختار ٹونکی (صدر)، عمر جہاں (نائب صدر)، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (سیکریٹری)، مسعود اختر (جوائنٹ سیکریٹری) عبدالغفار (خازن)، عبدالمجید خاں (ایڈیٹر)۔

(عزیز اللہ شیرانی)

۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کو نئی دہلی کے آندھرا پردیش بھون میں فنکار سوسائٹی کی جانب سے شاعری رقص اور موسیقی کی محفل کا اہتمام ہوا۔ جس میں شاہد پرویز کی کہانیوں کے مجموعے "کرب ریزے" کا اجرا بدست محترمہ انیتا سنگھ عمل میں آیا۔ تصویر میں فنکار کے صدر امیر قزلباش، انیتا سنگھ صاحبہ کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں۔

تہنیتی جلسہ

اُردو کے ممتاز و معتبر شاعر جناب محسن زیدی کے تازہ مجموعۂ کلام پر اُتر پردیش اُردو اکادمی نے شعری ادب کے لیے اپنا سب سے بڑا انعام دینے کا اعلان کیا اور اس اعلان کے ساتھ ہی حکومتِ ہند نے ان کے عہدے میں ترقی دے کر انھیں محکمۂ زراعت میں جوائنٹ سیکریٹری کی ذمّے داریاں تفویض کیں۔ اس دوگونہ مسرت میں شرکت کے لیے دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں محسن زیدی صاحب کو مبارکباد دی گئی اور ان سے ان کا تازہ کلام بھی سُنا گیا۔

جناب ولی محمد خاں یوسف زئی کا انتقال

۷، جنوری ۹۲ء کو دہلی اُردو اکادمی کے معزز رکن اور دہلی کی ممتاز سماجی شخصیت جناب ایم۔ ڈبلیو۔ کے۔ یوسف زئی حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال فرماگئے۔ یہ خبر ملتے ہی اکادمی کے دفتر میں تعزیتی میٹنگ ہوئی اور باقی وقت کے لیے ان کے سوگ میں دفتر بند کردیا گیا۔

مرحوم یوسف زئی صاحب دہلی انتظامیہ کے علاوہ مرکزی حکومت میں بھی ذمّے دارانہ عہدوں پر فائز رہے اور ہر جگہ اپنی بہترین کارکردگی کا نقش قائم کیا۔ نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے انھوں نے کناٹ پلیس کے اطراف میں جو مارکیٹ تعمیر کرائی وہ انھی کے نام سے موسوم ہے اور ان کی ایک مستقل یادگار ہے۔ انھیں تعلیمی امور سے بھی گہری دلچسپی تھی اور شعبے میں بھی انھوں نے قابلِ لحاظ کام کیا ہے۔ جب وہ اکادمی کے ممبر نامزد ہوئے تو انھوں نے اس نکتے پر خاص زور دیا کہ اکادمی کو ثقافتی سرگرمیوں سے زیادہ تعلیمی سرگرمیوں میں حصّے دار بننا چاہیے۔ اکادمی اس شعبے میں جو کام کررہی ہے اس میں وہ ہمیشہ بھرپور تعاون دیتے رہے۔

ادارہ ان کے انتقال پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دُعاگو ہے۔

نیا اردو افسانہ
تجزیہ اور مباحث

اس کتاب میں اردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ افسانہ ورکشاپ / سیمینار میں پڑھے جانے والے افسانے، ان افسانوں کے فنی تجزیے اور ان پر ہونے والے مباحث یک جا کردیے گئے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں ۱۹۷۰ء کے بعد سامنے آنے والے اہم افسانہ نگار اور تجزیہ نگاروں میں افسانوی اَدب کے ممتاز نقاد شامل ہیں۔ شرکائے بحث میں بھی اہم شخصیتیں ہیں۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مبسوط مقدمے کے علاوہ، جو اس سیمینار کے ڈائرکٹر تھے، بیگم صالحہ عابد حسین اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین ہیں۔

سیمینار کی مکمل روداد بھی جو باذل عباسی نے لکھی ہے، شاملِ کتاب ہے۔

سیمینار پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے جو تبصرے کیے ہیں آخر میں ان کے اقتباسات بھی دے دیے گئے ہیں۔ ہم عصر افسانوی ادب تنقید کی ایک اہم دستاویز۔

مرتب : پروفیسر گوپی چند نارنگ　　صفحات : ۶۳۱　　قیمت : ۶۰ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

آپ کی رائے

○ برین پیٹن کے تمثیلی افسانے "یونہی تو نہیں جینا" (ایوانِ اردو، شمارہ ۷) کا جیسا عمدہ ترجمہ انور خاں نے کیا ہے، اُس کی داد دیتے نہیں بنتی۔ افسانے کی فضا اُن کے اپنے افسانوں کی سی ہے۔ نیلا آسمان، سفید پوش چوٹیاں، امنڈتا دریا، ہرے بھرے میدان اور چھتنار درخت۔ مزید یہ کہ افسانے کا موضوع بھی اُن کا پسند خاطر۔

مہاتما بُدھ نے سچ کہا تھا کہ منش اپنے کرموں سے، اپنی آتما کو رفعت و شان عطا کر سکتا ہے۔ برین پیٹن نے آتما کے پاتال سے آکاش تک کے سفر کا احوال جس لُطف اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، وہ کمال درجے کا ہے۔

——— انور قمر، بمبئی

○ دسمبر ۹۱ء کے شمارے میں آپ نے ستیہ پال آنند صاحب کی بے جان نظموں کے بارے میں دُرست کہا کہ ان میں جذبے کی وہ حرارت نہیں جو شاعری کو تحرک اور توانائی بخشتی ہے۔ موصوف نے اپنے انٹرویو میں بڑی متضاد باتیں کہی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ن م۔ راشد ایک ہی جست میں روایت سے تجاوز کرنا چاہتے تھے وہ روایت شکن تھے۔ فیض کی بات مختلف ہے فیض نے ہیئت کے تجربے ضرور کیے ہیں لیکن وہ روایت کے دائرے میں رہے اور ان کے ہاں، روایت کا احترام ہے" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ فیض نے ن م راشد کی سی جرأت دکھائی نہ دیا نتداری سے کام لیا وہ چالاک تھے اور اپنے فن کے تئیں ایمان دار بھی نہیں تھے وہ وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ جانے کا ہُنر جانتے تھے۔ انھوں نے کبھی مخالف رُخ اختیار نہیں کیا۔" مجھے تو ستیہ پال آنند صاحب کا انٹرویو ہی چالاکی سے پُر اور امریکن لابی کی خوشنودی حاصل کرنے والا محسوس ہوا۔ اُن کا یہ کہنا بھی دیانت داری پر مبنی نہیں کہ غالب صرف غزل گو ہونے کی وجہ سے اور فیض اپنی مصنوعی PSEUDO ROMAN-TICISM کی قبیل سے تعلق رکھنے کی بنا پر عصری عالمی شعری ادب میں کوئی مقام نہیں پاسکے۔ ستیہ پال آنند صاحب نے عالمی ادب میں مقام حاصل کرنے کا کون سا پیمانہ ہے، اُس کی نشاندہی نہیں کی۔

خالد اشرف نے میراں بائی لکھنے پر اعتراض کیا ہے لیکن راجستھان میں میراں (मीरां) ہی لکھا جاتا ہے نہ کہ میرا (मीरा)۔ میراں نام کیوں رکھا گیا اس پر بہت اختلاف ہے۔ ایک روایت کا سہارا لیتے ہوئے ہندی ادیب ہری نارائن شرما کا کہنا ہے کہ "میراں سے پہلے اُن کے والد رتن سنگھ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام گوپال تھا لیکن اُس کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا۔ اُن کی والدہ کو غم گین دیکھ کر ایک خادمہ نے اجمیر کے میراں صاحب کی منّت مانگنے کے لیے کہا۔ منّت کے بعد جو لڑکی پیدا ہوئی اُس کا نام میراں رکھا گیا۔"

یہاں کے ادبی حلقوں میں "ایوانِ اُردو" بہت مقبول ہے اور ہر ماہ کے آخری دِنوں میں اس کا شدّت سے انتظار کیا جاتا ہے۔

——— خلیل تنویر، اودے پور

○ دسمبر کے "حرفِ آغاز" میں آپ نے جس تحریک کا تذکرہ کیا ہے وہ نہ تو نئی ہے اور نہ ہی اس کے محرکین نئے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیشہ مغربی ادب اور تنقید سے مرعوب و مغلوب رہے ہیں اور اپنے ادب کو انھی پیمانوں پر ناپتے تولتے رہے۔ ادب ترتیب کا عمل نہیں بلکہ تخلیق کا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو سو فرمائشی نظمیں لکھنے سے پہلے کچھ سوچنا چاہیے تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کے کام کا شمار ادب میں تو بہر حال نہیں ہوگا۔ اور پھر مطالب و مضامین کے وسیع تر اظہار کے لیے انھوں نے نظم ہی کا سہارا کیوں لیا۔ نظم میں بھی تو پابندیاں ہیں۔ صاف صاف یہ کہتے کہ تخلیقی ادب سے نظم یا POETRY کو ہی خارج کر دیا جائے۔ اور شعور و لاشعور میں جیسے جیسے خیالات و الفاظ آتے جائیں اُسی طرح بغیر کسی ترتیب و تدوین کے انھیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا جائے۔ اصل اور وسیع خیالات کا اظہار تو اسی انداز میں ہوسکتا ہے۔ اب قاری کی کیا سمجھ میں آتا ہے تو یہ قاری کا مسئلہ ہے نہ کہ تخلیق کار کا۔ اس نے تو اپنا کام کر دکھایا۔

ادب میں بنیادی چیز جذبہ اور احساس ہے۔ اور اس کے اظہار میں غزل کو جو مقام

حاصل ہے وہ کسی اور صنف کو نہیں اور غزل جن بلندیوں کو پہنچی ہے اس کا جواب دُنیا کے کسی ادب میں نہیں ہے۔ جو بات میر و غالب نے ایک ایک شعر میں کہہ دی ہے دنیا کے شاعر لمبی لمبی نظمیں کہتے رہے اور خیال و بیان کی اس بلندی کو نہ پہنچ سکے کہ دو مصرعے زبان زد عام ہو جائیں اور قاری و سامع کو ذرا دیر میں جھنجوڑ کر رکھ دیں۔ جس طرح اُردو غزل کا جواب عالمی ادب کے پاس نہیں ہے اسی طرح مشاعرے کی روایت بھی کسی کے پاس نہیں۔ جس طرح مشاعرہ آج تک زندہ ہے اسی طرح اُردو غزل بھی زندہ و تابندہ ہے۔ یہ زمانے کے ساتھ اپنے انداز میں قدم بہ قدم چل رہی ہے — مغرب زدہ مفکرّ اس کے لیے چنداں پریشان نہ ہوں۔

—— خالد نصیر ہاشمی، نئی دہلی

○ دسمبر ۹۱ء کے "حرفِ آغاز" میں "شاعر" کے حوالے سے امریکی ادارہ "سینٹر آف ایسٹرن اسٹڈیز" کی منصوبہ سازی، اس کے مقاصد اور اس کے معاون ڈاکٹر ستیہ پال آنند نیز مذکورہ ادارے کی تحقیق سے متفق پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحبان کے مضامین سے قارئین "ایوانِ اُردو" کو روشناس کرانے کے لیے آپ شکریے کے مستحق ہیں۔

شعرائے اُردو، چند بندھے ٹکے موضوعات کو دہراتے رہے ہیں، یہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور ان کے مؤید اپنے بیانات کے ذریعے کلیم الدین احمد، عظمت اللہ خاں اور حالی کی طرح غزل پر اپنے اعتراضات کے سہارے اس صنف میں شامل ہو کر اپنی اہمیت ضرور تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔

لیکن حالی کی ادبی حیثیت غزل کے سلسلے میں ان کے اعتراضات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی علمی ادبی تصانیف کے وسیلے سے ہے۔ عظمت اللہ خاں کی عظمت، غزل کی گردن بلا تکلّف اُڑا دینے کے فرمان کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے ادبی و شعری کارناموں کی وجہ سے تسلیم کی گئی۔ کلیم الدین احمد، غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دینے کی وجہ سے اُردو ادب میں امتیازی مقام نہیں رکھتے بلکہ اپنے گراں قدر تنقیدی کاموں کی وجہ سے انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔

میں یہاں آج کے سینکڑوں شعراء میں سے انفرادی لب و لہجہ رکھنے والے شاعروں کی فہرست مرتب نہیں کروں گا کہ اس کا موقع نہیں، صرف میر، غالب، اقبال اور فراق کا نام ہی پیش کروں گا کہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر اُردو شعر و ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا کہ غزل میں معنوی تنوع یا اظہار کی تازہ کاری نہیں، مطالب و مضامین اور زبان و بیان کے لحاظ سے غزل محدود دائرے کی اسیر ہے یا اُردو شاعری یکسانیت اور فرسودگی کا شکار ہے۔

—— وجیب الرحمٰن، نئی دہلی

○ "آپ کی رائے" (ایوانِ اُردو، دسمبر ۹۱) میں زاہدہ زیدی مضمون "بیکٹ کی یاد میں" کو "بے مدلّل، سرسری اور اغلاط سے پُر" کہہ کر رہ گئیں۔ اگر وہ بتاتیں کہ ایسا کیوں ہے تو ہم پڑھنے والوں کو کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوتا کہ زاہدہ صاحبہ بیکٹ کو کتنا سمجھتی ہیں مگر موصوفہ نے صرف ناموں کے تلفظ کی گرفت کی جو نہایت غیر اہم بات ہے۔

یورپی اور دوسری زبانوں کے اسم خاص (PROPER NOUNS) چونکہ ہم عام پڑھنے والوں تک انگریزی کے ذریعے ہی پہنچتے ہیں لہٰذا ہم ان کا تلفظ بھی ویسا ہی کرتے ہیں جیسا انگریزی ہجّے کے مطابق ہو سکتا ہے اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں ہے۔ روس کے ایک عظیم ادیب کو ہم لیو ٹالسٹائی ہی پکارتے ہیں کیوں کہ یہ نام انگریزی میں اسی طرح لکھا جاتا ہے LEO TOLSTOY۔ جب کہ اس نام کا صحیح تلفظ روسی کے مطابق لیف طلسطوی ہوتا ہے۔ اسی طرح فیوڈر دستایفسکی کو ہم فیوڈر دوستو وِسکی کہتے ہیں۔

ایک انگریز GODOT کا تلفظ گوڈوٹ / گوڈاٹ یا گاڈاٹ ہی کرے گا فرانسیسی کی طرح "گودو" نہیں کرے گا کیونکہ انگریزی میں "د" کی آواز اسمائے خاص میں استعمال نہیں ہوتی صرف THE-THEN-THERE جیسے الفاظ میں سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح وہ اسٹریگن یا اسٹراگان کہے گا "استراگوں" نہیں بولے گا کیونکہ "ت" بھی انگریزی میں نہیں ہے اور نہ ہی ناموں کے آخر میں نونِ غنہ کی آواز ہوتی ہے۔ "ژاں ژینے" کو بھی جین گینٹ / جنیٹ ہی بولیں گے کیوں کہ "ژ" انگریزی میں کوئی مستقل آواز نہیں ہے صرف MEASURE ، PLEASURE اور TREASURE جیسے الفاظ میں سُنائی دیتی ہے ناموں میں نہیں آتی۔

زیدی صاحبہ نے جن اسما کے تلفظ کو صحیح سمجھا ہے وہ بھی غلط ہے مثلاً "آرتھر اداموف" (ARTHUR ADAMOV) کا صحیح تلفظ ارتر آدم اُف ہو گا اور "ولادی میر" میں تاکید (ACCENT) چونکہ "دی" پر ہے اس لیے یہ ولادی کے بجائے وِلدی بولا جائے گا

اور میر (جیسے میر تقی میں) کے بجائے مِرزا (جیسے مرزا میں) کہا جائے گا اور یوں اسے وِلکِری ہر بولیں گے۔

خیر زبان کے اسمائے خاص کے تلفظ کی صحت کو اتنی اہمیت اس لیے نہیں دینا چاہیے کہ ایک تو ان سے زبان کے مطالب میں فرق نہیں پڑتا دوسرے ان کی ادائیگی میں ہم کبھی اپنی زبان یا کبھی اس زبان کی صوتی خصوصیات سے متاثر ہوتے ہیں جس کے توسط سے یہ نام ہم تک پہنچتے ہیں۔

—— علی عباس ازل، بمبئی

○ دسمبر کے شمارے میں دلیپ سنگھ کا انشائیہ "بھٹکا ہوا مسافر" دل کو بے حد بھایا۔ لیکن میری آنکھوں کو اگر کسی نے غم کے آنسو بخشے تو وہ منظہر امام کا مضمون "اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں" تھا۔

—— ایم۔ این۔ امین، کلکتہ

○ منظہر امام صاحب کا مضمون "اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں" پڑھا —— پروفیسر سید شرف عالم آرزو جلیلی جیسی شخصیت سے اب بہت کم لوگ واقف تھے منظہر امام صاحب نے آرزو مرحوم کو یاد کیا اور موجودہ نسل اپنے ایک بلند مرتبہ فنکار سے متعارف ہوئی۔ مضمون میں منظہر امام صاحب نے دو مقام پر آرزو جلیلی کی موت کو بے وقت موت لکھا ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ "بے وقت موت" کی تعبیر شرعاً درست نہیں۔ خدا کے نظام تکوینی میں ہر واقعہ اپنے وقت پر ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔

—— عطا عابدی، نئی دہلی

○ آرزو جلیلی پر منظہر امام کا مضمون "اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں" معلوماتی ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ آرزو جلیلی جیسی ہمہ جہت شخصیتوں کو جنھیں ہم نے بھلا دیا ہے —— ماضی کے تہ خانوں سے نکالا جائے۔ تاکہ دنیا ان کے کارناموں سے واقف ہو سکے۔

"مٹی کی خوشبو" کے عنوان سے احمد رئیس اور اجمیر کے دیگر دو شعرا (سید فضل المتین، ممتاز راشد) کا تعارف جناب مخمور سعیدی نے جس انداز سے کرایا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ مضمون کی ہر سطر سے احباب کی جدائی کا درد پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔

—— جی۔ ایم۔ خاں ٹونکی، اودے پور

○ "آج کل" کے مدیر نومبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ —— "ہمارے ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں میں یہ تمنا زور پکڑ رہی ہے کہ ان کی تخلیقات ہندو پاک سے شائع ہونے والے ہر رسالے میں اور ریڈیو کے ہر پروگرام میں نشر ہوں اس کے لیے وہ مدیر کو یہ لکھتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے کہ ان کی یہ تخلیق غیر مطبوعہ اور غیر شائع شدہ ہے۔" آگے لکھتے ہیں کہ —— "اب یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے —— چھپواس کی اس خواہش کے شکار ہمارے بڑے لوگ بھی ہیں۔"

تو کیا جناب منظہر امام بھی ایسے ہی بڑے لوگوں میں شامل ہیں جن کا مضمون بعنوان "آرزو جلیلی کے خطوط قاضی عبدالودود کے نام" دو ماہی "زبان و ادب" (پٹنہ) کے مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوا (یہ شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں آیا) پھر وہی مضمون صرف بدلے ہوئے عنوان "اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں" دو ماہ بعد "ایوانِ اردو" دسمبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہو گیا۔

—— قیصر اقبال، مونگیر

○ دسمبر کے شمارے میں مضمون "ساحر کی رومانیت پسندی اور حقیقت نگاری" بہت اچھا لگا۔ ریڈیو ماسکو کی اناؤنسر ایرینا میکسیمنکو سے سلمان عباسی کا انٹرویو پرچے کی جان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انٹرویو کے لیے پرچے میں ایک گوشہ مخصوص کر دیا جائے تو یہ بات اس کے حق میں کافی مفید ثابت ہوگی۔

—— فراق جلال پوری، جلال پور

○ اس بار ریڈیو ماسکو کی اناؤنسر ایرینا میکسیمنکو سے جناب سلمان عباسی کی گفتگو بہت معلوماتی رہی۔

—— محمد عادل انصاری، علی نگر

○ افسانے "بوڑھا آدمی اور لڑکی"، "انتم سنسکار"، "مٹی کا دکھ" بڑے پیارے لگے۔ مادام ایرا کا انٹرویو بھی اچھا رہا۔

—— سلطان محی الدین انجم، بمبئی

○ دسمبر کے شمارے میں شعری ادب نے کافی متاثر و محظوظ کیا۔ شہریار، بشر نواز اور احمد رئیس کی غزلوں اور نظموں کے علاوہ اختر نظمی کے دوہے بھی میرے لیے اچھی روحانی غذا ثابت ہوئے۔

افسانوں میں رفیق چودھری کا "بوڑھا آدمی اور لڑکی" اپنے کمزور اختتامیہ کے باوجود ادب کے باذوق قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

—— خالد عبادی، نئی دہلی

○ افسانوں میں "مٹی کا دکھ" اور غزلوں میں شہریار، غلش بڑودوی اور رحمت امروہوی صاحب کی غزلیں اچھی لگیں۔ —— ایم۔ اے۔ شاداب، کشن گنج

○ بشر نواز اور احمد رئیس کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔

——— محمد طارق صدری، فاضل پور

○ دلیپ سنگھ جی کا "بھٹکا ہوا مسافر" بہت ہی اچھا لگا۔ اُن کے لفظوں میں عجیب طنز و مزاح ہوتا ہے۔

——— شہاب اختر شہاب، جھریا

○ جنوری ۹۲ء میں آپ کا اداریہ خوب ہے۔ ادب سے بے ادبی دور کرنے کی کوشش باقاعدگی سے ہوتی رہی ہے لیکن دور نہیں ہوتی۔ مشاعروں میں پڑھی ہوئی نظمیں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ رسالوں میں چھپی ہوئی تخلیقات یہ لکھ کر بھیجی جاتی ہیں کہ غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر ان لوگوں کو مشاعروں میں اور رسالوں میں بے دخل کر دیا جائے تبھی کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ شعرا حضرات جب اسٹیج پر بیٹھتے ہیں تو اپنے گروپ کے شاعروں کے گھٹیا کلام پر بھی واہ وا کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں اور دوسرے کے عمدہ کلام پر ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتے۔ کچھ شاعر سامعین میں ایک دو جگہوں پر اپنے بندے بٹھاتے ہیں جو پھر کہیے کا شور مچاتے رہتے ہیں۔ "آج کل" کے طنز و مزاح میں مجتبیٰ حسین کا مضمون چھپا ہوا چھپا ہے۔ مدیر نے بتایا کہ انھوں نے اسے غیر مطبوعہ لکھ کر بھیجا تھا۔

——— رام لعل نابھوی، نابھا

○ "مشاعروں کی فضا کو بہتر بنانے میں ہمارے شعرا بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔" اکثر شعرا میں۔ یہ روش چلی آرہی ہے کہ پرانی چیزیں بار بار سنا رہے ہیں۔ اس سے گریز کرنا چاہیے۔ "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے بالکل کھری کھری بات کہی ہے۔

——— نظیر سہروردی، گنگا کھیڑ

○ "ایوانِ اُردو" اور اس میں شامل مضامین، افسانوں، غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ خدا سے دعا یہ ہے کہ ۱۹۹۲ء کا سال "ایوانِ اُردو" کے مزید نکھرنے کا ضامن ہو۔ آپ لوگوں کی جدوجہد "ایوانِ اُردو" کے لیے قابلِ ستائش ہے۔ امید ہے ۹۱ء سے بھی اچھی تخلیقات ہمیں ۹۲ء میں پڑھنے کو ملیں گی۔

——— سیّد عبدالاحد آزاد، گیا

○○———

و بہاروں کا سماں دِکھلا چلے
جب بھی آئے پھول سے برسا چلے

ات دن کب تک ستائے جائے گا
بس کر اے غم، اب تو ہم گھبرا چلے

پہلے ساتھی تھا، نہ اب ساتھی کوئی
آئے تھے تنہا یہاں، تنہا چلے!

ب تک آئیں گے وہ اے صبحِ فراق!
اب تو سارے پھول بھی کمھلا چلے!

وہ نہ آئے لے کے پیغامِ بہار
آرزوؤں کے چمن مُرجھا چلے

نیرے پائے نازنیں پر گر سکیں
ساقیا! اک دور تو ایسا چلے

اہ اختر وہ نگاہِ فتنہ گر
دل کے ارماں سب کے سب مُرجھا چلے